تارو پود
بلونت سنگھ
M.HUSAIN

www.taemeernews.com

تاروپود

www.taemeernews.com

تار و پود

(14 افسانے)

بلونت سنگھ

Download Link

https://www.taemeernews.com/2020/01/tar-o-paud-balwant-singh-pdf.html

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

تار و پود

بلونت سنگھ

مکتبہ جدید لاہور

www.taemeernews.com

دائمی حقِ اشاعت بحق مکتبہ جدید محفوظ

قیمت تین روپے

رشید احمد پرنٹر پبلشر نے تعلیمی پریس میں چھپوا کر مکتبہ جدید (چوک انارکلی) لاہور سے شائع کیا۔

www.taemeernews.com

شہناز کے نام

www.taemeernews.com

فہرست

سمجھوتہ	۹
گرنتھی	۲۵
دیپک	۴۵
کسبی	۶۱
مہمان	۷۵
شہنانہ	۹۵
خودوار	۱۱۹
کمپوزیشن ٹیچر	۱۲۹
جنگل میں منگل	۱۴۳
اُس کی بیوی	۱۶۱
بیمار	۱۷۷
خلا	۲۰۳
پنجاب کا البیلا	۲۲۵
تین باتیں	۲۶۹

www.taemeernews.com

سمجھوتہ

وہ مجھے نئے مکان میں چھوڑ دفتر کو چل دیئے۔

سامان ابھی بکھرا ہوا ہی تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ سوچا ذرا سستا لوں تو کپڑے بدل کر سامان ٹھکانے سے رکھوں۔

عجب سنسان مکان تھا۔ شہر کی یہ ایک نئی آبادی تھی۔ مکانات کی تعداد نہ صرف کم تھی، بلکہ جو تھے وہ بھی دور دور۔ مجھے تو ان کے دوست کے ہاں اور زیادہ ٹھہرنا دوبھر ہو رہا تھا۔ مکان کا مسئلہ بھی آج کل ایک معمے سے کم نہیں۔ انہوں نے کوچہ کوچہ کی خاک چھانی۔ ہر واقف کار سے کہا۔ ہزار منتوں کے بعد یہ مکان ملا۔ ان کا خیال تھا کہ سرکاری کوارٹرز میں سے کوئی نہ کوئی کوارٹر مل ہی جائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے کوئی کوارٹر خالی تھا نہیں۔ اگر ان کو معلوم ہوتا کہ رہائش کے لیے جگہ ملنے میں اتنی دشواری ہوگی تو وہ مجھے ہمراہ ہرگز نہ لاتے

مرد آپس میں گذارہ کر ہی لیتے ہیں۔ لیکن عورتوں کا نباہ ممکن نہیں جس کے ہاں ہم اتنے دنوں تک ٹھہرے رہے وہ دراصل ان کا دوست نہ تھا۔ بس یہی کہ وہ دفتر میں ان کے نیچے کام کرتا تھا۔ بیچارے کی تنخواہ کم اور ہماری حیثیت بھی افسرانہ سی تھی، ہماری وجہ سے ان کو تکلف بھی کرنا پڑتا تھا۔ اپنے گھروں میں تو ہر کوئی گذارہ کر ہی لیتا ہے۔ میں نے ہر چند چاہا کہ گھر کے کام میں میزبان عورت کا

www.taemeernews.com

ہاتھ بٹاؤں۔ لیکن وہ بچاری مجھ کو ایسا کرنے کی اجازت کیونکر دیتی۔ ایک تو میں اس کے شوہر کے افسر کی بیوی، دوسرے نئی نویلی دلہن، پھر پڑھی لکھی بھی۔ ادھر میں حساس ان سب باتوں کو سوچتی اور دل مسوس کر رہ جاتی۔ ان کے دل کا حال پرماتما جانے

ادھر وہ بھی پریشان، ابھی نوعمر ہی تو ہیں۔ نئی نویلی پیاری پیاری بیوی سے چوبیس گھنٹوں میں ایک لمحہ کے لئے بھی کھل کر بات کرنے کا موقعہ نہ ملتا۔ مردانے میں بیٹھے گپ ہانک رہے ہیں کبھی تاش کھیلتے ہیں کبھی شطرنج۔ مگر دل میں بیوی کا تصور، سو سو بہانوں سے آتے ہیں۔ دبی زبان سے کچھ پوچھتے ہیں۔ میں شرماتی ہوں۔ آخر دوسروں کے سامنے شرمانا ہی پڑتا ہے۔ ہوں ہاں کر کے ٹالتی ہوں کبھی کبھی غصہ آنے لگتا ہے۔ کیوں بار بار بے مطلب کی بات پوچھنے یا کہنے کے لئے آجاتے ہیں۔ لیکن پھر سوچتی ہوں کریں بھی کیا۔ ہمارے میزبان بھی حالات سے غافل نہ ہوں گے۔ لیکن ناچار تھے۔ جگہ تنگ اور کنبہ بڑا۔

اب جو نئے مکان میں آئے تو دفتر جانے سے پہلے مجھ کو گلے سے لگایا اور میرا منہ چوما.....

میں چونکی آخر اب یہ نئے خیالات کیا سوجھنے لگے۔ ہاتھ اٹھا کر لمبی سی جماہی لی۔ پھر اٹھی، کمروں کا جائزہ لینے کے بعد سوچنے لگی کہ اب ان کی تقسیم کیونکر ہو دو بڑے کمرے تھے۔ ایک چھوٹا۔ ایک غسلخانہ ایک کچن اور پائخانہ سامنے کی چھت پر سامنے کا حصہ مالک مکان کا تھا مگر تسلی بخش بات یہ تھی کہ مالک نے اس حصہ کو گودام بنا رکھا تھا ورنہ جس مکان میں مالک خود بھی رہے وہاں مجھ کو رہنا پسند نہیں کیونکہ اس طرح ضرور جھگڑے کی کوئی صورت نکل آتی ہے۔

www.taemeernews.com

کمروں کی بابت تو میں نے یہی طے کیا کہ ایک بڑا کمرہ تو ان کے لئے مخصوص ہوگا۔ دوسرے میں سامان، اور ہمارے پلنگ۔ چھوٹا کمرہ گودام کا کام دے گا۔ چلو چھٹی ہوئی، دل میں کیا کیا ارمان تھے۔ لیکن مکان ملتے کہاں تھے۔

شام کے پانچ بجے اسٹوو پہ پانی ابل رہا تھا، سوچتی تھی وہ آئیں تو چائے والوں ان کو دیکھنے کے لئے چھت پر چڑھ گئی۔ ایک بات سے میں بہت خوش تھی۔ وہ یہ کہ جگہ اگرچہ محدود تھی لیکن تھی ہوادار۔ ایک تو دوسری منزل پہ، دوسرے شہر کے بالکل باہر۔ پرے کھیتوں کی ہریالی تک نظر آتی تھی۔ سوچا وہ آئیں تو کھیتوں کی ہوا کھانے چلیں۔ سامنے لکڑیوں اور کوئلے کی ٹال تھی۔ دو چار کاشمیری کلہاڑیاں لئے گھوم رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ہی دھوبیوں کے مکانوں کی قطاریں تھیں۔ بائیں ہاتھ بڑا میدان سا تھا۔ پھر مکانوں کے سلسلے۔ سب سے نزدیکی مکان ہمارے پچھواڑے تھا۔ اس مکان کے مکین ہی ہمارے پڑوسی تھے۔ انہیں سے کچھ بات چیت ہو سکتی تھی۔ حالانکہ میں زیادہ جھک جھک پسند نہیں کرتی۔ عام ہندوستانی عورتوں کی صحبت مجھے راس نہیں آتی۔ لیکن کیا کیا جائے آخر ہماری بہنیں ہی تو ہیں، اور پھر انسان کہاں تک چپ سادھے رکھے، کتابیں پڑھے تو کہاں تک، سینما پہ دنیا کے تو کب تک آخر دو باتیں کرنے کو جی چاہنے ہی لگتا ہے۔

"کوئی بڑا کنبہ ہوگا" میں نے پڑوسیوں کے مکان کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا، تقریباً آدھا حصہ ادھر سے نظر آتا تھا۔ اور باقی آدھا ہمارے مکان کے عین پچھواڑے تھا۔ اور ہماری اپنی چھت کو سیڑھی تک نہ تھی۔ ورنہ دوسرا حصہ بھی دیکھ جا سکتا۔ سامنے دو کمرے تھے۔ دروازوں کے آگے چقیں پڑی تھیں۔ تیسری منزل پہ دو کمرے نظر آئے

www.taemeernews.com

تھے۔ ان کے درمیان چھوٹا سا صحن بھی تھا۔ لکڑی کے چوڑے چوڑے تختوں والی سیڑھی سب سے اُوپر والے کمرے کی چھت پر چلی گئی تھی۔ نیچے کا صحن بڑا وسیع تھا۔ صحن میں ہماری طرف کو ایک دستی نل بھی لگا ہوا تھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ گھر کے لوگ گھر میں نہیں تھے، کوئی صورت دکھائی نہ دیتی تھی۔

میں پھر ان کو دیکھنے کے لئے گلی کی طرف کو جھک گئی۔ ابھی تک نہ لوٹے تھے غصہ آنے لگا۔ پانچ سے اُوپر وقت ہو گیا۔ آخر ان کو اتنا بھی خیال نہیں کہ گھر میں اکیلی گھبراتی ہو گی۔ کچھ خاص کام پڑ گیا ہو گا۔ ورنہ وہ بچارے تو پَر لگا کر مجھ تک پہنچ جاتے۔

میں اس وقت سیڑھیوں میں کھڑی تھی۔ ہوا خوشگوار تھی۔ میں سینہ پھلا پھلا کر گہرے سانس لینے لگی جیسے کہ ہمارے اسکول میں ہم کو سکھایا گیا تھا۔ اتنے میں مجھے احساس ہوا کہ کوئی شخص میری طرف دیکھ رہا ہے نظر اٹھائی ہمارے ساتھ والے مکان کے وسیع صحن میں ایک سکھ صاحبزادے کھڑے تھے۔ نظریں ملتے ہی انہوں نے احترام سے جھک کر مجھ کو فرشی سلام کیا۔ میں بوکھلا کر بھاگتی ہوئی سیڑھیوں سے اتری اور ادھر سے بڑے زور سے ہو ہو کی آوازیں آئیں۔ اور منہ سے بلیوں کے لڑنے کی سی آوازیں نکالی گئیں۔

مارے شرم کے فرش پر گڑی جا رہی تھی۔ آخر میں کیسی بے شرم دکھائی دیتی ہوں گی بال کھلے ہوئے۔ دوپٹہ نیچے لٹکتا ہوا، اور میں سینہ پھلا پھلا کر گہرے سانس لے رہی تھی۔ پھر ہاتھ سے اپنے پیٹ کو دبا دبا کر اس بات کا جائزہ بھی لے رہی تھی کہ پیٹ کتنا دب رہا تھا۔ اسی پر بس نہیں کی، بلکہ میں اپنا ہاتھ چھاتیوں کے اُوپر سے پیٹ

www.taemeernews.com

تک پھیرتی جا رہی تھی، اور دل ہی دل میں اپنے پھیپھڑوں کے پھیلاؤ پہ اپنے آپ کو مبارک باد بھی دیتی جا رہی تھی۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ کوئی شخص مجھے اس حالت میں دیکھتا ہوگا۔

اتنے میں سب سے اوپر والے کمرے کی چھت پہ سے کوئی چلا کر بولا۔

"لو بھئی مبارک، پورے پانچ مہینوں کے بعد ہمارا پڑوس آباد ہوا۔"

پھر نیچے کے بڑے صحن سے جواب میں کسی کی تیز سی آواز سنائی دی۔

"خدا کرے ہمیشہ آباد رہے۔ کنواروں کی بھی خدا نے سنی۔"

"کچھ نہ پوچھو غضب ہے غضب۔"

——اور میں دم بخود۔

دوسرے دن ان کے دفتر چلے جانے کے بعد میں گھر کے کام دھندوں سے فارغ ہو کر مونڈھے لے کر بیٹھ گئی۔ برآمدے میں ٹھنڈک تھی۔ سوچا دھوپ میں بیٹھوں پھر خیال آیا کہ اگر دھوپ میں بیٹھی تو ممکن ہے پڑوس سے پھر کچھ داد ملنے لگے اپنی جگہ سے اٹھ کر میں نے پڑوسیوں کے مکان پہ نظر ڈالی وہاں کوئی نہ تھا۔ اس بات کا تو کل ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہاں بے گھر بار والے ہی رہتے ہیں سوچا ممکن ہے اپنے اپنے کام پہ گئے ہوں گے۔ چار بجے سے پہلے تو واپس نہ آتے ہوں گے۔

میں نے صحن کی بجائے چوڑی دیوار پہ بیٹھنا زیادہ مناسب سمجھا۔ وہاں دھوپ سامنے کی تھی۔ احتیاط سے دیوار پہ چڑھ گئی۔ اور آہستہ آہستہ کھسکتی ہوئی اس جگہ پہنچی جہاں سے دیوار اوپر کو اٹھ گئی تھی۔ میں مونڈھے پہ بڑی دیوار سے ٹیک لگا کر

www.taemeernews.com

بیٹھ گئی۔ ایک طرف سے بلندی اس قدر زیادہ تھی کہ نیچے دیکھنے سے خوف معلوم ہوتا تھا۔ میں چست و چالاک لڑکی تھی کوئی بھدی موٹی عورت تو تھی نہیں۔ یہاں بیٹھ کر میں ایسے محسوس کرتی تھی جیسے کوہ ہمالیہ کی چوٹی پر بیٹھی ہوں۔ پہلے تو اِدھر اُدھر کے مناظر سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ پھر ماؤں شلوار کے پائچوں سے ٹھک کر میں نے ٹوکری میں سے بجائے موزوں کے کتاب نکالی۔ اور پڑھنے لگی

کھانسنے کی آواز آئی۔

چونکی۔ دیکھا کونے کے سب سے اوپر والے کمرے میں ایک صاحب نکلے اور لبوں میں ہاتھ دے کر کھڑے ہو گئے۔ آپ کی داڑھی بے ترتیب تھی۔ سر کے بال اُلجھے ہوئے، موٹے بھدّے تھے۔ آپ نے مجھ کو دیکھ کر بڑے تعجب کا اظہار کیا۔ ہاتھوں کے اشارے سے سطح زمین اور میرے درمیان کے فاصلہ کو ناپا۔ پھر ابروؤں کے اشارے سے اس خطرناک حرکت کا سبب پوچھا، پھر ہاتھوں کو جھٹکا کر اور شانوں کو حرکت دے کر تعجب کا اظہار کیا۔ اور قدرے توقف کے بعد غائب ہو گئے

میں نے چھوٹا سا گھونگٹ نکالا اور منہ پھیر کر پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ اتنے میں آپ ایک ٹوٹا پھوٹا مونڈھا لئے نمودار ہوئے۔ اپنے صحن کی دیوار پر اسے رکھ دیا۔ پھر نچلے بڑے صحن سے اوپر تک کے فاصلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ ایک موٹی سی کتاب نکال کر گھٹنوں پر رکھ لی۔ اور بڑے انہماک سے پڑھنے لگے۔

میں نے بظاہر ان کی حرکتوں پر کچھ دھیان نہ دیا۔

www.taemeernews.com

"ارے مر جائے گا بھئی مر جائے گا" کہیں سے آواز آئی۔
"مرنے دو ہمیں جیتے رہے تو کیا مل جائے گا کسی کی نظر میں سما جائیں گے کیا"
میں بڑی نروس ہوئی۔ یک نہ شد دو شد۔ خیر اسی میں سمجھی کہ کھسک جاؤں۔ بوریا بستر سنبھال کر گرتی گھسٹتی اپنے صحن تک آئی۔ "ارے پکڑنا بھئی پکڑنا"
میں دھڑام سے چھلانگ لگا کر کمرے کے اندر. . . .
دو تین آدمیوں کے نعرے "کیا بات ہے بھئی کیا بات ہے" ارے جواب ہے خدا کی قسم لاجواب ہے۔
اس کے بعد بے پناہ شور و غوغا۔ وہی منہ سے بتیوں کے اڑنے کی سی آوازیں

یہ تھے ہمارے پڑوسی، سب کے سب مگر جتنے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ زیادہ تر طالب علم تھے۔ یا کلرک۔ صبح و شام دھما چوکڑی مچی رہتی۔ دن کے وقت ذرا امن رہتا۔ شام کے وقت پھر وہی ہنگامہ۔
برائے نام ہی سہی لیکن صبح کے وقت تھوڑا بہت پڑھ کرنا میرا معمول تھا لیکن اب وہ بھی نہ رہا۔ ادھر صبح کے آثار نمودار ہوئے ادھر پڑوسیوں میں سے کسی ایک نے موٹی سی گالی سے اعلانِ صبح کر دیا۔ پھر عجیب عجیب آوازیں بھانت بھانت کے لہجے گندے گندے لطیفے، پھبتیوں کی پوری قوت کے ساتھ دہرائے جانے اور وہ بھی اس شان سے کہ بولنے والا سب سے اوپر والی چھت پر اور سننے والے نیچے کے صحن میں کھڑے ہائے وائے کے نعرے لگا رہے ہیں۔
پھر داتن کرتے، زور زور سے تھوکنا، تھوکتے، ہی ہی ہاؤ ہاؤ۔ تھو تھو،

www.taemeernews.com

کہ کہ کہہ کہہ ..... " اتنی قسم کی اس قدر بیہودہ ہنسیاں میں نے کبھی نہ سنی تھیں۔ بدن پر مالش کی جاتی۔ ڈنڑ پیلے جاتے بیٹھکیں لگائی جاتیں، اگر کہیں میری جھلک دیکھ پاتے تو پھر جوش میں اُلٹی سیدھی قلابازیاں کھانے لگتے۔ سیٹیاں بجاتے، چیختے اور آوازے کستے۔

کوئی خوانچے والا، سبزی فروش، یا اخبار والا ایسا نہ گذرتا جس کی آواز کی وہ نقل نہ اُتارتے ہوں۔ اِس کھلے میدان میں اگر کوئی مرد پیشاب کرنے بیٹھ جاتا، تو اس پر ڈھیلے پھینکتے، اور گالیاں دیتے " ابے شرم کرو، یہاں عورتیں بھی رہتی ہیں۔" جیسے خود تو عورتوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔

شام کے وقت دوسری مجلس بیٹھتی، ایک دوسرے پر فقرے چُست کئے جاتے بے ہودہ گانے گائے جاتے۔

پھر بغلیں بجاتے دس عاشقوں کے کارنامے معشوقہ کی زبانی سنائے جاتے اور دسویں عاشق کی کارستانی پر "ہو ہو" کا شور مچاتے، بے ڈھنگے طریقے پر ناچتے، آنکھیں مٹکاتے ایسے موقعوں پر انکے سر کے بال بکھر جاتے، ڈاڑھیاں بے ترتیب ہو جاتیں، گال دہکنے لگتے اور وہ پسینے میں تر ہو جاتے ـــ تب کوئی تر کوئی گالی کی ایک پھلجھڑی چھوڑتا۔ اور اس کے بعد بے ہودگی کی انتہا ہو جاتی۔

ایک چھوٹے سے دریچہ میں سے ان کے صحن کا آدھا حصہ بھی نظر آتا تھا۔ اب میں ان کی صورتیں بھی پہچاننے لگی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کے نام بھی دھر رکھے تھے۔ ایک تو وہ موٹے۔ کدو سے حضرت جو میرے متقابل دیوار پر بیٹھتے تھے۔ ڈاڑھی

www.taemeernews.com

قینچی سے کتری ہوئی، مونچھیں کبھی ڈھیلی کبھی تنی ہوئی۔ چہرہ گول، آنکھیں چھوٹی۔ سر کے بال عموماً شانوں پر گرے رہتے۔ ان میں چکنائی نام کو بھی نہ ہوتی، معلوم ہوتا تھا کہ نہ کبھی بال دھوتے ہیں، نہ تیل لگاتے اور نہ کنگھی کرتے ہیں۔ گردن موٹی اور اس کی لمبائی نہ ہونے کے برابر۔ جب ہنستے تو در و دیوار ہل جاتے۔ کئی قسم کی ہنسیاں ہنسنے میں ماہر تھے۔ آواز بڑی کرخت۔ بدزبانی، بے ہودگی، گپ بازی میں سب کے سردار، موٹا جیسا کہہ کر ان کو چڑایا جاتا تھا۔ کافی بے شرم تھے۔ لیکن زیادہ چڑانے پر چڑ بھی جاتے۔ کبھی میں ان کے سامنے آ جاتا تو بڑی بے تکلفی سے انداز لہجے میں پوچھتے: "صبح سے درشن نہیں ہوئے تھے.... ہم نے بھی کھانا نہیں کھایا آج"

ان کے بالمقابل ایک صاحب تھے لمبے تڑنگے، دبلے پتلے، صورت سے برہمن کے معلوم ہوتے، باریک چھدری داڑھی، سر پہ چھوٹا سا جوڑا اور اس کے بیچوں بیچ سے بالوں کا ایک گچھا اوپر کو ہوا میں لہراتا ہوا، ان کو "کلغی" یعنی مرغ کہا جاتا تھا۔ سر جھکائے جاتے، اپنے پر رعب ڈالتے۔ آواز سے کم کہتے، لیکن ایک بار پر اتر آتیں تو شیطان پر ماتے۔ جسم کی بناوٹ خوبصورت تھی یعنی "بھینسے" کی طرح بے ڈول نہ تھے۔ مجھ کو دیکھ پاتے تو منہ سے کچھ نہ کہتے، آنکھیں مٹکاتے، بیچ سر ہلاتے۔ پھر شانے تب کمر اور کولہے اس شدت سے ہلاتے کہ شبہ ہوتا کہ نازک سے نازک ہڈی بھی نہ ہلا سکے اور پھر کمر اور کولہوں کی لرزش آنکھوں پر سے ہوتی دونوں بانہوں میں غائب ہو جاتی۔ کلاسیکل ناچ کی دھجیاں اڑا دیتے۔ اس وقت عموماً "بھیمسین" تنا رہتا۔ سیتا بھی ایسی کہ اس کے بین جاتا تو سر ہمیشہ نیچے لٹکے ہوتے تھے۔

www.taemeernews.com

ایک گورا بلی کی سی آنکھوں والا لڑکا بھی تھا۔ اس کے بال سنہری تھے، داڑھی کے بال بڑے باریک اور غالباً ملائم، اس کا قد بھی "انکارِ محبوب" کی مانند مختصر، اس کا ایک دانت سونے کا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک ملائم سی ہنسی ہنستا رہتا، اپنی دونوں کہنیاں دیوار پر رکھے ہتھیلیوں پر ٹھوڑی ٹکائے وہ مجھ کو دیکھا کرتا، دیر تک میری طرف دیکھتا رہتا۔ اور کبھی کبھی بڑے اہتمام کے ساتھ ایک آنکھ بند کر کے آہ بھرتا اور پھر برش ہاتھ میں لیکر آہستہ آہستہ تصویر بنانے لگتا۔

ایک تھے باقر بیز — عام فہم زبان میں ان کو بکرا کہا جاتا تھا۔ اُن کے سر کے بال بہت لمبے تھے۔ جوڑا اتنا بڑا تھا جیسے "بھینسے" نے سر پہ گوبر کر دیا ہو۔ ہنستے تو بڑے بڑے دانت نمایاں طور پر نظر آنے لگتے۔ اس رعایت سے کبھی کبھی ان کو "دانتین" بھی کہا جاتا تھا۔ گالوں پر لکیریں بھی بہت پڑتی تھیں، داڑھی دیکھ کر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا تھا یعنی صرف ٹھوڑی پر چند بال، خمیدہ گردن، بہرحال سانس کی آمد و رفت جاری تھی۔ سب سے زیادہ شریف اور نیک دل تھے۔ آسمان کی بادشاہت انہیں کی تھی۔۔۔ مجھ کو چق کے پیچھے سے دیکھنے کے عادی تھے۔

ایک اور "ڈھل مل" سا شخص تھا۔ اس کی ڈاڑھی عموماً بندھی رہتی تھی۔ رنگ سیاہی مائل گندمی، بڑے ترنم سے بولتے، صورت سے متانت ٹپکتی تھی، گال پھولے ہوئے، عموماً بڑے وقار سے قدم اٹھاتے، بات کرتے تو ذرا سنجیدگی کے ساتھ مجھ کو دیکھنے کی باقاعدہ کوشش کرتے تھے۔ دیکھ پاتے تو خوب منہ پھاڑ کر ہنستے۔ آداب سے کہتے، زیرِ لب ہی رائے کا اظہار فرما کر رہ جاتے، دزدیدہ و زیادہ تر نظروں سے مجھ کو دیکھتے رہتے۔

www.taemeernews.com

کہیں پرلے کونے کے کمرے میں ایک صاحب اور تھے۔ ان کی صورت کا کچھ تعین نہ تھا۔ اور نہ ہی میں ان کو سمجھ سکی، بقول موپاساں سب سے زیادہ دکھی شخص وہ ہے جسے کوئی سمجھ نہ سکے۔ کبھی وہ سکھ ہیں تو کبھی بال انگریزی طرز پر اور داڑھی صفاچٹ اور کبھی فرنچ کٹ بھی، کبھی ایک مونچھ غائب ہے۔ تو کبھی دوسری، سر پہ کبھی ٹوپی کبھی پگڑی، کبھی ہیٹ، ہر آن گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے تھے۔ بات کم کرتے، ہنستے زیادہ، اور ہنسنے سے بھی زیادہ شرماتے۔ کمرے سے باہر ان کو کم ہی دیکھتی تھی۔ جب نکلتے تو شرماتے ہوئے "بھینسا" سب سے اوپر کی چھت پہ کھڑے ان کے شرمانے کی "پیروڈی" کرتے۔ ادھر "بھینسا" شرمانے میں سو سو ڈھنگ سے منہ بناتے، شانوں کو حرکت دیتے، نہ ہل سکنے والی کمر کو ملاتے سکڑتے، کبھی پہلو بدلتے ادھر ہنسی کے مارے پیٹ میں دکھن، لیکن شرمانے والے کو اس پیروڈی سے ذرا عبرت حاصل نہ ہوتی، اور وہ شرمائے ہی جاتے۔ مجھے کم دیکھتے، آوازے بالکل نہ کستے۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ منہ میں زبان رکھتے ہیں۔

دو لڑکے اور بھی تھے۔ گھوڑے کے بچھیروں کی طرح کبھی ڈکی چال سے ادھر آتے کبھی ادھر جاتے، مجھے دیکھ کر بڑا مچلتے تھے، ہائے ہائے، مار ڈالا، مار ڈالا کے نعرے لگاتے۔

وہ لوگ مجھ سے عشق جتاتے وقت اپنی صورت آئینہ میں دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ سب کے سب نیچ کھیت، ڈنکے کی چوٹ میرے دامِ عشق میں مبتلا تھے۔

مالک مکان کا بوڑھا نوکر کہتا: "اب تو یہ کچھ زیادہ ہی شور مچانے لگے۔ رنڈیا

www.taemeernews.com

اتنی وقت بے وقت دھماچوکڑی نہ مچتی تھی۔"

لیکن میں کچھ مانوس سی ہوگئی۔

ایک دفعہ میں ان کی نظروں کی زد سے ہٹ کر صحن میں ایک طرف کو بیٹھی تھی۔ "بسیلسا" چھت پر سے پکار کر بولے "بھئی ایک بات پوچھوں؟... ... فرض کرلو تم عورت ہو۔"

"میں عورت؟"

"ہا ہا.... بھئی فرض کرلو۔"

"فرض کرلیا۔"

".....اور ہم تم کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہیں۔"

"بے شک۔"

"تو ہم دیکھا کریں۔ تمہارا کیا۔ لیتے ہیں۔ یعنی (منہ پھاڑ کر) سونچو۔"

مجھ پر چوٹ تھی۔

بھئی پڑے دیکھیں، پڑے چلائیں، چھت پر نہ جائیں؟ سبزی کے چھلکے میدان کی طرف نہ پھینکیں؟ کپڑے نہ پہنیں؟

ایک دن مالک مکان کی اماں چلی آئیں۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے دیواروں پر سفیدی کے لئے کہا، پانی کی نالی کی مرمت کی ضرورت کا احساس دلایا، وہ ہامی بھر گئیں۔

میں نے چائے پلائی۔ اتفاقاً ہم صحن کے اس حصہ میں چلے گئے جہاں سے وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ کپڑے بھی ذرا شوخ رنگ کے پہن رکھے تھے۔

www.taemeernews.com

"بیٹی اگر وہاں نہ لگے تو ہمارے گھر آجایا کرو۔ وہ کونے پر تو گھر ہے۔"

"جی نہیں۔ دل کا کیا ہے۔ فرصت ہی کہاں، مصروف رہتی ہوں۔"

آواز آئی "بھئی! ہئے! ہئے! ادھر ہم سے حد ہوگئی۔ آج تو نظر نہیں گئی۔"

میں بڑ کی۔

بڑھیا نے آواز سنی یا نہیں۔ لیکن بشرے سے اس نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

میرا دماغ کھول رہا تھا نہ معلوم بڑھیا کیا سوچتی ہوگی۔ یہی کہ آخر دل کیوں نہ لگے۔ میری مصروفیات کی "حقیقت" بھانپ گئی ہوگی۔

اس کے جانے کے بعد جنون کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ یہ وہ مرض تھا جس کا کچھ علاج نہ تھا۔ کہیں شنوائی نہ ہوسکتی تھی، صبر کا دامن ہاتھ سے جاتا رہا۔ میں خود کو روک نہ سکی انتہائی غضب کی حالت میں ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگے۔ غصہ کے مارے میرے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔ مٹھیاں کس کر غضبناک آواز میں چلائی۔ "تم لوگوں کو واقعی شرم نہیں آتی..... میں آپ لوگوں کے پاؤں پڑتی ہوں....."

میں رو پڑی..... ریت کے گھروندے کی طرح گرنے لگی۔ لیکن بمشکل سنبھل کر ہٹ گئی۔

بڑی دیر بعد طبیعت سنبھلی۔ منہ ہاتھ دھویا۔ اتنے میں "وہ" بھی آگئے۔ لیکن میں نے اس بات کا ذکر نہ کیا۔ آخر ان لفنگوں کا کیا بگاڑا جا سکتا تھا؟ یہی نا! مردوں میں تُو تُو میں میں ہو جائے تو پھر بے پر کی بچہ بچہ کی زبان پر ہو۔

www.taemeernews.com

دوسرے دن میں پانی کا لوٹا لے کر چھت پر گئی۔ مجھے دیکھ کر کسی نے چوں تک نہیں کی۔ آئی مرتبہ بھی کوئی نہ بولا میں نے اس طرف دیکھا ہی نہیں نظریں جھکائے کمرے میں چلی آئی دن گذرتے گئے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے پڑوس میں انسانوں کی بستی نہیں مرگھٹ ہے حسب معمول صبح ہوتی۔ شام ہوتی۔ لیکن کوئی آواز کوئی بے ہودہ کلمہ سنائی نہ دیتا۔ ہائے دل جگر کی صدائیں بالکل بند۔ نہ رقص ہوتے نہ لطیفے کہے جاتے۔ نہ بازاری گانے گائے جاتے نہ منہ سے بلیوں کے لڑنے کی سی آوازیں ہی نکالی جاتیں۔

پہلے پہل دل کو ایک تسکین سی محسوس ہوئی۔ لیکن آہستہ آہستہ طبیعت الجھنے لگی۔ کیا یہ بدتمیز اخلاق کے اس قدر ہی قائل ہو گئے ہیں۔ وہ کونسا احساس لیگانگی تھا۔ جس کی شدت میں پہلے دن ہی وہ مجھ سے اس قدر بے تکلف ہو گئے تھے۔ پانچ مہینوں کے طویل وقفہ کے بعد پڑوس کے آباد ہو جانے پر پہلے پہل انہوں نے اتنی خوشیاں کیوں منائی تھیں۔ تعداد میں اتنے ہوتے ہوئے بھی ان میں ٹوٹی ہوئی زندگی کے آثار کیوں مفقود ہو گئے تھے۔ وہ اس قدر تنہائی کیوں محسوس کرتے تھے۔ وہ کونسی خلا تھی جو پُر ہونے سے رہ گئی تھی۔ یہ کیسے عاشق تھے۔ ان میں کوئی دوسرا رقیب نہ تھا۔ وہ سب جانتے نہ تھے کہ میں اُن کے ہاتھ نہیں آسکتی؟ ان کو معلوم نہ تھا کہ مشرقی، بالخصوص ہندوستانی لڑکی کن قوانین کی پابند ہوتی ہے۔ اور اس کا کیا ایمان ہوتا ہے! پھر بھی ان سب کو بلا کسی جھجک کے مجھ سے بے پناہ عشق تھا۔

اب وہ بھوت دکھائی دیتے تھے۔ وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق معلوم ہوتے تھے اب وہ شریف تھے۔ اب میں اپنے پڑوسیوں پر فخر کر سکتی تھی۔ وہ کس قدر عمر رسیدہ

www.taemeernews.com

معلوم ہوتے تھے۔ بوڑھے!...... بوڑھے!!
جیسے صدیاں گذر چکیں جب وہ جوان تھے۔

ایک اتوار کو ہم دونوں ان کے ایک دوست کے ہاں چلے گئے۔ وہاں سے سینما گھر پہنچے۔ سارا دن ہنسی خوشی گذارنے کے بعد لوٹے۔ گھر کے پاس ہی وہ محلہ کے ایک آدمی سے بات کرنے لگے میں چلی آئی...... پڑوسیوں کے ہاں آج کچھ شور سا سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

دریچے سے جھانک کر دیکھا۔ دو بڑی بڑی چارپائیوں پر سب کے سب بیٹھے تھے۔ وہ بھینس وہ گائے، وہ بچھڑے، وہ ناقر بیڑ وغیرہ کیسے معصوم دکھائی دیتے تھے اس آسمان تلے چند بندے تھے پرماتما کے...... بیہودہ آہستہ آہستہ ہنستے ہنسا رہے تھے۔ جی چاہا وہ مجھے بھی شامل کر لیں۔ کچھ آوازے ہی کس لیں کچھ شور وغل ہی کر لیں۔ کچھ الٹی قلابازیاں ہی لگا لیں......

بے شرمی کی بات! میں باہر صحن میں اس انداز سے کھڑی ہو گئی کہ ان کو نظر آ سکوں۔ دور کھیتوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اس سے بھی زیادہ بے شرمی کی بات یہ کہ میرے سر سے میرا رنگین دوپٹہ کھسک کر شانوں پر آ رہا۔ لیکن میں نے سر نہیں ڈھانپا......

معاً باتیں بند ہو گئیں۔ میں نے چھپی نظروں سے دیکھا۔ وہ آنکھیں جھکائے صحن کے اس حصہ کی طرف تک رہے تھے۔ جدھر نہ وہ مجھے دکھائی دے سکتے تھے اور نہ میں ہی ان کو نظر آ سکتی تھی۔ شام کے دھندلکے میں میلی چادریں لپیٹے آگے پیچھے سے چارپائیاں اُٹھائے ــــ اور پھر موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔

نقاہت سے میں نے اپنا سر تھام لیا۔ اور تقریباً لڑکھڑاتی ہوئی داخل کمرے میں

www.taemeernews.com

آئی۔ بڑے کمرے میں کرسی پر بیٹھی کیا کر پڑی۔ جب میں نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری آنکھوں کا اضطراب غائب ہے اور ہونٹوں کی تھرک گم گالوں کی سرخی نا رد، سینے کی کشش ختم، اور میں بوڑھی کھوسٹ ہو چکی ہوں ٹھیا۔۔۔ چھیا!

رات کو جب وہ ''واپس آئے تو میں نے کہا کہ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ گھر جلدی ہی بدل لیں''۔ ''کیوں؟''

''میرا جی نہیں لگتا''

طے پایا کہ اگلے اتوار کو ہم یہ گھر چھوڑ دیں گے کیونکہ اس وقت ایک کوارٹر مل سکتا تھا

دوسرے اتوار کو ہمارا سامان ٹھیلوں پر لد رہا تھا۔

وہ سب لوگ چھپی نظروں سے ہمارا سامان لدتا دیکھ رہے تھے۔ ان کے پڑوس کا مکان پانچ مہینوں کے طویل عرصہ تک خالی رہنے کے بعد مختصر عرصہ کے لئے آباد رہا اور اب پھر خالی تھا۔۔۔۔

ان کی صورتیں رنجیدہ ہیں، چادریں لپیٹے کامنی سے ادھر ادھر ٹہل رہے ہیں مالش نہیں کرتے ناچتے نہیں، اٹی قلابازیاں نہیں لگاتے، سب سے اوپر کی چھت پر ''بھینسا'' نیچے۔۔۔ گلگڑ، بکرانل سے پانی بھر رہا ہے، وہ بلی کی سی آنکھوں والا گورا سا لڑکا اداس نظروں سے دوسری طرف کو دیکھ رہا ہے۔۔۔۔

ہم تانگے پر بیٹھے ہیں۔ تانگہ والا گھوڑے کو چابک دکھاتا ہے۔

میں محسوس کرتی ہوں۔ جیسے مجھے چاہیئے تھا کہ ان کو اپنی حفاظت میں لے لیتی، جیسے میں نے ہی ان کو جنم دیا تھا، جیسے میں نے ہی ان کو پال پوس کر۔۔۔۔

www.taemeernews.com

گرنتھی

"ست نام" یہ الفاظ حسبِ معمول گرنتھی جی کے منہ سے نکلے اور اُن کے قدم رُک گئے۔ لیکن ان کے کچھرے کا لٹکتا ہوا آزار بند گھٹنوں کے قریب جھولتا رہا۔

"گرنتھی جی! تم کو سو مرتبہ کہا ہے کہ یوں دندناتے ہوئے اندر نہ بڑھے آیا کرو۔ ذرا پرے کھڑے رہا کرو۔ کسی وقت آدمی نامعلوم کیسی حالت میں ہوتا ہے....."

نل کے قریب بیٹھی ہوئی عورت نے اپنی پنڈلی پر شلوار کا پائنچا کھسکا کر ڈھانپ لی۔ اور ایڑیاں رگڑنے لگی۔ گرنتھی کب کا پیچھے ہٹ چکا تھا۔ عورت نے منت میں آستین چھیڑ دی۔ اس کا منہ اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ منہ اوپر اٹھائے رکھنے کی جیسے عادت سی ہو گئی تھی۔ اس کی ڈاڑھی بہت گھنی تھی۔ ٹھوڑی کے نیچے گردن کے قریب بال پسینہ سے تر رہتے۔ گردن کا وہ حصہ اس کو ہمیشہ بے چین رکھتا۔ غیر شعوری طور پر منہ اوپر رکھنے سے ہوا کا کوئی نہ کوئی بھولا بھٹکا جھونکا آتا اور اس کو ٹھنڈک کا احساس ہونے لگتا۔

وہ بیوقوفی کی حد تک سیدھا سادا ضرور تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بالکل احمق ہی تھا..... وہ جانتا تھا آج اس عورت نے وہ بات کیوں کہی پنڈلی آخر پنڈلی ہی میں کیا رکھا ہے۔ اگر کوئی دیکھ بھی لے تو "یہ سو مرتبہ" کی بھی خوب ہے۔ حالانکہ یہ بات اس کو پہلی مرتبہ کہی گئی تھی۔ وہ ہرگز اس طرح دندناتا ہوا اندر داخل نہ

www.taemeernews.com

ہو اگر باہر کھڑا رہنے پر اس کی مدھم آواز سن لی جائے۔ اس کی آواز اچھی خاصی تھی لیکن زور سے آواز دینے پر اس کو ٹوکا گیا تھا" یہ کیا بدتمیزی ہے۔ اس قدر حلق پھاڑنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔" اگر وہ کھڑا ان کی من پسند آوازیں بڑے ترنم کے ساتھ صبح سے شام تک "ست نام ست نام" کہتا رہے تو کوئی اس کی آواز نہ سن پائے اور نہ اس کو روٹی دے۔ گوردوارے کے مسافر بھی ایک مصیبت تھے روز روز روز آدیں نہ اس کو روٹیاں مانگنی پڑیں۔ اپنے واسطے تو وہ کبھی بھی روٹیاں مانگنے نہ آئے۔۔۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پاؤں دھونے والی کی صورت تو دیکھو۔ یہ تو خیر! اس آفت کی پرکالہ صورت بھی قابل دید تھی جس نے اس پر بدنیتی کا الزام تھوپ رکھا تھا۔ سب سے احمقانہ بات جو اس کی بابت کہی جا سکتی تھی یہ تھی کہ اس نے فلاں عورت کی طرف بری نیت سے دیکھا۔ لیکن وہی الزام اس پر لگا کر وہ طومار باندھا گیا تھا کہ توبہ ہی بھلی۔ اتنے میں فتح سنگھ چوکیدار صحن میں داخل ہوا۔

عورت نے بے تکلفی سے پوچھا "آ بھئیا! کیا بات ہے؟" چوکیدار بھئیے نے گرنتھی کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا "وہ سردار جی گھر پہ نہیں؟ وہ آئیں تو کہنا کہ رات کو کنوئیں پر آ جائیں۔" بستی کا کٹورا پیش کئے جانے پر وہ اسے ایک ہی سانس میں پی گیا۔ گرنتھی کے کندھے سے کندھا بھڑا کر باہر نکل گیا۔۔۔ عورت کی پیشانی ناہموار ہو گئی۔

گرنتھی ان سب باتوں کا مطلب سمجھتا تھا۔۔۔ آج اس کو اس کے ناکردہ گناہوں کی سزا ملنے والی تھی۔

اس رات گاؤں کے بڑے کنوئیں پر گاؤں بھر کے سرکردہ اشخاص جمع ہوئے۔

www.taemeernews.com

گرنھتی پہ ہرن کی گئی اور اگر کوئی بات اس کے حق میں نکل آتی جو جھلا تے...... سب لوگ اس سے خفا تھے۔ کسی کی اصلی شکایت یہ تھی کہ وہ ان کے گھر والوں کو پرشاد ہمیشہ کم دیا کرتا تھا۔ کسی کے بچوں کو اس نے گوردوارے کی پھلواڑی جانے سے منع کیا تھا۔ کسی کے گھر میں جا کر کچھ کام کرنے سے اس کی بیوی نے انکار کر دیا تھا لیکن اس پر الزام یہ تھا کہ لاجو ایک دن گوردوارے میں ماتھا ٹیکنے کے لئے گئی تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ـــ لاجو کو گاؤں کے تین سگے بھائی کہیں سے بھگا لائے تھے۔ وہ برائے نام پردہ داری کے ساتھ تینوں کی بیوی تھی۔ وہ تینوں بیکار تھے جو داؤں لگتا کر گذرتے۔ ایک بھائی نے پنساری کی دوکان کھول رکھی تھی۔ کبھی جلیبیاں نکال لیتے کبھی ایک تانگہ تیار کر لیتے۔ موقع پڑنے پر اچھے پیمانے پر چوریاں بھی کرتے کبھی کسی راہگیر کی گھوڑی چھین لاتے ـــ "کیوں لاجو! کیا یہ بات درست ہے کہ گرنھتی نے تمہارا ہاتھ پکڑا؟" لاجو نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ کیونکر گرنھتی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کو گلے لگانے کی کوشش کی۔

"گرنھتی جی تم کو کچھ کہنا ہے؟"

"میں نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا۔"

لاجو چپ کر کچھ کہنے کو تھی کہ اس کو روک دیا گیا۔ "تو گرنھتی جی آج تم نے لاجو کا ہاتھ پکڑا، کل کسی اور کا آنچل کھینچو گے۔ گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزت تمہارے ہاتھوں محفوظ نہیں۔"

"میں نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا!"......

"تم نے کام تو وہ کیا ہے کہ تم کو...... خیر ہم شنکرات کا کام ہنگا کہ پرسوں

www.taemeernews.com

یہاں سے چلے جاؤ۔"

گرنتھی واپس آکر بستر پہ لیٹ گیا ۔۔۔ نیند نہ آتی تھی۔

ایک عرصہ تک ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ اس گوردوارے میں گرنتھی مقرر ہوا تھا۔ یہاں اس کو ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ ایک طرف تواریخی عمارت، دوسری طرف نئی عمارت بن رہی تھی۔ چک ۳۵ اور چک ۳۶ کا یہ مشترکہ گوردوارہ تھا۔ یہ گاؤں چونکہ ایک دوسرے کے بالکل قریب قریب تھے۔ اس لئے علیحدہ علیحدہ گوردوارے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ چڑھاوا بھی زیادہ چڑھتا تھا۔

تھوڑی دیر تک اس کی بیوی اس کے قریب بیٹھی رہی۔ وہ اداس تھی۔ لیکن اس کو اپنے خاوند پہ بھروسہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے خاوند پر جو الزام دھرا گیا تھا وہ سراسر بے بنیاد تھا۔ وہ دونوں اس آفت کا اصل سبب بھی جانتے تھے۔ لیکن لاچار تھے۔ اگر اس جگہ رہنے کا مطلب یہ تھا کہ بات بات میں بے عزتی برداشت کی جائے، اس کی بیوی دوسروں کے گھروں میں جا کر نہ صرف کام کرے بلکہ اُن کی خوشامد بھی کرے تو اس سے بہتر یہی تھا کہ وہ اس غلامی کو خیرباد کہہ کر اپنے گاؤں کو چلے جائیں ۔۔۔۔ لیکن آئندہ وہ کیا کرے گا؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

گرمیوں کی چاندنی رات میں وہ کھلے آسمان تلے چارپائی پر لیٹا صحیح معنوں میں تارے گن رہا تھا۔ اس نے تاروں کی طرف کبھی دھیان ہی نہ دیا تھا۔ ورنہ تاروں کی دنیا بھی کس قدر خوبصورت اور انوکھی تھی۔ کتنی دور تک پھیلے ہوئے بے شمار تارے اور بادلوں کی صورت کے وہ تارے جن کی بابت کہا جاتا تھا کہ مرنے کے

www.taemeernews.com

بعد انسان کی روح اسی راستہ سے ہو کر جاتی تھی۔ نامعلوم وہ راستہ کیسا ہوگا؟ کیسی جگہ ہوگی؟ درخت ہونگے یا ریت کے ٹیلے۔ جب روح تھک جاتی ہوگی تو اس کو دم لینے کی اجازت ملتی ہوگی یا نہیں۔ یہ راستہ آخر کار کہاں ختم ہوتا ہوگا؟

اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب جاگا تو تارے جھلملا رہے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی۔ باڑے میں بوڑھا بیل سینگ ہلا رہا تھا اور اس کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ گوردوارے کے اندر اس کے چھوٹے سے مکان کے صحن میں اس کی بیوی دہی بلو رہی تھی۔ دہی بلونے کی آواز اس بات کا یقینی ثبوت تھی کہ اب صبح ہونے والی تھی۔

وہ اٹھا۔ کلہاڑی پکڑ کر ببول کے درختوں کی طرف بڑھ گیا۔ ایک نازک سی شاخ کاٹ کر اس نے تین داتون بنائیں۔ اپنے لیے، اپنی بیوی کے لیے اور اپنی نو سالہ بچی کے لیے۔ ایک جھاڑن کندھے پر ڈالے وہ کھیتوں میں سے ہوتا ہوا باڑے میں واپس آیا اور بیل کی رسی کھول کر رہٹ کی طرف بڑھا۔

پرانی طرز کا یہ رہٹ سطح زمین سے بہت اونچا تھا۔ ایک اونچا گول چبوترا جہاں سے گدلی مٹی نیچے گرتی رہتی تھی چبوترے کے دونوں طرف گارے کی بے ڈول سی ٹیڑھی میڑھی دو دیواریں کھڑی تھیں۔ ان پر درخت کاٹ کر ایک طویل لٹھ ٹکا دیا گیا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ چرکھڑی کی لکڑی گھسی ہوئی تھی۔ پاس ہی دوسری چرکھڑی اس میں دانت جمائے کھڑی تھی۔ نچلی چرکھڑی کے پاس لکڑی کا کتا جو اس کو پیچھے کی جانب گھومنے سے روکتا تھا۔ جب بیل کو جوت

www.taemeernews.com

دیا گیا اور چڑیاں گھومنے لگیں تو کُتّا کٹ کٹ بولنے لگا۔ کنویں والا بڑا چرخ کھڑا بھی گھوما، رسّیوں سے بندھی ہوئی ٹنڈیں[1] پانی کی طرف لپکیں جو ٹنڈیں رات کی بھری بیٹھی تھیں اُنھوں نے پانی انڈیل دیا۔ جھال میں سے پانی کی دھارا تیزی سے نکلی۔ کنواں عجیب سروں میں رُوں رُوں کی آواز نکالنے لگا۔ کبھی ایسا جان پڑتا جیسے گا رہا ہو۔ کبھی رونے کی سی آواز نکلنے لگتی۔ کبھی اس میں سے دلسوز چیخ کی سی آواز پیدا ہوتی..... تاریکی میں یہ عجیب و غریب آوازیں، چھوٹی بڑی گھومتی ہوئی چرخیاں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے کوئی عجیب الخلقت جانور رینگ رہا ہو۔

شور و غل سے فضا میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اِدھر اُدھر سے دو چار کُتّے بھی بھونکنے لگے۔

گرنتھی نے جھال کی طرف تختہ لگا کر پانی روک لیا۔ تاکہ یہ ٹونٹیوں کی طرف چلا جائے۔ جب کھیتوں کو پانی دینا ہوتا تو پانی کا رخ جھال کی طرف کر دیا جاتا۔ پھر دیواری پر بیٹھ کر اس نے دانتون کی۔ دانتون کی کونچی سے دانت اور مسوڑے صاف کئے، پھر دانتون بیچوں بیچ پھاڑ کر اسے کمان کی صورت گھمایا اور زبان پر رگڑا۔ منہ میں اُنگلی پھیر پھیر کر وہ کھانستا اور تھوکتا رہا۔

کنویں پر جھکے ہوئے شہتوت کے پیڑ پہ پرندے پَر پھڑپھڑانے لگے۔

دانتون پھینک کر اُس نے کپڑے اُتارے ٹونٹی کے منہ سے لکڑی ہٹا دی۔ مُنہ اور داڑھی دھو کر وا گورو وا گورو کا ورد کرتا پانی کی دھارا کے نیچے بیٹھ گیا۔

---

[1] ٹنڈ۔ مٹی کا بڑا آبخورا۔

یہ روز کا معمول تھا۔ کل وہ اس جگہ کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اس وقت یہ بات کس قدر ناقابلِ یقین تھی۔

کچھا نچوڑ کر اس نے بغل میں دبایا۔ پانی سے لبریز بالٹی اٹھائی۔ وہ گوردوارے کے اندر چلا گیا۔ بڑے صحن میں اس کی بیوی جھاڑو دے رہی تھی۔ کچھا جھٹک کر رسّی پر ڈالنے کے بعد اس نے فرش پر پانی چھڑکنا شروع کیا۔

آج سنکرات تھی۔

صفائی اور چھڑکاؤ کے بعد ٹاٹ فرش پر بچھا دیا گیا۔ گرنتھ صاحب پر[1] سلک کے رومال ڈال دیئے گئے۔ چوری[2] بھی صاف کر کے قریب رکھ دی گئی۔ پھر وہ اندر سے ہارمونیم، ڈھولکی، چمٹا، چھینے وغیرہ گانے بجانے کے ساز اٹھا لایا۔ اس کی بیوی پاس کھڑی داتون کر رہی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کو اس بات کا احساس تھا۔ کہ جب ان کو وہاں رہنا ہی نہیں تو ان کی بلا سے وہ کام بھی کیوں کریں۔ لیکن یہ گوردگھر کا کام تھا۔ یہ تو گوردوارے کی سیوا تھی۔ کسی پر کیا احسان تھا۔ اپنی ہی آخرت کا سوال تھا...... اور دونوں کے دلوں میں ایک مبہم سا احساس بھی تھا کہ ممکن ہے کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ ان کا جانا منسوخ ہو جائے۔

لڑکی آج اچھے اچھے کپڑے پہنے پھولی نہ سماتی تھی۔ کتنی پیاری بچی تھی۔

دھوپ نکل آئی۔ اس کی بیوی چہرے پہ چھدّی[3] ڈال کر گدڑی کی گٹھری دھوپ میں جا بیٹھی۔ گرمکھی نے بڑے بڑے مٹکوں میں پانی بھرنا شروع کیا تاکہ سنگت کو

---

[1] مکھیاں کسنے کے استعمال میں آتی ہے [2] جب چھ کپڑے میں ہتیا نے ... رجا پھیٹ ...
جاتی ہے اس کو چھدّی کہتے ہیں۔

www.taemeernews.com

پیاس لگے تو پانی کی دقت نہ ہو۔ گوردوارے کا بوڑھا بیل کمزور ہو چکا تھا۔ کام کم کرتا اور آرام زیادہ۔ یہ تو ہو نہ سکتا تھا کہ سنگت کو پانی پلانے کے لیئے وہ بیل کو شام تک کنویں کے آگے جوتے رکھے۔

سنکھ ہاتھ میں لئے وہ گوردوارے کی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری سے باہر نکل آیا۔ دروازے کے قریب درخت کا ایک بھاری بھرکم تنہ پانی کے گڑھے میں دھنسا پڑا تھا۔ اردگرد گوردوارے کے وہ کھیت تھے۔ جن میں اس نے خود بل چلایا تھا، بیج بویا تھا۔ چاندنی اور اندھیری راتوں میں پانی سے سینچا تھا۔ نلائی کی تھی۔ ان کھیتوں سے اس کا کتنا گہرا تعلق تھا۔ اس کا پسینہ ان کھیتوں کی بھربھری مٹی میں جذب ہو چکا تھا۔ اب وہ اپنی امانت کسی صورت میں بھی واپس لینے کا حقدار نہ تھا قریب ہی بڑ کا ایک بوڑھا درخت تھا۔ جس کی بابت ایک روایت مشہور تھی۔ گورو دل کے زمانے میں ایک نہایت پاکباز شخص اس گوردوارے میں سیوا کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی عمر اسی جگہ گورو کے چرنوں میں بتا دی۔ یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہو گیا ..... لیکن اس کی محنت میں فرق نہ آیا۔ اس کا دل اسی جوش اور خلوص سے لبریز تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ گرمیوں کی دوپہر میں وہ کھیتوں کی نلائی کر رہا تھا۔ اس کی پگڑی کے اندر اس کے الجھے ہوئے بال پسینے میں تر ہو رہے تھے۔ اسے پیاس محسوس ہوئی۔ اس نے ٹنڈ میں پانی بھر کر رسّی کا بگنا باندھ کر اسے بڑ کے درخت کی ٹہنی سے لٹکا رکھا تھا۔ جب اس نے ٹنڈ کو چھوا تو وہ اس قدر ٹھنڈی تھی جیسے برف۔ کس قدر ٹھنڈا پانی ہے اس نے دل میں کہا گورو صاحب، سچے پادشاہ اسی طرف کو آنکلے ہیں کیوں نہ پانی انہیں کے لیئے رہنے دوں۔ وہ انہیں سے

www.taemeernews.com

پانی پی لیں گے تو باقی پانی سے میں اپنی پیاس بجھالوں گا.... بیشک گورو صاحب دورہ کرتے ہوئے اس طرف کو آنے والے تھے۔ لیکن ان کے آنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ اس وقت وہ اطمینان سے دربار میں بیٹھے سنگتوں کو درشن دے رہے تھے۔ یکایک گورو صاحب اُٹھ بیٹھے۔ اور فی الفور کوچ کا حکم صادر فرمایا۔ سب حیران کہ آخر اس میں بھید کیا ہے۔ یہ بیٹھے بٹھائے ایک دم اتنی عجلت کیوں؟ گورو صاحب سچے پادشاہ نے فرمایا، میرا ایک سکھ منتظر ہے وہ پیاسا ہے۔ جب تک میں وہاں جاکر پانی نہ پیوں گا وہ پیاسا ہی رہے گا ... گورو صاحب گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ہوئے اس جگہ پہنچے۔ جاتے ہی پانی مانگا۔ بوڑھے سکھ نے وہ ٹنڈ آگے بڑھادی..... وہ کس قدر خوش تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

گرنتھی درخت کے تنے پر کھڑا ہوگیا۔ جب اُس نے سکھ منہ سے لگایا تو دل میں سوچنے لگا۔ گورو صاحب دلوں کا حال جانتے ہیں۔ وہ میری بے گناہی سے واقف ہیں۔ وہ یہاں سے نہیں جائے گا۔ اُس کو یقین تھا کہ ضرور کوئی ایسی صورت نکل آئے گی۔

سکھ پورنے کے بعد وہ دیر تک گاؤں کی طرف دیکھتا رہا، جیسے وہ بھی کسی کی آمد کا منتظر ہو۔ کتنی تیز دھوپ ہوگئی تھی اور لوگ ابھی گھر سے بھی نہ نکلے تھے۔ مٹیالے مٹیالے مکان۔ مکانوں کے بیچ میں سے سر اُٹھائے ہوئے سرسبز درخت..... کچی سڑک سے آگے ڈھلوان پر بھنگیوں کے کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ دو تین بچھڑے ادھر ادھر قلانچیں بھرتے پھرتے تھے۔

وہ گوردوارے کے چھوٹے سے باغ میں گیا۔ انگور کی بیلیں آڑی ترچھی لکڑیوں

www.taemeernews.com

پسے گر پڑتی تھیں۔ ایک کونے میں سے اُس نے اُلجھی ہوئی رسّیاں اُٹھائیں، بیلوں کو لکڑیوں کے سہارے لگا لگا کر رسّیوں کے ٹکڑوں سے، کچھ ڈھیل دے دے کر باندھنے لگا۔ اس کی موٹی موٹی انگلیاں اپنے کام میں ماہر تھیں۔ قریب ہی ہرے دھنیئے اور مرچوں کی کیاری تھی۔ وہ اُس کے کنارے پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔ بیچ بیچ میں کھٹ مٹھی بوٹی کے چھوٹے چھوٹے پودے بھی تھے۔ اُس نے احتیاط سے اُن کو اکھاڑنا شروع کیا۔ بچے ان بوٹیوں کو شوق سے کھاتے تھے۔ انار کے پیڑ خاموش سادھی میں بیٹھے ہوئے، درویشوں کی مانند نظر آتے تھے۔ ہوا بند تھی۔ پیڑوں کی پتیاں تک نہ ہلتی تھیں معلوم ہوتا تھا جیسے پرماتما سے ان کی لَو لگی ہوئی ہو۔ باغ کا کتنا حصّہ بیکار پڑا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ وہ جھاڑیوں اور مدار کے خودرَو پیڑوں سے وہ حصّہ صاف کر کے وہاں سبزیاں لگائے۔ مٹر، ٹماٹر، گوبھی.....

ہر پیڑ اور پودے کو دیکھتا ہوا وہ باہر نکلا۔ پھر اسی تنے پر کھڑے ہو کر اس نے دوسری مرتبہ سنکھ بجایا۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مرد تو خیر کھیتوں پر کام کر رہے تھے لیکن عورتیں گھروں میں گھسی پڑی تھیں۔ بیوی سے کہنے لگا "دو مرتبہ سنکھ پُورچکا ہوں کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ کم از کم عورتوں کو آجانا چاہیئے۔"

اُس کی بیوی چُپ رہی۔ عورتوں کی بابت وہ جانتی تھی۔ اوّل تو ہر عورت کے چار چار۔ پانچ پانچ بچے تھے۔ ان کو نہلانا دھلانا۔ پھر ہر عورت کو بناؤ سنگھار بھی کرنا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں اپنے گہنوں اور کپڑوں کی نمائش کی جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ دنیا بھر کی باتیں یہیں کی جاتی تھیں۔ کتنی پیچیدہ مسائل یہیں بیٹھ کر سلجھائے جاتے تھے۔

www.taemeernews.com

چھوٹی بچی نے خوشی میں ڈھولکی دھپ دھپانی شروع کی۔ گرنتھی چمبیلی کے پودوں کے گرد اینٹوں کے اکھڑے ہوئے جنگلوں کی مرمت کرنے لگا۔ کہیں کوئی اینٹ گری پڑی تھی۔ کہیں کوئی ٹہنی اینٹوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ کسی جگہ پودے اس قدر پھیل گئے تھے کہ جنگلے کو اور وسیع کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

لوہے کے ڈول بھر بھر کر اس نے پھولوں کو پانی دینا شروع کیا۔ بچارے گیندے کے پھول تو نرے یتیم ہی تھے۔ کوئی ان کی خبر گیری نہ کرتا تھا۔ بچارے خشک اور سخت زمین میں نشو و نما پاتے۔ کوڑا کرکٹ بھی انہیں پر پھینک دیا جاتا۔ اس کے باوجود جب پھول آتے تو ہر طرف پیلا ہی پیلا نظر آتا۔ پھولوں کے ہار گوندھے جاتے، بچے جھولیاں بھر بھر کر گھروں کو لے جاتے۔ کبھی گرنتھ صاحب کے سامنے چڑھا دیئے جاتے، بڑی درگت ہوتی بچاروں کی۔ وہ جب کبھی گیندے کے کسی کھلے ہوئے پھول کی طرف دیکھتا تو اس کو اس کے یتیم ہونے کا خیال آنے لگتا جیسے کہ وہ خود یتیم تھا۔ وہ پودے کے قریب بیٹھ جاتا۔ پھول ہوا میں ادھر ادھر جھومنے لگتا۔ وہ پھول کو پیار سے دونوں ہاتھوں میں لے لیتا۔ جیسے وہ کسی بچے کا چہرہ ہو۔ اس کو ایک بات یاد آجاتی، ایک مرتبہ (غالباً) گورو ارجن دیو جی کے لبادے کی جیب میں آکر پھول کی ایک پنکھڑی خاک پر گر پڑی تو گورو صاحب کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے ــــ یہ سوچتے سوچتے نامعلوم جذبے کے زیر اثر گرنتھی پر رقت طاری ہو جاتی۔ وہ کتنی کتنی دیر تک دم سادھے بیٹھا رہتا۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی عقل موٹی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک ناقابلِ فہم کیفیت میں ڈوب جاتا۔

بھٹی کے قریب اس نے کڑاہ پرشاد کا کل سامان اکٹھا کر دیا۔ لکڑیاں اور موٹے

www.taemeernews.com

موٹے اُپلے بھی ایک طرف ڈھیر کر دیئے اور سنکھ لے کر پھر درخت کے تنے پر جا کھڑا ہوا تیسری مرتبہ سنکھ پور کر وہ دیر تک اسی جگہ کھڑا رہا۔ دھوپ چلچلا رہی تھی۔ آنکھیں دھوپ میں تپی ہوئی ہوا کی گرمی کو برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر گاؤں پر نظر جما دی۔ شاید کوئی صورت نظر آ جائے۔ اس کو فکر تھی کام ختم کرنے کی۔

چند ایک نیلے پیلے دوپٹے ہوا میں لہرائے۔ کچھ کم عمر لڑکے اور لڑکیاں اٹکھیلیاں کرتے دکھائی دینے لگے۔ رنگ برنگ کے رومالوں سے ڈھکی ہوئی تھالیاں ہتھیلیوں پر رکھے زاہد صورت بوڑھی عورتیں پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ دونوں گاؤں کے لوگ چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے نکلے۔ اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں گوردوارے کی طرف بڑھے۔

گرنتھی نے ہاتھ پاؤں دھو کر پگڑی کو درست کیا۔ گلے میں زرد رنگ کا طویل سا کپڑا ڈالے واہگورو واہگورو کہتا گورو گرنتھ صاحب کے پاس جا بیٹھا۔

گرنتھ صاحب سے رومال ہٹا کر ان کو احتیاط سے لپیٹ جلد کے نیچے دباتے ہوئے متبرک کتاب کو کھولا اور آنکھیں موند کر چوری ہلانے لگا۔

لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے عورتیں چار دیواری کے اندر داخل ہوئیں۔ ان میں سے بعض نئی نویلی دلہنیں تھیں۔ جنہوں نے کہنیوں تک چوڑیاں پہن رکھی تھیں سرخ رنگ کی قمیص اور شلوار میں گٹھڑی سی بنی ہوئی وہ بیر بہوٹیوں کی مانند دکھائی دیتی تھیں۔ گورو گرنتھ صاحب کے سامنے پیسے، بتاشے، پھول، تھالیوں میں دالیں، چاول، آٹا وغیرہ رکھ وہ ماتھا ٹیکتیں اور ایک طرف بیٹھ جاتیں۔ لڑکوں میں بعض نے

www.taemeernews.com

ہارمونیم پکڑ لیا۔ ایک لڑکا پچھلے تختے کو ہلا ہلا کر ہوا دینے لگا۔ دوسرا اپنی انگلیوں سے لکڑیوں کے سیاہ و سپید سُروں کو بے تحاشہ دبانے لگا۔ ایک نے ڈھولکی بجانی شروع کی۔ دو لڑکے بڑے چمٹے کو بجانے لگے۔ چھینے بھی چھنا چھن بولنے لگے۔ ادھر عورتیں آپس میں تبادلۂ خیال کرنے لگیں۔ ان کی آوازیں ہر پابندی سے آزاد دُور تک سُنی جا سکتی تھیں۔ کچھ لڑکوں نے اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کیا۔ نئی عمارت کے اینٹوں کے چٹّے لگے ہوئے تھے۔ لڑکوں نے اینٹوں کی ریل گاڑی بنائی۔ ایک لمبی قطار میں اینٹ کے پیچھے اینٹ کچھ کچھ فاصلے پر رکھ دی گئی۔ پھر ایک کو جو ٹھوکر لگائی تو ساری اینٹیں دھڑا دھڑ گرنے لگیں۔ لڑکے اُچھل اُچھل کر شور مچانے لگے۔ ان کی ڈھیلی ڈھالی پگڑیاں کھُل گئیں۔ انہوں نے از سرِ نو باندھنے کی بجائے پگڑیوں کو بغلوں میں دبایا اور باغ کے دوسرے سِرے پر نکل گئے۔ آج وہ نڈر ہو رہے تھے۔ وہ اپنی ماؤں کے ہمراہ تھے۔ گرنتھی کا اوّل تو آج کچھ خوف بھی نہ تھا، دوسرے وہ اس وقت آنکھیں بند کئے گرنتھ صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔

اب مردوں کی آمد شروع ہوئی۔ موٹے کھدّر کے تہبند باندھے، گھٹنوں تک لمبے کرتے پہنے، سروں پر آٹھ آٹھ دس دس گز کلف لگی پگڑیاں لپیٹے، ہاتھوں میں لوہے اور پیتل کی شاموں والی مضبوط لاٹھیاں تھامے اور اپنی ڈاڑھیوں کو خوب چکنا کئے ہوئے آئے اور ٹھاٹ ٹھیک کر کے اِدھر اُدھر بیٹھنے لگے۔ ان میں سرو قد مضبوط نوجوان بھی تھے۔ جن کے تہبند زنگدار تھے۔ تہبند کے پچھلے حصّے ایڑیوں میں گھسٹتے آتے تھے۔ بعض جو شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ ان کے رنگین ریشمی ازار بند خاص طور پر گھٹنوں تک لٹک رہے تھے۔ پگڑیوں کے شملے خوب اکڑے

www.taemeernews.com

ہوئے۔ ایسے چھیل چھبیلے بھی تھے جنہوں نے پگڑی کا آخری سرا گھما پھرا کر پگڑی کے اگلے سرے پر آن ٹھونسا تھا۔ جیسے کسی پلے ہوئے مرغ کے سر پر اس کی شاندار کلغی۔
مردوں کے پہنچ جانے پر کارروائی شروع ہوئی۔ چند نوجوانوں نے بڑھ کر ساز سنبھالے ایک ایک الائچی اور لونگ منہ میں ڈال کر ساز بجانے شروع کیے، ہارمونیم کے ساتھ تال پر ڈھولکی بجنے لگی۔ چمٹے والے نے جھوم جھوم کر چمٹا بجانا شروع کیا۔ ادھر چمٹے بھی ٹکرائے، ہارمونیم والے نے منہ کھول کر ایک طویل "ہو" کی آواز نکالنے کے بعد گایا ؎

ایتھے بیٹھ کسے نہیں رہنا میلہ دو دن دا [1]

اتنا کہہ کر وہ مسلسل منہ ہلانے لگا۔ ڈھولکی والے کی گردن ہلتی تھی تو چمٹے والے کا دھڑ۔ جب ایک مرتبہ کارروائی شروع ہوگئی تو سرکردہ اصحاب نے آپس میں کانا پھوسی شروع کردی۔ کئی مسائل زیر بحث تھے۔
شبد کیرتن کے بعد سری گورو گرنتھ صاحب کی پوتر بانی پڑھ کر حاضرین کو سنائی گئی۔ اس کے بعد گرنتھی چوکی پر سے اترا اور ارداس (دعا) کے لیے گورو گرنتھ صاحب کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ حاضرین نے بھی اس کی پیروی کی سب لوگ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے۔ گرنتھی نے آنکھیں بند کرلیں اور ارداس شروع کردی۔
"پرتھم بھگوتی سمر کے گورو نانک لئی دھیائے۔ پھر انگد گورتے امرداس رامداسے ہوسہائے۔۔۔۔۔"

---

[1] دنیا کا یہ میلہ عارضی ہے۔ کوئی شخص بھی یہاں دائمی طور پر نہ بیٹھا رہے گا۔

www.taemeernews.com

اس طرح دسوں گوروؤں کے نام دہرائے گئے۔ اور پھر۔

"پنج پیارے، چار صاحبزادے (صاحب اجیت سنگھ جی، صاحب ججھار سنگھ جی۔ صاحب جوراور سنگھ جی، صاحب فتح سنگھ جی) چالیس مکتے، شہیدوں، مریدوں، صدق رکھنے والے سکھوں کی کمائی کا دھیان دھر کے خالصہ جی بولو جی واہگورو... "گرنتھی کے واہگورو کہنے پر حاضرین اسکے "واہگورو، واہگورو" کہتے، ادھر حاضرین کی آواز گونجتی ادھر ایک بڑے طبل پر چوب پڑتی اور طبل کی آواز حاضرین کی آواز کے ساتھ گھل مل کر دیر تک لرزتی رہتی اور دلوں پر ایک ہیبت سی طاری ہو جاتی... "جن لوگوں نے دھرم کے لئے جانیں قربان کیں، چرکھڑیوں پر چڑھے (بدن کے) جوڑ جوڑ جدا کروائے، جن کی کھالیں کھینچ لی گئیں، جنہوں نے کھوپریاں اتروائیں، لیکن اپنا دھرم نہیں چھوڑا، جنہوں نے سکھی صدق اپنے سر کے پوتر کیسوں (بالوں) اور اپنے آخری سانسوں تک نبھایا ان سنگھوں (شیروں) اور سنگھنیوں (شیرنیوں) کی کمائی کا دھیان کر کے خالصہ صاحب بولو جی واہگورو...

"واہگورو! واہگورو!!"

..... "جن گورمکھوں نے گوردواروں کے سدھار کی خاطر، سری ننکانہ صاحب جی میں اور سری ترن تارن صاحب کے سلسلے میں اپنے جسموں پر تکالیف برداشت کیں۔ جیتے جی تیل میں ڈالکر جلا دیئے گئے۔ دہکتی بھٹیوں میں جھونک دیئے گئے اور وہ (اس طرح) شہید ہو گئے۔ ان گورو کی صورت رکھنے والے سکھوں کی کمائی کا صدقہ خالصہ صاحب بولو جی واہگورو۔"

"واہگورو! واہگورو!!"

..... "جن ماؤں، بیبیوں نے اپنے بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کروا کر اپنی جھولیوں

www.taemeernews.com

میں ڈلوا لیئے، اُن کی کمائی کا صدقہ خالصہ صاحب بولو جی واہگورو۔"

"واہگورو! واہگورو!!"

طویل دعا کے آخر میں "..... (اے گورو صاحب) ہم کو نفسانی خواہشات، غصہ، لالچ، مجبت اور غرور سے بچا لیئے۔ آپ کے حضور امرت ویلے کی ارداس۔ اگر بھول چوک میں کوئی لفظ کم و بیش ہو گیا ہو تو اس کے لئے ہم معافی کے خواستگار ہیں۔ سب کے کام سنوار لیئے۔ گورو نانک نام چڑھدی کلا تیرے بھانے سب کا بھلا۔"

سب نے جھک کر پیشانیاں فرش پہ ٹیک دیں۔ گرنتھی نے دل ہی دل میں کہا۔" واہگورو سچے پادشاہ سے دلوں کا حال چھپا نہیں۔" پھر کھڑے ہو کر "جو بولے سو نہال ست سری اکال" کے تین نعرے لگائے گئے۔ اس کے بعد کڑاہ پرشاد (حلوا) بانٹا گیا۔ رفتہ رفتہ لوگ پرشاد ہاتھوں میں چھپائے یا کٹوریوں میں لئے رخصت ہو گئے۔ چند سربرآوردہ اشخاص بیٹھے رہے۔ جب تنہائی ہو گئی تو انہوں نے گرنتھی سے کہا کہ اگر پرشاد باقی ہو تو لایا جائے۔ گرنتھی نے پرشاد ان کو بانٹ دیا۔ چہروں کو اپنے چکنے ہاتھوں سے ملتے ہوئے اُنہوں نے بہی کھاتہ سنبھالا۔ پون گھنٹے کے بحث مباحثے کے بعد سب حساب صاف ہوا۔ گرنتھی سے کہدیا گیا کہ دوسرے دن رخصت ہونے سے پہلے وہ چابیاں سردار بگا سنگھ نمبردار کو دے جائے۔

ان کے چلے جانے کے بعد گرنتھی کی سب اُمیدیں ختم ہو گئیں۔ اس کی بیوی نے گھر کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ گرنتھی کے دل میں اب تک کچھ خلش سی تھی۔ وہ اضطراب میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔

www.taemeernews.com

اپنے دونوں ہاتھ پُشت پر باندھے وہ تالاب کے قریب کھڑا ہو کر اُس کے سبزی مائل پانی کو دیکھنے لگا۔ اس کے کنارے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ ایک دو جگہ سے سیڑھیوں کی اینٹیں بھی اُکھڑ گئی تھیں۔ کائی جمی ہوئی تھی۔ اس تالاب میں کوئی نہ نہاتا تھا۔ نامعلوم اس میں کب سے برسات کا پانی جمع تھا۔ ببول کے پیلے پیلے پھولوں کی تہ سی جمی ہوئی برگد کے بڑے بڑے زرد رنگ کے پتے پاش پاش ہو جانے والے جہاز کے شکستہ تختوں کی طرح تیر رہے تھے۔

اس کے قریب پُرانی سمادھ تھی جس کی دیواروں پر سے جا بجا چُونا اُکھڑا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں پر پُرانے زمانے کی رنگدار تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ کئی جگہ سے رنگ اُکھڑے ہوئے ضرور تھے۔ لیکن جہاں کہیں بھی موجود تھے۔ کس قدر چمکدار اور دل کش نظر آتے تھے، خاص کر گورو نانک صاحب کی تصویر۔ درخت کی چھاؤں تلے بابا نانک جی بیٹھے تھے۔ ایک جانب بھائی بالا اور دوسری طرف بھائی مردانہ۔ درخت کی شاخ سے پنجرا لٹک رہا تھا۔ جس میں ایک سُرخ چونچ والا طوطا صاف دکھائی دے رہا تھا اسی حجرے میں ساتویں گورو صاحب پرماتما کی یاد میں مصروف رہتے تھے تین چار برس پہلے کی بات تھی کہ ایک سکھ اسی حجرے میں بیٹھ کر بلا ناغہ بھگتی کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ رات کے وقت یکایک حجرہ منور ہو گیا، ذرہ ذرہ دکھائی دینے لگا۔ اتنے میں ایک نورانی مورت نظر آئی..... لیکن وہ سکھ جلوے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ بھاگ کر باہر نکل آیا۔ اور فی الفور گونگا ہو گیا۔ اس کے بعد

www.taemeernews.com

کسی نے اس کو بولتے نہیں سُنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گرنھتی نے حجرے کا دروازہ کھول کر اس کے نمدا ۔ فرش پر اپنا ننگا پاؤں رکھا ۔ اور چُپ چاپ کھڑا ہو گیا ۔ اتنے میں اس کی بیوی وہاں آئی اور اُس کی متغیر صورت دیکھ کر کچھ پریشان سی ہو گئی ۔ وہ اُس کو اپنے ساتھ لے گئی ۔

صحن میں دستی چرکھڑی وا لے چھوٹے سے کنوئیں کے گرد اگرد سبنے ہوئے چوترے پہ نیلے رنگ کی لمبوتری پگڑیاں باندھے نہنگ سکھ پتھر کے بڑے کونڈے میں شردائی گھونٹ رہے تھے ۔ پگڑیوں پر لوہے کے چکر ، گلے میں آہنی منکوں کی مالا ، لمبے لمبے چمٹے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ لوگ باری باری بادام ، چاروں مغز ، کالی مرچیں اور قدرے بھنگ والی شردائی کی گھوٹائی کر رہے تھے ۔ ایک شخص نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں سے کونڈے کو دونوں طرف سے جکڑ رکھا تھا ۔ اور دوسرا گھونٹنے کا ایک لمبا چوڑا ڈنڈا ، جو نیچے سے کم موٹا اور اُوپر سے بہت زیادہ موٹا تھا ، ہاتھوں میں لیے گھما رہا تھا ۔ ڈنڈے کے اُوپر گھنگھرو بندھے ہوئے تھے جو چھنا چھن بول رہے تھے ۔ گرنھتی کچھ دیر تک ان کو خاموشی سے دیکھتا رہا ۔

سورج غروب ہو چکا تھا ۔ ہوا بند تھی ۔ جب اُس کی بیوی دودھ دُوہ کر گھر کے اندر جا رہی تھی ۔ اُس نے حسب معمول اپنی چارپائی باڑے کے قریب ڈال دی ۔ جوتے اُتار دونوں گھٹنوں پر کہنیاں ٹیک چارپائی پہ ہو بیٹھا ۔

کوؤں کے جُھنڈ کے جُھنڈ کائیں کائیں کرتے گاؤں کے چکر لگا رہے تھے چھوٹی سی نہر کی اُونچی مینڈھ چکر لگاتی اُفق میں گم ہو رہی تھی ۔ دُور چند اُونٹ

www.taemeernews.com

بے مہار اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

گرنتھی کھوئی کھوئی نظروں سے اُفق کی طرف یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ کسی کا منتظر ہو۔ جیسے آسمان سے کوئی نورانی صورت نمودار ہوگی..... تاریکی بڑھ رہی تھی، پُورا چاند بلند ہو رہا تھا۔ اتنے میں بنتا سنگھ کندھے پر پھاوڑا رکھے آنکلا۔ بنتا سنگھ کسی عورت کو اغوا کرنے کے جُرم میں ڈیڑھ برس قید بامشقت بھگت کر کل ہی اپنے گاؤں میں واپس آیا تھا، جیل کی سختیوں کا اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا تھا، وہ بدستور ہٹا کٹا تھا۔ جب اس کو سزا ہوئی تھی۔ اسوقت گرنتھی گوردوارے میں آیا ہی تھا۔ قریب پہنچ کر بنتا سنگھ نے بلند آواز میں ست سری اکال کا نعرہ لگایا۔ چا۔ پائی پر بیٹھ گیا ـــــ اُس کے پھاوڑے سے گاڑھا گاڑھا کیچڑ ٹپک رہا تھا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُس نے پوچھا..... "گرنتھی جی! سُنا ہے کچھ آپ کے خلاف جھگڑا کھڑا کیا گیا ہے..... میں تو کل رات واپس آیا تھا۔ آج صبح سے میں چک ۱۵۶ میں ماموں سے ملنے چلا گیا تھا۔ اب میں سیدھا کھیتوں کی طرف چلا آیا آخر ماجرا کیا ہے؟"

بنتا سنگھ کا نہ صرف اپنے گاؤں میں دبدبہ تھا بلکہ علاقہ بھر میں لوگ اس سے خم کھاتے تھے۔ جب گرنتھی نے اس کو بتایا کہ اُس کی قسمت کا فیصلہ بھی ہو چکا تو وہ جھلا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "کس کی مجال ہے کہ تم کو یہاں سے نکالے۔ گرنتھی جی! تم اسی جگہ رہو گے اور ڈنکے کی چوٹ رہو گے۔ میں دیکھوں گا کون مائی کا لال تم کو یہاں سے نکالنے کے لئے آتا ہے۔"

www.taemeernews.com

یہ سنکر گرنتھی نے، جو اب تک بے حس سا بیٹھا تھا آنکھیں جھپکائیں، اُس کی بھنوؤں کو حرکت ہوئی۔ وہ مسکین آواز میں بولا "اور سردار بنتا سنگھ واہگورو جانتا ہے۔ میں نے لاجو کو چھُوا تک نہیں"

سردار بگا سنگھ کے دو آدمی ادھر سے گذرتے ہوئے یہ باتیں سُن رہے تھے۔ بنتا سنگھ ان کو سنا کر بلند آواز میں للکار کر بولا:۔ "گرنتھی جی! تم یہ کیوں کہتے ہو کہ تم نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ تم ہزار مرتبہ لاجو کا ہاتھ پکڑ سکتے ہو..... میں بگا سنگھ کو بھی دیکھ لوں گا، بڑا نمبردار بنا پھرتا ہے..... اور جن لوگوں نے تمہارے خلاف پنچایت میں حصّہ لیا تھا۔ ان میں سے ایک ایک سے نبٹ لوں گا....."

اپنی بھرپور آواز میں اُس نے یہ موٹی موٹی گالیاں بھی سنائیں.....

یہ خبر دونوں گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی..... سب لوگ لاجو کو گالیاں دینے لگے۔ حرامزادی! مفت میں بچارے گرنتھی پر الزام دھر دیا۔

دیمک

چابیوں کا گچھا زینو کے میلے آنچل سے بندھا لٹک رہا تھا۔ وہ پھونکیں مار مار کر آگ جلانے میں مصروف تھی۔ منہ لال، آنکھیں پُر آب اور بالوں میں راکھ۔ خالد ہاتھ میں یوکلپٹس کی چند سبز پتیاں لئے اپنی ماں کو ان کی خوشبو سنگھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب آلوؤں کے قتلے مسالہ اور گھی میں خوب لت پت ہو گئے تو اس نے پتیلی میں پانی ڈال کر اسے ڈھکنے سے ڈھانپ دیا۔ پانی ڈالنے سے جسوں کی آواز نکلی تو خالد سوں سوں کر کے اس کی نقل اُتارنے لگا۔ اُس کے بال آگے کو گرے ہوئے تھے اور آنکھیں بمشکل نظر آتی تھیں۔

ناجی، آٹھ سالہ بچی، پنجوں پر ناچ ناچتی ہوئی باورچی خانہ میں آ گئی۔ پیچھے پیچھے اس کا بڑا بھائی مجو چھوٹے کنستر کا مردنگ بجاتا داخل ہوا۔ ناجی نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر بازو اُٹھائے اور آنکھوں پر ہاتھوں کا سایہ کر کے آنکھیں مٹکانے لگی۔ گاتے، ناک کے ایک نتھنے میں سے بہتی ہوئی ریزش باہر کی طرف جھانکتی۔ لیکن سڑ کی ایک ہی آواز کے ساتھ غائب ہو جاتی۔ ناجی گردن کو خاص انداز میں گھما گھما کر کولہوں کو بھدّے طریقے سے جھٹکے دے دے کر لٹو کی طرح چکر جو کھانے لگی تو اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ اوندھے منہ بالٹی میں جا گری۔ خالد ہنس کر آگے کو جھکا۔ اس کی پتلی مزد ٹانگیں اس کا بوجھ

www.taemeernews.com

نہ سنبھال سکیں تو ازن خراب ہو گیا۔ وہ ناک کے بل گرا تو دو تین نھالیاں بھی لڑھک گئیں۔ ایک ہنگامہ مچ گیا۔ مجّو نے مردنگ بجانا بند کر کے انگریزی ناچ شروع کر دیا۔ جب وہ پتلی پتلی ٹانگیں اٹھا اٹھا کر ناچتا تو اس کے گھٹنے گلے میں لٹکے ہوئے کنستر سے ٹکرا ٹکرا کر کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا شور پیدا کرنے لگے۔

ٹونکل ٹونکل لٹل سٹارز ہاؤ آئی ونڈر وٹ یو آر

ٹونکل ٹونکل ......

ماں کی للکار سنائی دی۔ بچّوں کو شور کرنے سے باز رکھنے کے لئے وہ خود ان سے بھی زیادہ زور سے چلّانے لگتی تھی۔

"میں کہتی ہوں تُو نے میری ریڈر کہاں رکھ دی؟ ناجی کی بچّی!" سب سے بڑی بہن نجمی آن چلّائی۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ گردن کی رگیں بولتے وقت اُبھر آتی تھیں۔

ناجی کو ماں پچکارنے لگی۔ اس کے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ روئے جاتی تھی ماں نے دلاسہ دیتے ہوئے دوآنے کا لالچ دیا۔ تاکہ وہ چپ ہو جائے لیکن وہ رضامند نہ ہوئی۔ "نہیں میں دوآنے نہیں لوں گی۔ میں تو وہ لال لال پھولوں والا فراک پہنوں گی۔" گویا یہ ناچ نہ تھا ایک سازش تھی۔ جس میں اماں کو پھنسا کر دراصل پھولدار فراک اینٹھنے کا ارادہ تھا۔

"نجمی مردود تو سارس کی طرح لمبی لمبی ٹانگیں نکالے بے شرمی سے ادھر اُدھر بھاگی پھرتی ہے۔ تجھ کو عقل کب آئے گی؟"

"ہائے اللہ میں کہاں جاؤں۔ میری ریڈر جو چھپا دی ہے ناجی کی بچّی نے"

www.taemeernews.com

بچوں کے ابا آئے "پانی گرم ہو گیا کیا؟"

"ہو رہا ہے۔ دیکھئے نا! بچوں نے کیا غدر مچا رکھا ہے"

"ارے کمبختو! تم کو آج پڑھنے کے لئے نہیں جانا ہے کیا؟ ایں؟ کیوں بے خالد! تو جتنا چھوٹا اتنا ہی کھوٹا۔ اپنی ماں کو کام نہیں کرنے دیتا، ہر وقت اس کا آنچل پکڑے رہتا ہے۔ گدھے کے بچے؟" اپنی گالی پر خود ہی مسکرا کر اس نے کنکھیوں سے بیوی کی طرف دیکھا "تیرا باپ گدھا اور تیری ماں گدھی"

"بٹھایئے بھی" زینو بگڑی "صبح سویرے اللہ کا نام لیجئے نا! بچے کیا تمیز سیکھیں گے؟"

زینو کو خالد بہت پیارا تھا۔ وہ اس کو نیک بخت سمجھتی تھی۔ اتنا بڑا ہو گیا تھا پر وہ ماں کا دودھ پیے جا رہا تھا۔ اور وہ پلائے جا رہی تھی۔ اس نے گھسیٹ کر خالد کو گود میں لے لیا۔ قمیص اٹھا، چھاتی اس کے منہ میں دے دی اور اوپر دوپٹے کا سایہ ڈال لیا۔

"بھئی یہ کیا حرکت ہے سو مرتبہ سمجھایا کہ اب اسے اپنا دودھ نہ پلایا کرو"

"کہاں پلاتی ہوں۔ یہ تو کبھی کبھار چپ کرانے کا حیلہ ہے"

"لاؤ پانی"

ذرا صبر کیجے نا! بیٹھ جایئے گھڑی کی گھڑی"

وہ اسٹول پر ٹھنڈے کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔

زینو نے پانی میں انگلی ڈالی "بچی! یوں تو تو بڑی شوقین بنتی ہے۔ ایک کی بجائے دو دو چوٹیاں لٹکائے پھرتی ہے۔ لیکن بال سمیٹنے بھی ہیں تجھ سے۔ دیکھ تو

www.taemeernews.com

بالوں کی لٹیں کیسی اُلجھ رہی ہیں۔

"شوقین، شوقین، کہاں ہوں میں شوقین؟ آپ جب کب مجھ ہی پر الزام دھرتی رہتی ہیں۔ دو چوٹیاں نہ کروں تو کروں بھی کیا؟ اتنے گھنے بال ایک چوٹی میں سنٹتے ہی کہاں ہیں؟" بڑبڑاتی زمین پر زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی وہ چلی گئی۔

"مجو جا میرا بیٹا! چچا سے کہو کھانا کھالیں آکر۔ آج تو یوں بھی دیر ہوگئی ہے۔"

زینو کا دیور بی۔ اے آنرز کا طالب علم تھا۔

مجو چچا کو بلانے گیا۔ چچا کتنے عرصے سے بیٹھا اُبل رہا تھا۔ اب اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ بھوکا ہی پڑھنے چلا جائے گا تاکہ اس کا بڑا بھائی بھابی پر خفا ہو اور آئندہ وہ اس کو ایک غیر اہم ہستی سمجھ کر کھانا تیار کرنے میں دیر نہ لگایا کرے۔ چنانچہ اس طرف سے مجو کمرے کے اندر داخل ہوا، دوسری طرف سے چچا کمرے کے باہر "چچا اماں کہتی ہیں کھانا کھالو۔"

"اب اتنا وقت کہاں ہے؟ کھانا کھا لیجئے اب"۔۔۔۔ اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا چل کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی صورت پر ایسی مظلومیت طاری کرلی جیسے اس گھر میں ہفتہ بھر سے اس کو کھانا نہ ملا ہو اور نہ آئندہ ہفتہ بھر تک کوئی امید ہو۔

مجو خبر لایا "چچا چلے گئے۔ وہ کہتے تھے اب وقت نہیں ہے۔"

"ہائے میں مرگئی۔ بچارہ بھوکا چلا گیا۔ سارا دن بھوکا رہے گا۔ اچھا نوکر کے ہاتھ کھانا کالج ہی بھجوا دوں گی۔"

"کالج کیا کروگی بھجوا کر۔ اس نے سو مرتبہ کہا ہے کہ اس کو کھانا کالج بھیجا کرو سب کے سامنے کھانے سے اس کو شرم محسوس ہوتی ہے۔ لاؤ مجھے پانی دو

www.taemeernews.com

کہیں میں دفتر سے نہ رہ جاؤں۔"

"یہ نیچے پانی تو ہو گیا گرم ۔۔۔۔ اچھا میں نہاتی ہوں دوست کو بلا لو کہ کھانا کھالے اسے بھی جانا ہوگا۔"

"بہت اچھا پکاؤ روٹی۔"

وہ اٹھی، اسٹول اندر کے برآمدے میں رکھا اور ایک کرسی کھینچ دی۔

"مجو میرا اچھا بیٹا! جا نانی کو ساتھ لے جا۔ اپنا منہ بھی دھو آ۔ نیز پرتی بہن کا منہ بھی دھلوا دے۔ پھر آ کر کھانا کھا لو۔ تب میں تم کو نئے کپڑے پہنا دوں گی۔"

"کمبخت نوکر کہاں ہے؟"

"وہ دودھ لینے گیا ہے۔ جہاں دیتا ہے بیٹھ جاتا ہے۔ آپ نہا لئے لیا؟"

"صابن کا پتہ نہیں تولیہ ملتا نہیں۔"

"غصہ جتنے میں نکالے۔ دیتی ہوں۔ نہا تو اب۔ تخانہ کو چھاتی سے لپٹا یا تو وہ ٹھنکنے لگا۔ ارے میرے بیٹا! ماں کو نوچ کر کھا ہی جائے گا کیا؟"

شوہر کو صابن اور تولیہ دے دینے کے بعد وہ بچے کو لئے آگے آن بیٹھی۔ مجو اور نانی بھی منہ دھو کر آ گئے۔

"شاباش شاباش کتنے اچھے بیٹے ہیں۔ لو بیٹھو اب کھانا کھا لو۔ مجو بیٹا تمہاری آپا کہاں ہے؟"

"آپا بھی اندر کے کمرے میں پھر سے سینے کی مشین سے لپٹی رہتی ہیں۔"

زینو نے جلدی سے اُن کے آگے کھانا رکھ دیا۔

"مجو نیچے بیٹیا کو بھی بٹھا لو اپنے پاس اس کو بہت چھوٹا لقمہ دو۔ سب سے

www.taemeernews.com

میں خوب جھگڑا کر دیتا۔ جھگڑنا نہیں۔ روٹی کی ضرورت ہو تو رکابی میں سے لے لینا ۔۔۔ میں ابھی آئی۔

اندر والا کمرہ جہاں آپا نجمی کپڑے سینے کی مشین سے لپٹی رو رہی تھیں نسبتاً تاریک تھا۔ وہاں بہت بڑے بڑے ٹرنک پڑے تھے۔ جو زینو کو آج سے قریباً پندرہ برس پہلے شادی کے موقعہ پر جہیز میں ملے تھے۔ ان کے علاوہ قیمتی کپڑوں کے ٹرنک لوہے کی پیٹی گہنے نقدی وغیرہ سب کچھ اسی کمرے میں رکھا جاتا تھا۔ آپا نجمی بقول مجو کے سسکیاں بھر بھر کے رو رہی تھی۔ اس کی گدرائی ہوئی بانہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اوندھے منہ پڑی تھی۔ چہرہ بالوں کی گھٹاؤں میں پوشیدہ تھا۔ اس نے اماں کے پاؤں کی چاپ سنی لیکن سر اوپر نہ اٹھایا۔ اور نہ رونا بند کیا۔ وہ تسلسل کے ساتھ ہچکیاں لیتی رہی۔ جب وہ گہری گہری سسکیاں لیتی تو اس کے بازوؤں اور کمر میں لرزش پیدا ہو جاتی۔ زینو چپ چاپ اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ چندے سکوت کے بعد وہ بیٹھ گئی۔ اور اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ اور بھی شدت کے ساتھ رونے لگی۔ زینو اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

"نجمی رانی! کیا بات ہے؟ میری بچی تو میرے کہے کا برا ماننے لگی؟ تو تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ میری آنکھوں کا نور ہے۔ پگلی تجھے اتنا بھی معلوم نہیں تمہاری اماں تجھے کتنا پیار کرتی ہے۔ میری رانی! تیرے ہی دم سے تو اس گھر کی رونق ہے۔ تجھے کیا تکلیف ہے۔ تیرے پاس اچھے اچھے کپڑے نہیں، یا خرچ

www.taemeernews.com

کرنے کے لیے پیسے نہیں یا خوبصورت گڑیا نہیں کوئی لڑکی تیرے اڑوس پڑوس میں ایسی ہے جس کے پاس تجھ سے زیادہ کپڑے ہوں۔ تو میری سیانی بیٹی ہے۔ تو اُس دن ناظمہ کی اماں سے کہہ رہی تھی کہ ہماری اماں جی ہم کو فضول پیار نہیں کرتیں۔ وہ تو دل سے ہم سے محبت کرتی ہیں۔ بتا تو میری لاڈلی آج تجھ پر کیا وہم سوار ہو گیا۔ کہ تیری اماں تجھ کو پیار نہیں کرتی۔ کیوں تو اس کال کوٹھری میں پڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے تیرے۔ دشمن روئیں۔ بتا تو میری جان یہ رونا دھونا کیا ہوتا ہے کیا اب تو یہ سمجھنے لگی ہے کہ تیری اماں بے انصاف ہے۔ جابر ہے۔ بے رحم ہے؟

بجمی سسکیاں بھرتی رہی۔

زینو نے گھسیٹ کر بیٹی کو گود میں لے لیا۔ میری لاڈلی! اب تو سیانی ہو گئی ہے ماشاء اللہ۔ اب تیری عمر کیا ہے۔ اب تجھ کو تیرھواں برس شروع ہو چکا ہے میری پندرہ برس کی عمر میں بیاہ ہو گئی تھی۔ تجھے کیونکر سمجھاؤں۔ تو خود ہی سمجھ۔ اب تو دودھ پیتی بچی نہیں رہی۔ اچھا تو ہی بتلا کہ تیری عمر کی لڑکی ٹخنوں تک فراک اور ایک جانگیہ پہنے رانوں تک ننگی ٹانگیں نکالے گھومتی پھرے تو اچھا لگتا ہے؟ مانا تو اپنے گھر میں ہی رہتی ہے۔ لیکن اب تیری عمر گھر میں اس طرح گھومنے کی نہیں ہے۔ میری بچی! یہ باتیں والدین کو اشارۃً کنایتاً کبھی [illegible] عقلمند اور سگھڑ بیٹیاں خود سے کہے کہ بہت سمجھتی ہیں۔ اور وہ کے اشارے [illegible] مطلب کو پالیتی ہیں۔ [illegible] اپنے بال دیکھ [illegible] بالوں کی دیکھ بھال کیا کر۔ کتنے لمبے، کتنے کالے، کتنے گھنے اور کس قدر بوجھل ہیں تیرے بال [illegible] میں تجھ کو دو چوٹیاں گوندھنے سے منع نہیں کرتی اور نہ میں اس کو بُرا سمجھتی ہوں لیکن

www.taemeernews.com

میری لاڈلی بیٹی تو درست نہیں کہ تیرے بال ہر پابندی سے آزاد ہوا میں لہراتے رہیں اور تو سر پہ پندرہ بالشت نہ رہنے دے۔ تو کنواری ہے۔ اب تو کمسن بھی نہیں کہ تیری حرکات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اتنی سی بات تھی جو میں نے تجھ سے کہی۔ میں سمجھتی تھی میری بیٹی میرا کہنا مان جائے گی۔ لیکن تو بجائے میری نصیحت پر عمل کرنے کے رونے لگی۔"

نجمی نے اپنی باہیں ماں کے گلے میں حمائل کر دیں۔

"اری دیکھ تو۔ اب تو میرے برابر ہونے کو ہے۔ اب تو تیرے بوجھ تلے میری ٹانگیں دکھنے لگتی ہیں۔ جب بیٹی ماں کے برابر ہو جائے تو وہ بیٹی نہیں رہتی بلکہ بہن بن جاتی ہے۔ میری نازوں پلی بٹیا! تجھ کو چاہیئے کہ اب تو ہر کام میں میرا ہاتھ بٹائے۔ گھر کے معاملات میں اپنی رائے دے۔ میں اب تھک گئی ہوں۔ میرا جسم کھوکھلا ہو چکا ہے۔ تو پرائی دولت ہے۔ لیکن جب تک میرے پاس ہے اس وقت تو میرا سہارا بن کر رہ۔ میں تجھ سے ان باتوں کی امید رکھتی ہوں اور تو نہ معلوم کونسی دنیا میں بستی ہے۔ اب تو سیانی بیٹی بن۔"

زینو کی باہیں سچ مچ دکھنے لگیں۔ نجمی کو دیکھ کر اسے خوف معلوم ہوتا تھا کس قدر جلد بڑھ گئی ہے کمبخت! قدوقامت میں پوری عورت معلوم ہوتی تھی۔ اور دو ڈھائی برس تک تو اس پر نظر ہی نہ ٹھہر سکے گی۔ وہ نجمی کے جسم کو غور سے دیکھنے لگی۔۔ کس قدر بھرا ہوا۔ چکدار بے عیب بے داغ رنگت۔ دودھیا ہلکا ہلکا سا گندمی جیسے کھیت کی صاف ستھری نمدار مٹی کی بو یا جیسے جنگل میں خود رو سر سبز گھاس کی سوندھی سوندھی خوشبو۔۔۔۔۔ وہ اس کے جسم پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگی کس قدر

www.taemeernews.com

خوبصورت، مکمل، دلفریب، جاذبِ نظر، بال بل کھاتے اور لہراتے ہوئے جیسے سر کی جلد میں سے فوارے کی طرح چھوٹ کر لاوے کی سی تیزی کے ساتھ باہر نکلے ہوں۔ جیسے وہ آگے ہی بڑھتے چلے جائیں گے ...... اس کے بازوؤں میں جکڑا ہوا نجمی کا جسم کس قدر جاندار، کسمسایا ہوا، بل کھاتا اور لچکتا ہوا سا تھا۔ اس بات کا احساس کر کے کہ یہ جسم اسی کے خون کا پروردہ ہے، اسکو عجیب قسم کی راحت سی محسوس ہونے لگی۔ جب اس نے نجمی کے نصف کے قریب بال مٹھی میں لیئے تو اس کی مٹھی بھرپور ہو گئی۔ وہ ان کو مٹھی میں آہستہ آہستہ دباتی رہی ...... اس نے نجمی کا منہ اوپر اٹھایا اور اس کے نرم رخسار پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ کتنی لذت تھی۔ وہ فخر کرنے لگی۔ اسی نے اس جسم کو اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا ___ وہ نجمی کو از سرِ نو دیکھنے لگی۔ جیسے اس نے اس کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ اس کے لئے وہ ایک عجوبہ تھی۔ ایک طلسم تھی، جوں جوں نجمی جوان ہوتی جا رہی تھی۔ توں توں اپنی ماں کے دل کے قریب ہوتی جا رہی تھی ___ وہ اپنی کنواری بیٹی کے اچھوتے جسم کو چومنے لگی جب اس نے اس کی گردن پر اپنے لب رکھے تو وہ کسمسا کر کہنے لگی "مجھے گدگدی ہوتی ہے۔"

"شریر کہیں کی، لے اب اٹھ، میں اور کام بھی کر لوں۔"

"نہیں نہیں نہیں" یہ کہہ کر نجمی ماں کے گلے سے لپٹ گئی۔ اور جیسے اس کے کان میں جادو پھونک رہی ہو "امی! اب میں کبھی نہ روؤں گی۔ نہ کبھی سانپ کی طرح آنکھیں نکالے پھروں گی۔ اور نہ سر کو ننگا رہنے دوں گی۔"

"میری لاڈلی بیٹی! میری لاڈلی بیٹی!!"

www.taemeernews.com

"اور ہاں امی! آپ ناجی اور مجو کے کپڑے نکال دیں میں ہی ان کو کپڑے پہناؤں گی۔"

"بڑی سیانی بیٹی! اچھا تو چل میں تجھ کو کپڑے نکال دوں۔"

"اور امی!" نجمی نے اور بھی لپٹتے ہوئے کہا۔ "آج میرے لئے دو انڈے منگوالینا۔ جب میں اسکول سے واپس آؤں گی تو انڈوں کی سفیدی میں ...... ملا کر اپنے بالوں کو گھنگریالے بناؤں گی۔"

گھر کے بکھیڑے ان چھوٹے چھوٹے کاموں سے فارغ ہو کر، دوپہر کے وقت زینو دھوتی، دھاگہ اور پٹاری سنبھال ڈرائنگ روم میں کوچ پر جا بیٹھی۔ دھوتی پر جھکے جھکے وہ رونے لگی۔

"بجیا! آپ رو رہی ہیں؟ کیوں؟"

اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ "سلمیٰ! میرے پاس بیٹھ جا۔ تو کب آئی؟ چپکے سے دبے پاؤں مجھے تو پتہ نہ چلا۔"

"آپ رونے میں اس قدر محو تھیں کہ میری آمد کی خبر بھی نہ ہوئی۔"

"وہ! میں چھوٹی بہن کو یاد کر کے رو رہی تھی، بچاری......"

سلمیٰ کے چہرے کی سب سے زیادہ دلکش چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ وہ آنکھوں سے ہنستی، آنکھوں سے روتی، آنکھوں سے سنتی اور آنکھوں ہی سے باتیں کرتی...... چنانچہ اب اس نے آنکھیں جھکا لیں۔

زینو نے بات کا رُخ بدلنا مناسب سمجھا۔

www.taemeernews.com

"تمہاری اماں کیا کر رہی ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں بس لیٹی ہیں۔"

"ہمارے ہاں کیوں نہیں چلی آتیں؟"

"نہ جانے۔"

کچھ دیر سکوت رہا۔

"سلمیٰ! اب میرا جی نہیں لگتا۔"

"کیوں!"

"نہ معلوم۔"

سلمیٰ فرش کی طرف دیکھنے لگی، جیسے اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ۔۔۔۔"

"کیا جی چاہتا ہے آپ کا؟"

"یہی کہ تم جلد دلہن بن کر ہمارے ہاں آ جاؤ۔"

سلمیٰ نے شرما کر برقعہ کے آنچل میں چہرہ چھپا لیا۔ سوائے آنکھوں کے حالانکہ اس کو چاہیئے تھا کہ آنکھیں چھپا لیتی۔ باقی چہرہ خواہ کھلا رہنے دیتی۔ زینو کے دیور سے اس کی منگنی ہو چکی تھی۔

زینو ہمیشہ کی طرح سلمیٰ کو بحیثیت دلہن کے جانچنے لگی۔ سلمیٰ اور زینو کو ایک دوسرے سے محبت تھی۔ سلمیٰ نے اپنی اماں کو جتا دیا تھا کہ وہ زینو چچی ہی کے ہاں دلہن بن کر جائے گی۔

"جب تو میرے پاس آ جائے گی سلمیٰ! تو میرے آدھے دکھ ختم ہو جائیں گے

www.taemeernews.com

تو آکر اس گھر کو سنبھال لے۔ پھر میں آرام سے کھاٹ پر پڑی رہا کروں گی۔ رانی اپنے گھر کی آپ دیکھ بھال کر لیا کرے گی۔"

سلمیٰ کو چچی کی گفتگو کا یہ انداز بہت پسند تھا۔ اس کی اس میٹھی زبان اور دل نشین حرکات پر وہ فدا تھی۔

تھوڑی دیر تو قف کے بعد سلمیٰ بولی "چچی اب تو نجمی بھی جلد ہی دلہن بنے گی"

"دیکھو تو کتنی بڑھ گئی ہے کمبخت۔ خدا میری لاڈلی کو نظر بد سے بچائے۔ اس کی جوانی ہے یا جوار بھاٹا۔ اللہ سب کی آبرو رکھنے والا ہے سلمیٰ بیٹی اب تو بچی خیر سے جوان ہے صحت ورہے۔ لیکن وہ منی یا تھ پاؤں کی کتنی مضبوط کس قدر تیز اور تند مزاج ہے۔ اس کے لئے تو کوئی ایسا دلہا چاہیئے جو اس کو ہر طرح سے قابو میں رکھ سکے۔ ورنہ وہ سب کا ناک میں دم کر دے گی ـــــ لیکن میری بیٹی دل کی بری نہیں۔"

"ہاں چچی! دل تو بات ہے بات پر مجھ سے الجھ پڑتی ہے۔ لیکن پڑوں جو کہتی ہوں اگر کبھی میں خفا ہو جاؤں تو پھر سو سو طرح سے مناتی ہے مجھ کو ۔۔۔۔۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ کھیلی ہیں۔ شادی ہو جانے پر نہ معلوم کہاں جائے گی۔ بیچاری نجمو!!"

"بیٹی یہی دستور ہے دنیا کا۔ کیسی کیسی سہیلیاں تھیں میری۔ میں تصور میں سب کی صورتیں دیکھ سکتی ہوں۔ کیسی شوخ، کھلنڈری، ہنس مکھ، البیلی! لیکن ایک دفعہ بچھڑ کر پھر تم سب ایک مرتبہ بھی پہلے کی طرح یکجا نہ ہو سکیں۔ اپنے اپنے دھندوں میں پھنس کر رہ گئیں سب۔ ان کو یاد کرتی ہوں تو دل میں ایک

www.taemeernews.com

ہوک سی اُٹھتی ہے۔ وہ بچھڑے ہوئے، وہ چہرے تھے ۔ ۔ ۔

"ایک بات اور کہہ دوں چچی! آپ ابھی بالکل نوجوان دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے تو یوں ہی پتہ چلا کہ آپ کو ان لیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آپ اس کی ماں تو معلوم ہی نہیں ہوتیں۔ آپ تو اس کی بڑی بہن دکھائی دیتی ہیں۔"

زینو بڑا سنجیدہ اور سگھڑ ہو رہا تھا، یہ بات سن کر پھول گئی۔ اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنی مسرت کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ "سچ میری عمر بھی کیا ہے۔ ذرا حساب تو لگاؤ۔ پندرہ برس کی عمر میں میری شادی ہوئی ـــ اور ٹھیک ایک سال بعد نجمی پیدا ہوئی یعنی میں اس وقت سولہ برس کی تھی۔ اور اب نجمی پورے سات مہینہ اوپر بارہ برس کی ہے۔ اب حساب لگاؤ تو ـــ ہوئی نا میں اٹھائیس برس کی ۔ ۔ ۔ پہلے تو شادیاں بھی چھوٹی سی عمر میں ہو جایا کرتی تھیں۔ بیٹی اب تیری عمر بھی خیر سے سترہ برس کی ہے۔ تین برس سے پہلے تیری شادی کیا ہو گی۔ کیا تو سمجھتی ہے کہ آٹھ سال بعد تو بوڑھی بھی ہو جائے گی۔"

بار بار اپنی شادی کا ذکر سن کر سلمی خوش بھی ہوتی تھی۔ جھینپتی بھی تھی ـــ اب پھر بیچاری کو تھوڑی دیر کے لئے زمین کی طرف دیکھنا پڑا ۔ ۔ ۔ "چچی، ایک بات اور بھی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ کی طبیعت ناساز رہتی ہے۔ آپ کچھ غم کرتی رہتی ہیں۔"

"غم کیا سلمی! بس چھوٹی بہن کے مرنے سے دل دکھی رہتا ہے۔ بیچاری کی یاد آتی ہے تو بے اختیار رو دیتی ہوں۔"

www.taemeernews.com

نہیں چچی یہ تو بات مہینہ پہلے کی بات ہے نا! لیکن میں آپ کو قریباً ڈھائی مہینے سے یونہی دیکھ رہی ہوں۔ آپ کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں..... اچھا بتائیے چچا نے آبائی مکان کیوں بیچا؟..... میں کوئی غیر تو نہیں ہوں۔ آپ چھپاتی کیوں ہیں؟

نہیں بیٹی! میں اکیلی جان اور اس پر اتنی پریشانیاں۔ چھوٹے چھوٹے بچے۔ دیور۔ بچوں کے آبا سبھی کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ گھر کے بیسیوں چھوٹے موٹے کام تجھ سے پوشیدہ نہیں۔ ہمدردی کا ایک کلمہ تک کہنے والا کوئی نظر نہیں آتا البتہ میری ہڈیاں نوچنے کو سب تیار۔ یہ گرہستی بھی جان جوکھوں کا کام ہے۔ اور نوکر تک نہیں کہ ہاتھ ہی بٹا سکے۔ لے دیکر وہ چندھی آنکھوں والا چھگن رہا ہے۔ نوکر ہیں کہ ٹکتے ہی نہیں کمبخت فاقے کرتے چیتھڑے لٹکائے آتے ہیں۔ اچھا کھانے کو ملا اور اچھا پہننے کو۔ آنکھوں پہ چربی چڑھ جاتی ہے پھر تو آدمی نے اڑنے لگتے ہیں۔ کہاں یاد رہتی ہے انکو اپنی حیثیت؟

یہ کمبخت نوکروں کا بھی کال پڑ گیا ہمارے گھر میں بھی۔ دو سال ہے تبھی تو ہم نے بھینس بیچ ڈالی۔ اب کون کرے دیکھ بھال..... چچی آپ دوپہر کے وقت ہمارے گھر آجایا کریں۔ ہمارے بنگلوں کے درمیان ایک باڑ ہی تو ہے کونسا کالے کوسوں کا فاصلہ ہے۔ دیکھئے امی دن بھر میں ایک دو چکر ضرور لگاتی ہیں..... اگر آپ وہاں آجایا کریں تو آپ کا دل بہلا رہے گا۔ اکیلے میں آپ رونے لگتی ہیں مفت میں صحت برباد ہوتی ہے۔"

"میرا نکلنا بھی ہو۔ گھر اکیلا چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ جب تک بچے گھر پر رہتے ہیں۔ سر کھجانے تک کی فرصت نہیں ملتی..... ارے لو آگیا غریب کالج سے۔ آج صبح کھانا بھی نہیں کھا کر گیا تھا۔ اٹھوں اب دیکھوں کچھ بچا ہے کہ"

ادھر تو سلمی کے ہونے والے شوہر بھوکے مرغ کی طرح چونچ کھولے لڑکھڑاتے اندر

داخل ہوئے اُدھر ان کی ہونے والی بیوی برقعہ جھپٹ بگولے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی

صبح کے ہنگامے کے بعد شام کے ہنگامے کا دور شروع ہوا، رونا دھونا، چیخنا چلانا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، ناچنا گانا، دینا دلاسا ـــ سب کچھ ہو چکا تو "بچے" پڑ کر سو گئے۔ کالی رات ...... زیبو طویل و عریض کھڑکی کی چوکھٹ پہ کہنی ٹیکے اور ہتھیلی پہ ٹھوڑی رکھے تھکی ماندی سی کھڑی تھی۔ ساتھ کے کمرے سے بچوں کے ہلنے جلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سب سے پرے کمرے میں کتھئی رنگ کے مٹے ہوئے پردے میں سے اس کا دھندلا سا دولہا نظر آرہا تھا جو کھانا کھانے کے بعد بڑے اطمینان کے ساتھ سرکنڈوں کی بنی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھا ریڈیو سننے میں محو تھا ـــ زیبو نے ابھی تک کھانا نہ کھایا تھا۔ وہ شوہر کی منتظر تھی۔

"ابھی ابھی دہلی سے آپ استاد عبدالستار سے ٹھمری سن رہے تھے۔ وقت گیارہ بجنے کو ہیں۔ ہمارا آج کا پروگرام ختم ہوتا ہے۔ ہم کل صبح آٹھ بجے تک آپ سے رخصت چاہتے ہیں۔ آداب عرض۔"

جواب میں 'آداب عرض' کہہ کر ـــ اس کے دولہا نے ریڈیو بند کر کے روشنی گل کر دی اور کمبل لپیٹ کر سو گیا۔

یہ آخری آواز تھی ـــ اس کے بعد خاموشی ہی خاموشی ـــ تاریکی ہی تاریکی لامتناہی کس قدر وسیع آسمان کس قدر پھیلی ہوئی تاریکی۔ پرے کھیتوں کے سلسلے۔ تاریکی میں اینٹوں کے ٹوٹے پھوٹے بھٹے کے آثار، اس سے بھی پرے گارے کے بنے ہوئے مکانوں والا گاؤں، تاروں کی چھاؤں میں ایک دھبے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

پاؤں کی چاپ سنائی دی ـــ وہ اس آواز سے آشنا تھی۔ یہ اس کے شوہر کے پاؤں کی

www.taemeernews.com

چاپ تھی۔ وہ اندر داخل ہوا اس نے چند کتابیں میز پر پٹخ دیں۔ اور اس کے قریب چلا آیا۔ کمارہ باہر سے کھا کر آیا تھا۔ اس نے زیادہ باتیں نہیں۔ کیونکہ آج اس کو ایک دوست کے ہاں برج کھیلنے کے لئے جانا تھا۔ لیکن اس وقت وہ بہت خوش ......

چنانچہ جب وہ چلا گیا۔ تو وہ کھڑکی رہی حرکت کرنے کی سکت باقی نہ تھی۔ دماغ مشتعل تھا اس پر غنودگی سی طاری تھی۔

کھڑکی میں سے اوپر کو اٹھتی ہوئی ہری ہری بھنگار کے پودوں کی نازک نازک کونپلیں ...... خود رو اودے پودوں کے ہلکے نیلے رنگ کے پھول ــــ ساکن، چپ چاپ۔

برج ؟ !

کیا واقعی وہ اس کو دودھ پیتی بچی سمجھتے تھے۔ کیا ان کا یہ خیال تھا کہ وہ کچھ نہ سمجھتی تھی ؟

کس قدر وسیع آسمان تھا ــــ آنکھ جھپکتے ہوئے ستارے کس قدر روشن سے لگ رہے۔ چمکیلے، دمکیلے ......

www.taemeernews.com

کسبی

برف کے تودے روئی کے گالوں کی طرح آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔

پہاڑوں، درختوں اور مکانوں، ان دونوں کے کندھوں اور ان کے پیچھے پیچھے آنے والے قلیوں کی پیٹھ پر لدے ہوئے سامان پر برف ہی برف۔

ان کے سفر کی یہ آخری منزل تھی۔ وہ بہت تھک گئے تھے۔ انہوں نے بولنا بھی بند کر دیا تھا۔ بس خاموشی سے تھکے ماندے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے قلی بوجھ تلے دبے ہوئے پسینہ میں تر تھے اور سانس دھونکنی کی طرح چلتی ہوئی۔

دونوں خوش پوش تھے۔ ایک دراز قد نازک اندام اور حسین نوجوان دوسرا قد سے پستہ قد، کچھ موٹا اور بھدا۔ لیکن دونوں کے بشرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ حسین نوجوان نے اوورکوٹ کی جیب سے ہاتھ نکال کر اپنی ناک کو چھوا۔ ارے یہ ناک ہے کہ برف کی ڈلی۔ بالکل سن گویا ہے ہی نہیں۔

دوسرا ہنسنے لگا۔ پھر ناک پر سے پانی کا قطرہ صاف کرتے ہوئے بولا: "ہم کس جگہ پٹ اپ (Put up) کر رہے ہیں!"

جواب ملا "سیوائے (Savoy) ہوٹل"

www.taemeernews.com

سیوائے ہوٹل کی وسیع سیڑھیوں کے دونوں طرف برقی روشنی ہو رہی تھی۔ ہنڈے ڈے لائٹ رنگ کے تھے۔ دھند میں اُوپر کو اُٹھی ہوئی محراب پر گہرے نیلے رنگ کے انگریزی حروف چمک رہے تھے "ڈے لائٹ ہنڈوں کی روشنی برف سے ڈھکی ہوئی سڑک تک پڑ رہی تھی۔ اسوقت بڑی گہما گہمی تھی۔ خوش پوش حسین عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے، اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ رکشاؤں کی ریل پیل تھی۔

ایک تحکمانہ آواز گونجی۔ "قُولی!" — ستون کے قریب سے تین چار قلی مانٹ اوڑھے کھڑے تھے۔ انہوں نے بیڑیاں مسل کر جیب میں رکھ لیں۔

ایک سرخ رنگ کا پستہ قد گٹھیلا شخص ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "وش شائید بلیسٹر"

وہ دونوں نوجوان آگے بڑھے۔ ایک نے اوور کوٹ کے اُلٹے ہوئے کالر میں سے چونچ نکال کر پوچھا۔ "ازاٹ سیلواسئے؟"

"اش شر — انہوں نے "اش شر" کہنے والے کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا۔ اسکے چہرے پر چمک تھی۔ اور اس کی پیشانی اور کنپٹیوں پر نیلی و سرخ رگوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔

"آر یو . . . . . . اس شخص نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "اش شر آئی ام دی گائیڈ آف وش ہوٹیل"۔

ہوٹل کے قلیوں نے سامان اٹھایا۔ اور وہ تینوں ہوٹل کی اجلی اجلی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ ہوٹل کا اندرونی حصہ برف کے گرتے ہوئے تودوں کی وجہ سے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں نے گھوم کر دیکھا۔ کہرے میں چھپی ہوئی برف پوش دھندلی عمارتیں ٹمٹماتے کھوئے کھوئے سے لمپ، رکشا کھینچنے والے قلیوں کی کالی کالی پھرتیلی ٹانگیں۔ ہوٹل کی سیڑھیوں کے قریب سے نسبتاً تاریک سی ایک گلی جاتی تھی۔ گلی کے اندر روشنی بہت

www.taemeernews.com

مدھم تھی۔ برف کو چھو کر آنے والی ہواؤں میں سڑے ہوئے تیل اور تلی ہوئی مچھلی کی تیز بو ملی ہوئی تھی۔ اس پُراسرار گلی میں سے دبی ہوئی سی آواز اٹھی:۔

ابر چھایا ہے مینہ برستا ہے
جلد آجا کہ جی ترستا ہے

قدم بقدم وہ آگے بڑھے جا رہے تھے۔ انہوں نے گائیڈ سے پوچھا ۔۔۔ "یہ گلی کیسی ہے ؟"

گائیڈ نے ٹھٹکتے ہوئے جواب دیا ۔۔ "کچھ نہیں سر! ادھر یونہی کچھ ڈانسنگ گرلز رہتی ہیں"

ڈانسنگ گرلز!! جلد آجا کہ جی ترستا ہے ... جلد آجا کہ جی ترستا ہے ..... جلد آجا کہ ... آہستہ آہستہ آواز مر گئی۔ لیکن اس کی صدائے بازگشت دیر تک سنائی دیتی رہی۔ پہاڑ کی ہر غار، آواز کو دگنے سوز کے ساتھ واپس لوٹا رہی تھی .....

دوسرے دن چار بجے بعد از دوپہر حسین نوجوان باہر نکلا۔ ان کا کمرہ اوپر کی منزل پر تھا۔ نیچے ہوٹل کا بڑا صحن تھا۔ اس نے نیچے کی طرف جھانک کر دیکھا۔ صحن میں خوب رونق ہو رہی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ لوگ ٹولیوں میں کھلے صحن میں ہی بیٹھے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ایک طرف ایک بھاری بھرکم سکھ رئیس، دوسری [illegible] سے چائے پینے میں مصروف تھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک نوجوان عیسائی لڑکی بڑے گملے کے قریب کھڑی نوکر سے بات کر رہی تھی۔ اس کی صورت لچکن کی سی تھی۔ ٹانگیں لمبی اور پنڈلیاں فربہ اور ابھری ہوئی چھاتیاں

نوکدار اور بے تحاشا ابھری ہوئی۔ منہ لمبوترا سا۔ رنگ جیسے زیادہ پکی ہوئی اینٹ۔ مگر گال خوب سرخ رنگ سے رنگے ہوئے تھے۔ پرے نیچر فون کے قریب بیٹھا نیم باز آنکھوں سے حاضرین کا جائزہ لے رہا تھا۔ صحن کے پرلے سرے تک اس کی نگاہ پہنچی تھی۔ رنگ برنگ کے دوپٹوں اور پگڑیوں اور فراکوں کی وجہ سے صحن پھولوں کی کیاری بنا ہوا تھا۔

اندر سے آواز آئی "دیویندر! دیویندر! تم باہر ہو؟"

"ہاں۔"

"ادھر آؤ۔ ایک چیز دکھائیں تم کو۔"

سامنے والے کمرے سے ایک چودہ سالہ لڑکا نکلا۔ ٹخنوں پر گھنگرو بندھے ہوئے، وہ ریڈیو کی گت پر پاؤں کو مسلسل حرکت دے رہا تھا۔ سر پر دوپلی ٹوپی، آنکھوں میں کاجل، ململ کی قمیص، تنگ پاجامہ، ٹوپی میں سے نکلے ہوئے سیدھے برش کی طرح بال اس کی چلتی کنپٹیوں تک پہنچتے تھے۔

"اونہہ" ایک کالے سے آدمی نے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "کولھے بھی تو ہلاؤ۔ یوں دیکھو۔ اس جگہ ہاتھ رکھو — یہ — بس اب کولھے بھی تو ہلاؤ۔ اور آں ہاں — جھٹکا بھی دو۔"

دیویندر کے ساتھی نے سر دروازے سے باہر نکال کر کہا "ارے بھائی ابھی ٹھہرو۔" دیویندر اندر گیا تو باہر اس کے ساتھی نے ہانپتے ہوئے کہا "گئی بس گئی۔ کب سے بلا رہا ہوں سرکاری کو... یہ سامنے کے کمرے میں تمہارے پڑوسی جانتے ہو کون ہیں؟"

"ناچنے والوں کی پارٹی ہوگی۔ ابھی ابھی ایک لڑکا باہر کھڑا ناچنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"اونہہ تو ہیں تماشہ مجرا۔ میں شریف گھرانے کی بہو بیٹیاں سمجھے بیٹھا تھا۔ حد ہوگئی۔ آجکل

www.taemeernews.com

دونوں میں تمیز کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔"

نوکر چائے کا ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا۔

دیوندر نے دریافت کیا۔ "کیوں بھئی یہ بغل کا دروازہ بند کیوں ہے؟"

"حضور! مسافر اپنی مرضی سے بند رکھتے ہیں۔ اُدھر کچھ ہے بھی نہیں۔ ایک گلی ہے"

دیوندر نے اپنے ساتھی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بے شک مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے سامنے کا دروازہ کھول دینا ہی کافی ہے" ——— نوکر چلا گیا۔

دیوندر نے بند دروازہ کھول دیا۔ "گویا یہ بازارِ حسن ہے خوب!"

وہ دروازے کے قریب ہی رضائی لپیٹ کر کوچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھی کیلاش نے چائے کی پیالی بڑھائی۔ دیوندر نے پیالی ہونٹ سے لگاتے ہوئے کہا۔ "کیوں بھئی! ہم اس جگہ اس شرط پر تو نہیں آئے تھے کہ چائے پی پی کر سینہ جلائیں۔ کیوں یاد ہے کچھ؟"

کیلاش نے مسکرا کر ٹرے ایک طرف کو سرکا دیا۔ اور شیشے کی لمبی گردن کی صراحی اور دو خوش وضع پیالے میز پر رکھ کر گھنٹی بجا دی۔ کیلاش نے دیوندر کی طرف دیکھا دیوندر نے آرڈر دیا۔ "چار انڈوں کا آملیٹ۔ بھنی ہوئی مچھلی اور تلی ہوئی کلیجی۔"

بادلوں نے گھاٹیوں سے اوپر اٹھنا شروع کیا۔ تیز ہوا چلنے لگی۔ برف پوش چوٹیاں دھند میں روپوش ہو گئیں۔ ریڈیو پر ستار کی گت بجنے لگی۔

دیوندر نے تین جام پی کر صراحی اٹھا کر علیحدہ رکھ دی۔ اس کے رخسار تمتما اٹھے۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑ گئے۔ وہ شاعر تھا۔ زندگی کی آسائشیں مہیا تھیں۔ یوں تو ہر ایک بیکار شخص کو بھی اس کو شاعر بننے کا پورا پورا حق حاصل تھا۔ لیکن اس کے علاوہ وہ متمول بھی تھا۔ اور پھر شاعر بننے کی اہلیت بھی تھی ——— اخلاق اور انصاف کا پابند۔

www.taemeernews.com

لیکن جن کبھاروں کو دانش کی حکومت سے آزاد کر دیتے ہیں وہ چنداں حرج نہ سمجھتا تھا شراب کا ہلکا نشہ اس کے لئے اندرونی سرور انگیز ہوتا تھا۔ علاوہ بریں اس کے ذہن میں گناہ و ثواب کا تصور بھی وہ نہیں تھا جو عام لوگوں کے دلوں میں ہوتا ہے۔ انسان کی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا جس شدت سے اسے احساس تھا شاید ہی کسی کو ہو۔ وہ نیکی میں یقین رکھتا تھا۔ ایک مکمل اور پرامن دنیا میں ایمان رکھتا تھا۔ زندگی میں تعمیری عناصر کو ابھارنا اور پنپانا۔ دگرگوں دنیا کو سنوارنا اور رفاہ عامہ پر پھیلے ہوئے دکھوں کو ہر ممکن طریقہ سے دور کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ بنی نوع انسان میں مذہب اور ملک کی حد بندیوں سے وہ متنفر تھا۔ اس کی فکر بلند تھی، ذہن رسا اور دل پرجوش....

وہ کوچ سے اٹھا اور اوور کوٹ کھونٹی پر سے اتار کر اپنے کندھوں پر ڈال لیا اور بغل کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ اس کے الجھے ہوئے بالوں پر پانی کے قطرے لرزنے لگے۔ کیلاش میز پر طبلہ بجا بجا کر "ساون کے نغمے" میں لگا رہا تھا۔

دیویندر نے ہاتھ کے اشارے سے کیلاش کو بلایا۔ دونوں دروازے میں سے گردنیں باہر کر دیکھنے لگے۔ سامنے کی عمارت کے بڑھے ہوئے چھجے پر نیچے بیٹھی ایک لڑکی کی صورت نظر آئی۔ کیلاش نے آہستہ سے کہا۔ "حسین!"

"جانتے ہو یہ بھی ڈانسنگ گرلز میں سے ایک ہے۔"

"بڑی حسین ہے یار۔"

دیویندر دونوں ہاتھ کمر پر باندھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ کیلاش کرسی پر آن بیٹھا اور متجسس نظروں سے دیویندر کی طرف دیکھنے لگا جو یک بیک سنجیدہ ہو کر بے چینی سے ٹہل

www.taemeernews.com

رہا تھا۔ پھر وہ ایک لمحہ کے لئے دروازے کے آگے پہنچ کر رک گیا "اس عورت کی چھاتیاں شرمناک طور پر عریاں ہیں"

کیلاش خاموشی سے بیٹھا رہا۔ وہ پھر ٹہلنے لگا۔

اتنے میں مینہ بڑے زور شور سے برسنے لگا۔ بڑے صحن کے لوگ اٹھ اٹھ کر بھاگنے لگے۔ رہ۔ فرنیچر کے گھسیٹنے اور گرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد دیوندر نے کہا "تم شاید اندازہ نہ لگا سکو کہ میں اس وقت کیسے ذہنی کرب سے گزر رہا ہوں ـــ ان عورتوں کا وجود انسانیت کی توہین ہے۔ یہ اس جہان کی غلاظتیں ہیں"

کیلاش نے بے رخی سے سگرٹ سلگایا۔

دیوندر نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "اس کمرے پر نگاہ ڈالو۔ ہر چیز با سلیقہ ہے۔ کوچ، یہ کرسیاں، یہ پلنگ، یہ میزیں اور پھر صفائی۔ دری، قالین، فرنیچر، سب چیزیں کس قدر صاف ہیں۔ صرف ایک چیز ایسی ہے جس پر ہم کبھی توجہ نہیں دیتے۔ وہ چیز ہے یہ ردّی کی ٹوکری۔ میز کی بغل میں پھلوں کے چھلکوں، پھٹے پرانے کاغذوں سے پُر۔ کیا اس ٹوکری کا صدقہ نہیں کہ کل کمرہ صاف نظر آتا ہے"

کیلاش نے گلا جھاڑتے ہوئے کہا "تم یار کوئی کام کی بات کہو۔"

دیوندر نے مسکرا کر جواب دیا "تم اس طرح سوچنے کے عادی نہیں ہو۔ غور کرو۔ بارہا ہم سڑک پر جاتے ہوئے جب سڑک کے کنارے پڑے ہوئے غلاظت سے لبریز ڈھول کے قریب سے گزرتے ہیں تو اس وقت اپنی ناک رومال سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ غلاظت کا وہ ڈھول اس جگہ نہ ہوتا تو وہی غلاظت سڑکوں پر پھیلی نظر آتی ۔۔۔۔ یہ بھی زندگی کی ایک ٹریجڈی ہے ۔۔۔۔ ان میں کتنی عورتیں

www.taemeernews.com

ہیں جنہوں نے یہ پیشہ اپنی خوشی سے اختیار کیا ہوگا۔ وہ بھی تعداد میں کم ہونگی جن کو دنیا نے ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔۔۔۔ ایک پہلو سے دیکھا جائے تو یہ دیویاں ہیں۔ یہ وہ زخم ہیں جن کی بقا کے ہم خواہاں ہیں اور جن کو تازہ رکھنے کے لیے ہم اپنی سیاہ اور پرسکون راتوں کی نیند حرام کر ڈالتے ہیں۔۔۔۔ دوست اتنا تو تم کو بھی ماننا پڑے گا۔"

کیلاش نے مسکرا کر دھوئیں کے چکر سے بناتے ہوئے کہا۔ "بکے جاؤ۔"

دفعتاً تاریکی سے روشنی میں آنے پر دیوندر کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کچھ شراب کا نشہ بھی تھا۔ کیونکہ کیلاش کے ساتھ رات بھیگ جانے تک شراب کا دور چلتا رہا۔ ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ وہ اندر داخل ہوئی۔

دیوندر اس کو آنکھیں جھپک جھپک کر دیکھنے لگا۔ عام لوگ اسی کو رنڈی کہہ کر پکارتے تھے۔ نام کس قدر مکروہ تھا حالانکہ صورت کے لحاظ سے وہ دیویوں کو بھی مات کر دیتی تھی۔ اس نے معصومیت سے ہنس کر کہا۔ "آداب عرض! آپ تشریف لے آئے مجھ کو یقین تھا کہ آپ آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔"

دیوندر کا جی چاہا کہ وہ بھاگ نکلے۔

"آپ کے ایک اور ساتھی بھی تھے۔ وہ کون صاحب تھے؟"

دیوندر کنواری لڑکی کی طرح شرما گیا اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ "وہ میرے دوست ہیں۔"

"دوست؟ خوب! وہ کیوں نہیں آئے؟"

www.taemeernews.com

"وہ سوئے ہوئے تھے۔"

عورت نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

دیوندر کچھ سمجھ کر جھینپ گیا۔ "میں ان سے کہہ کر نہیں آیا۔ بلکہ ان سے چوری آیا ہوں ——— میں نے آج دوپہر کو جب آپ کو دیکھا۔۔۔۔۔"

"اوہ! یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کے دل پر کیا گذری ہوگی۔ شاید آپ بھول رہے ہیں ہمارے پاس بہت لوگ آتے ہیں۔۔۔۔"

دیوندر شراب کے نشے میں تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر گفتگو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر بھی وہ یہ بات چھپا نہ سکا کہ وہ پیئے تھا۔

جتنی دیر تک وہ خاموش رہا۔ وہ اس کو دیکھتی رہی۔ اسے وہ پسند تھا۔ بہت پسند۔ دیوندر کو اور کچھ نہ سوجھا۔ "۔۔۔۔ میں نے آج تک کسی عورت کو چھوا تک نہیں۔"

عورت یہ سن کر بے تحاشہ ہنسنے لگی۔ وہ ہنستے ہنستے دوہری ہوگئی۔ اس نے اپنا پیٹ تھام لیا۔ مگر دیوندر بالکل سنجیدہ تھا اور حیران۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ عورت چاہتی تھی کہ جواب دے مگر ہنسی رک نہ سکی۔ بمشکل ہنسی روک روک کر بولی "اچھا تو اس کا کوئی مضائقہ نہیں۔"

دیوندر خود کو بے وقوف محسوس کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی بات دہرا دی "شاید آپ کو یقین نہیں آیا۔ میں کنوارا ہوں۔"

عورت نے بعد کوشش سنجیدہ بن کر کہا "میں آپ پر یقین کرتی ہوں۔"

دیوندر بغلیں جھانکنے لگا۔ "میں آپ کے پہلے گاہکوں سے قطعی مختلف ہوں۔"

عورت نے اس کے حسین خد و خال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "میں آپ کی یہ

www.taemeernews.com

بات بھی تسلیم کرتی ہوں۔ پھر اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اس نوجوان سے ایک دمڑی بھی وصول نہ کرے گی۔

دیوندر نے حوصلہ پا کر بات چھیڑ دی "جب میں نے آج شام کے وقت آپ کو دیکھا تو مجھے آپ کی ذات سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔"

عورت نے اس نوعمر چھوکرے کو رحم بھری نگاہوں سے دیکھا اور جواب دیا۔ "مجھے بھی آپ کے ساتھ اتنی ہی ہمدردی ہے۔"

دیوندر کو عورت کا یہ انداز تکلم مارے ڈالتا تھا۔

وہ اپنے خیالات کو یکجا کرنے لگا۔ اس کی سوچنے کی قوت سلب ہو چکی تھی۔ وہ جوش اضطراب اور لمبے چوڑے الفاظ غائب ہو رہے تھے۔ اس نے مری ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "آپ لوگوں کی زندگی بھی کس قدر پُر الم ہے۔ آپ کا دل تو بہت کڑھتا ہوگا۔"

عورت کے چہرے پر اداسی آ گئی۔ "آپ درست فرماتے ہیں آپ جیسے ہمدرد دل رکھنے والے لوگ بہت کم آتے ہیں۔ کم از کم مجھے تو واسطہ پڑا نہیں۔"

دیوندر نے سوچا کس قدر حسین ہے یہ لڑکی..... بچاری..... وہ اس کے قریب چلا گیا۔ عورت کچھ آگے کو جھک گئی۔ وہ سمجھا شاید وہ گرنے کو ہے۔ اس نے اس کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ اس کے سینہ سے لگ گئی۔ ہچکیاں لیتے ہوئی بولی۔ "بعض وقت تو ایسے لوگ آتے ہیں کہ ان کی مونچھیں میرے نتھنوں میں گھس جاتی ہیں۔ دم گھٹنے لگتا ہے۔" پھر اس نے سر اٹھا کر دیوندر کی طرف دیکھا۔

"تم کتنے اچھے ہو۔"

www.taemeernews.com

دیوندر کے جسم میں برقی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کے جسم کی قوتِ مدافعت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ نوجوان عورت اس کے ساتھ لپٹی جا رہی تھی۔ دیوندر پر دوآتشہ نشہ طاری تھا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اس نے ازحد کوشش کے بعد بچنے کی کوشش کرتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں کہا "تم میری ماں ہو"

عورت نے اس کے رخسار پر رخسار رکھ دیا "معلوم ہوتا ہے زیادہ پی گئے ہو" وہ اس کو سہارا دے کر پلنگ پر لے گئی۔

دیوندر کے دماغ پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے وہ بادلوں میں اڑا جا رہا ہو۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کہہ نہ سکتا تھا۔ وہ خلا میں بے بسی کے ساتھ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس کو محسوس ہوا کہ اب بھی اگر وہ کوشش کرے تو وہ کچھ کہہ سکتا تھا۔ وہ یاد کرنے لگا۔ کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے نکلا۔

"تم دیوی ہو"

عورت ہنس پڑی۔ اس کے رس بھرے ہونٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ذرا اور قریب آجاؤ۔۔۔۔ تم دیوتا ہو"

عورت نیچے تک اس کو نصیحت کرنے کے لئے آئی۔ اس نے ازحد محبت اور خلوص سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے اوور کوٹ کے بٹن بند کئے۔ اس کا بٹوا جو پلنگ پر گر پڑا تھا۔ اس کی اندر کی جیب میں رکھتے ہوئے بولی "بٹوا سب سے اندر کی جیب میں سنبھال کر رکھ لو۔ یہ بدمعاشوں کا محلہ ہے۔ سنبھل کر جانا۔ سستے میں کوئی نکال نہ لے"

www.taemeernews.com

یہ کہہ کر اس نے سکوت کیا۔ پھر مسکرا کر اس کے ہونٹوں سے ہونٹ ملا دیئے۔
..... اچھا اب رخصت، کوٹ کے کالر دہرے کر کے سینہ ڈھانپ لو کہیں سردی نہ کھا جانا۔"

دیوندر لرزاں ہاتھوں سے کالر ٹٹولنے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ ہنسنے لگی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے کالر دہرے کر دیئے۔ اس کے رخسار پر ہلکا سا چپت جماتے ہوئے کہا۔ "تم بالکل لڑکے ہو ——— تبھی تو اتنے پیارے لگتے ہو۔"

صبح جب دیوندر کی آنکھ کھلی اس نے دیکھا کہ کیلاش چا پی رہا ہے۔
وہ کاشمیری چادر لپیٹتے ہوئے اٹھا۔ اور بغل والے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ آسمان پہ بادل کا نام و نشان تک نہ تھا۔ تیز اور چمکدار دھوپ میں پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں، برف سے لدے ہوئے درخت، اور برف سے اٹی ہوئی چھتیں چمک رہی تھیں۔ رکشا کے اڈے پر قلی بغلوں میں ہاتھ دبائے کھڑے تھے۔

دیوندر نے یہ پُر کیف منظر دیکھ کر بازوں پھیلا کر ہاتھ اوپر اٹھا دیئے اور گہری سانس لی۔

آہستہ آہستہ رات کے واقعات یاد آنے لگے۔ اس کے ذہن میں ایسی کشمکش شروع ہو گئی۔ جیسے وہ کسی بھولے بھٹکے خواب کو یاد کرنے کی کوشش میں ہو۔

www.taemeernews.com

اس نے گردن بڑھا کر نیچے کی طرف نگاہ ڈالی۔ سامنے وہ بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کی حالت ابتر تھی۔ بال اُلجھے ہوئے۔ کپڑے بے ترتیب۔ کاجل آنکھوں کے اردگرد پھیلا ہوا۔ کل کی طرح نیم عریاں سینہ ۔ ۔ ۔ ۔

اتنے میں عورت نے اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر دلفریب انداز سے مسکرا کر بڑے ناز کے ساتھ لمبا کش کھینچا اور آنکھ مار کر دھواں ناک کے رستہ اڑا دیا۔

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

مہمان

سردی میں ٹھٹھرا ہوا، ہاتھ پتلون کی جیبوں میں چھپائے لشتم پشتم خدا خدا کر کے ہوٹل تک پہنچا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ فوراً بستر میں گھس کر لحاف لپیٹ لے اور سو جائے۔ لیکن ابھی اس نے کھانا بھی نہ کھایا تھا۔ وہ بھٹیوں کے قریب جا کھڑا ہوا، ہاتھ سینکتے ہوئے اس نے پوچھا۔ کیا پکایا ہے آج ——— مونگ کی دال اور کدو ——— کدو سے اس کو نفرت تھی۔ ہوٹل والے ماہوار کھانے والوں کے لئے بغیر گھی کی سب سے گھٹیا سبزی پکاتے تاکہ کھانے والا اسپیشل نہ کا ہی یا گوشت وغیرہ کی پلیٹ خریدنے پر مجبور ہو جائے۔

...... اسپیشل کیا ہے؟..... گوبھی آلو، مٹر، بیف بھی ہے، گوشت، قیمہ.....

اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک اب دور ہو چکی تھی۔ اس نے مٹھیاں کھولتے اور بند کرتے ہوئے سوچا کہ اگر آدھی پلیٹ روغن جوش لیا تو چار آنے خرچ ہونگے۔ اگر نصف پلیٹ قیمہ تو تین آنے اور گوبھی کی آدھی پلیٹ دو آنے میں ہی مل جائے گی۔

..... تو بھئی آدھی گوبھی اسپیشل اور باقی جو کچھ بھی ہو۔

پتھر کی میز کے آگے کرسی پر بیٹھ کر وہ انگلیوں سے طبلہ بجانے لگا۔ پھر اس نے کوٹ کے کالر سیدھے کرنے جو کان ڈھانپنے کے لئے اوپر اٹھا دیئے گئے تھے۔ سامنے ایک جاپانی تصویر تھی۔ دریا کا کنارہ..... افق میں اونچے نیچے ٹیلے.....

www.taemeernews.com

پیش منظر میں دو جاپانی عورتیں نہانے کا لباس پہنے ہنستی چلی آ رہی تھیں ان کے درمیان ایک چھوٹی سی لڑکی جس کے ہاتھ سے اس کا ربڑ کا غبارہ چھوٹ کر نیچے پانی میں گر پڑا تھا وہ اچک کر اس کو پکڑنے کی فکر میں تھی۔ نہ معلوم لڑکی کا لباس عورتوں کی طرح کا کیوں تھا۔ چھوٹی سی کمسن لڑکی تھی۔ اگر اس کو پورے لباس کی بجائے صرف ایک جانگھیہ پہنا دیا جاتا تو کیا ہرج تھا۔ کس قدر گھٹیا تصویر تھی نہ کوئی کلر سکیم نہ توازن ..... عورتیں بالکل بے جان احساسات سے خالی جیسے ملولائڈ کے ہوں ـــــ ان کے پاؤں کی ٹکر سے جو پانی اُٹھتا دکھایا گیا تھا وہ ٹخنوں کے قریب اُٹھنا چاہیئے تھا اور پھر ٹانگوں سے ٹکرانے کے بعد میں پانی کا کچھ دور تک ناہموار ہونا سمجھ میں آ سکتا ہے۔ لیکن یہ بات فہم سے باہر ہے کہ ٹانگیں تو ابھی دور اور پانی اُن کی سیدھ میں دو گز ادھر سے ہی اچھلنے لگا ہے۔ گھٹیا قسم کے آرٹسٹ اپنا اُتو سیدھا کرنے کے لئے دس دس منٹ میں ایسی تصویریں بنا کر روپیہ کماتے ہیں.....

نوکر ادھر سے گزرا "اسے روٹی لا۔"

اس کی آواز سن کر ہوٹل کا بھاری بھرکم منیجر ادھر چلا آیا۔ اس کا منہ ہمیشہ پان کی پیپ سے بھرا رہتا اور پیک روک روک کر بڑی مشکل سے بات کیا کرتا تھا۔ طبیعت کا بُرا نہ تھا۔ لیکن اس کی اس عادت سے بشمبر کو سخت گھن آتی تھی "بابو بشمبر لعل!....."

اس نے منہ کھول کر ایک دم بند کر لیا "تم سے کوئی ملنے آیا تھا"

"مجھ سے ملنے کے لئے؟"

منیجر نے بڑی مشکل سے منہ کھولا "ہاں تمہارا گیسٹ....."

یہ مہمان کون تھا۔ آخر اس سے ملنے کے لئے کون آ سکتا تھا۔ وہ بہت کم لوگوں

www.taemeernews.com

واقف تھا۔ اور جو تھوڑے بہت شناسا تھے ان کو اس کی جائے رہائش کا پتہ معلوم نہ تھا۔ وہ ایک معمولی کلرک تھا مشکل سے گزر ہوتی تھی۔ صرف دو تین مقامی دوستوں کو اس کا ٹھکانا معلوم تھا۔ سو وہ کبھی کبھار آ نکلتے . . . . آخر کون آیا تھا؟

"منیجر صاحب، اس کا نام کیا تھا؟"

"نام تو میں نے پوچھا نہیں . . . گورے گورے سے . . . ."

"گورے گورے . . . . بہت لوگ گورے ہو سکتے ہیں۔ گورے ہونے کی بھی کوئی نشانی ہے۔ بعض لوگ کس قدر بے وقوف ہوتے ہیں ——

نوکر نے تھالی آگے رکھ دی۔

اس کی موجودہ بے کیف اور خالی خالی زندگی میں، جب کہ وہ بالکل تنہائی اور خاموشی سے دن گزار رہا تھا اس خبر نے ہلچل سی پیدا کر دی۔ اس وقت وہ کسی مہمان کی آمد گوارا نہ کر سکتا تھا۔ اس کا کمرہ اس قدر چھوٹا تھا کہ ایک چارپائی ڈال دینے پر اندر چلنا پھرنا بھی دوبھر ہو جاتا۔ پیسے اس قدر کم کہ کسی مہمان کو ایک دن بھی کھانا کھلانا دشوار تھا۔ اور پھر مہمان مہمان میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً وہ لانبی داڑھی اور بڑے پگڑ والے بزرگ جو دو ڈھائی ماہ بعد جب کبھی آ ٹپکتے تو جینا محال ہو جاتا۔ وہ اپنی داڑھی جھٹکتے ہوئے اس کے سامنے اپنی دور دراز رشتہ داری کی اہمیت واضح کرنے کے بعد خشک باتوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیتے۔ ان کی مقدمہ بازیاں، فلاں رشتہ دار نے ان سے کیا کہا اور انہوں نے اس کو کیا جواب دیا۔ وہ عورت جو اُن کے بھانجے نے بھگائی تھی۔ دراصل اس نے خود نہیں بھگائی تھی۔ بلکہ ایک رات عورت خود اس کے پاس آئی بولی چلو مجھے لے چلو کہیں نہ کہیں لے چلو میں تمہاری داسی ہوں۔ وہ بچارا کل کا چھوکرا کیا جانے۔ آ گیا

www.taemeernews.com

جھانکتے ہیں ..... اب تجھ کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں ..... یا پھر جیسی ! ذرا انگریزی میں درخواست تو لکھ دو۔ اس نے درخواست کبھی نہ لکھی تھی اور پھر ان کی زبانی جس بے ربط طریقے سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور جس طرح بار بار ایک ہی بات کی تاکید فرماتے وہ کہتا جناب ! یہ بات ایک مرتبہ لکھی جا چکی ہے۔ بار بار اس بات کی تکرار انگریزی میں مناسب نہیں ہوتی تو وہ حیرت سے منہ کھولے اس کی طرف دیکھنے لگتے جیسے کہہ رہے ہوں" اب یہ نوکل کا چھوکرا مجھے سبق پڑھانا نے لیے تو ہے" جب وہ آتے تو اس کا دل چاہتا کہ وہ اس دروازے سے آئیں تو اُدھر کے دروازے سے وہ کھسک جائے ..... اور کبھی اس کے پھوپھا کا لڑکا چونی کا دن سے اُدھر آنکلتا تو بجائے نمستے کرنے کے وہ بازو پھیلا کر اس کے گلے سے لپٹ جاتا۔ ساتھ ہی زور زور سے بے معنی الفاظ اس کے منہ سے فر فر نکلنے لگتے۔ باتیں اس قدر زور زور سے کرتا کہ اِدھر اُدھر کے لوگ اُن کی طرف دیکھنے لگتے ..... گھر ہو گلی ہو بازار ہو کوئی جگہ ہو اس کا رویہ تبدیل نہ ہوتا۔ کبھی وہ ایک نہایت ہی معمولی بات اس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتا کہ اس کا جی چاہتا اپنے بال نوچ لے۔ چونی چھکڑے کے بھاری بھرکم پہیے کے کیچڑ میں دھنس جانے کی داستان چھیڑ بیٹھتا۔ صاحب ! پہیہ کیچڑ میں دھنس گیا۔ دو بیل زور لگا رہے ہیں۔ اس زور آزمائی میں ان کی دمیں تن کر سیدھی ہو جاتی ہیں۔ لیکن پہیہ ہے کہ اور بھی دھنسا جاتا ہے۔ چھکڑے والے نے بھی زور لگانا شروع کیا۔ لیکن پہیہ ..... جیسے کنوئیں میں اترتا جا رہا ہو۔ اِدھر اُدھر کے دو چار راہگیر بھی لنگوٹ کس کر ایک بڑے لٹھ سے دوسرے پہیے کو اٹھا کر گھمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ دھکے دے کر اسے نکالنا

www.taemeernews.com

چاہتے ہیں لیکن سب بے سود...... آخر ہوتا کیا ہے؟ وہ خود کیچڑ میں گھس جاتا ہے۔
اور بچے کو کندھا دے کر جو ملبہ بولتا ہے تو بہتے کیچڑ سے باہر نکل بھی گئے چلے جاتے ہیں
رکتے ہی نہیں۔ خدا خدا کر کے اگر یہ بات ختم ہو جاتی تو وہ فوراً اسی قسم کا ایک دوسرا
قصہ لے بیٹھتا...... یا پھر اس کے بڑے ماموں صاحب۔ تھے خاموش طبیعت غریب
چارپائی پر لیٹے رہتے۔ سارا سارا دن پڑے رہتے۔ اس کو ان کے آنے پر کوئی
خاص تکلیف محسوس نہ ہوتی تھی لیکن عادات ان کی بھی عجیب تھیں جو پگڑی جس طرح
باندھ کر آتے جب تک اس کے پاس ٹھہرتے اس کو اسی طرح باندھے رکھتے۔ کبھی
کھول کر ازسرِنو نہ باندھتے نہ معلوم کسی غیر سے بندھوا کر آتے تھے۔ رات کو سونے
سے پہلے اسے قریب کی کرسی پر رکھ دیتے صبح اٹھتے تو منہ ہاتھ دھونے کے بعد
پھر اس کو سر پر رکھ لیتے ویسے تو پگڑی کا کچھ نہ بگڑتا تھا جس بھدے طریقہ پہ وہ
بندھی ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ بھدی تو خیر کیا ہو سکتی تھی لیکن ڈھیلی ضرور ہو
جاتی مگر اس کے ڈھیلے ہو جانے کی ان کو پروا نہ تھی۔ اسی کو تھپتھپا کر سر پہ جمائے رکھتے
وہ کبھی کام کے بغیر نہ آتے تھے اتنے بڑے شہر میں یونہی چلے آنا تو محض فضول خرچی
تھی۔ اس لئے ضرور کسی نہ کسی کام سے آتے لیکن جب تک وہ کام پورا نہ ہو ان کا
اس کے ہاں رہنا نہ ختم ہوتا تھا۔ سارا سارا دن چارپائی پر پڑے رہتے...... معمولی
اردو پڑھ لکھ لیتے جو کتاب یا اخبار ہاتھ لگتا بلا تکلف پڑھنا شروع کر دیتے غلط سلط
جو کچھ بھی سمجھتے اس کو ختم کر کے چھوڑتے۔ روسو کا معاہدۂ عمرانی دو ڈھائی گھنٹہ میں
ختم کر کے کہنے لگے۔ شمیم یہ پوتھی تو میں نے ختم کر دی کچھ اور دو۔ ماموں! آپ کو پسند
بھی آئی یہ پوتھی؟ بھئی میری سمجھ میں تو آئی نہیں لیکن بغیر پڑھے میں چھوڑتا نہیں۔

www.taemeernews.com

اس کے بعد اگر ان کو پستالوزی یا کانٹ پڑھنے کو مل جاتا تو وہ ہرگز اعتراض نہ کرتے پھر شام ہو جاتی تو ایک موٹا سا کھیس لپیٹ کر بلا تکلف مال روڈ کی سیر کے لئے چل کھڑے ہوتے۔ بشمبر کو ہمراہ ضرور لیجاتے اور وہ تینوں کوٹ پہنے بھیگی بلی کی طرح ساتھ ہو لیتا..... کوئی دوست مل جائے یا کسی خوش پوش شریف آدمی سے باتیں شروع ہو جائیں ..... لیکن وہ اپنی عادت نہ چھوڑتے تھے۔

لیکن اب وہ بزرگ بنوں میں تھے وہاں ٹھیکیداری کا کچھ کام تھا۔ چونی کو اس کے بڑے بھائی نے ٹاٹا نگر بلا لیا تھا۔ گاؤں میں انہیں دنوں ایک بڑا میلہ لگنے والا تھا اس لئے ماموں جی کی تشریف آوری کا احتمال بھی نہ تھا..... شاید شہباز منگھو، وہ اکٹھے پڑھتے رہے تھے۔ اب وہ موٹر ڈرائیور تھا۔ سہارن پور سے دہرہ دون تک۔ دہرہ دون سے سہارنپور تک۔ تین ماہ پہلے اس کو شہباز کی ایک چٹھی ملی تھی۔ لکھا تھا کہ وہ پنجاب آنے والا ہے۔ شاید وہی آیا ہو۔ مارا مارا پھرتا ہوگا۔ کہیں سے پتہ چل گیا ہوگا میرا۔

بچارا شہباز سیدھا سادا سکھ تھا۔ بقول شخصے الٹ پلٹ کر جدھر سے دیکھو سکھ ہی نظر آتا تھا۔ وہ اس کا لنگوٹیا یار تھا۔ لڑکپن میں وہ خوب موٹا تازہ تھا۔ ان کی پہلی ملاقات نہ معلوم کس جگہ ہوئی تھی ..... اس میں تو شبہ نہ تھا کہ وہ..... خدا جانے اس اسکول کا کیا نام تھا..... خیر اس اسکول میں شہباز ہی اس کو لے گیا تھا۔ دونوں دوست تھے۔ دونوں کی صلاح ٹھہری کہ وہ دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھیں چنانچہ اس نے اپنا اسکول چھوڑ دیا اور شہباز کے اسکول میں داخل ہو گیا۔ چھوٹا سا پرائیویٹ اسکول تھا جہاں ہمیشہ لڑکوں کی کمی محسوس کی جاتی تھی۔ اور اسی لئے نئے لڑکوں کی

جستجو بھی۔ طالب علم نہ صرف کتابیں پڑھتے، فیسیں دیتے اور کھانے بلکہ اپنے غریب اسکول کے لئے نئے نئے کمروں کی بھی پیمائش کراتے۔

ایک چھوٹے سے گندے تالاب کے قریب بوسیدہ سی عمارت تھی۔ باہر لوہے کی چادروں کا ایک سائبان اور اس جنگلے کے تار سے بندھا ہوا ریل کی پٹڑی کا ٹکڑا جو گھنٹی کا کام دیتا تھا۔ نہ کوئی روک ٹوک نہ پوچھ پرسی۔

ہیڈ ماسٹر ایک بارعب شخص تھا۔ اگرچہ اکہرے بدن کا آدمی تھا۔ لیکن ٹانگیں خوب پھیلا پھیلا کر چلتا۔ پہلوانوں کی طرح جھوم جھوم کر قدم اٹھاتا۔ اسکول کی چھت سے جب لڑکوں کو وہ آتا دکھائی دیتا تو شور مچ جاتا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب آ گئے۔ اور جب ہیڈ ماسٹر کو اسکول کی عمارت دکھائی دیتی تو وہ مونچھوں کو انگلیوں سے چھونے لگتا... راستے میں لڑکے ہاتھ جوڑ جوڑ کر نمسکار کرتے۔ وہ دونوں ہاتھ خوب اٹھا کے نمسکار کا جواب دیتا۔ کبھی وہ رک جاتا کسی لڑکے کا کان پکڑ کر کہتا کیوں بے چھٹّے! کل آدھی چھٹی کے بعد کہاں چل دیا تھا۔ ایں... چھٹّے اس کی اپنی اختراع تھی۔ نہ معلوم اس کا مطلب کیا تھا۔

اسکول کی دوسری اہم ہستی...... ماسٹر جگل کشور...... ایک آنکھ چھوٹی، گورا چٹا، ہلکا پھلکا، پتلا دبلا، ہونٹ خوب سرخ، دانت اور سفید، کانوں کی بڑیاں ابھری ہوئی۔ وہ کسرت بھی کرتا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ کشتی لڑا کرتا تھا۔ لڑکوں کو خوب پیٹتا.... شہباز نے اسے بتایا کہ دیکھو پہلے پہل یہ سب تماشے کے لئے ہیں۔ کشور تمہیں پیٹنے کا گھبرانا نہیں...... اور وہ بھی بڑا پاپی تھا۔ چھوٹی موٹی مار دھاڑ میں کب آتا تھا۔ اسی قسم کی مشترکہ صفات پر تو ان کی دوستی قائم تھی۔

www.taemeernews.com

پہلے پہل جب وہ جگل کشور کی جماعت میں بیٹھا تو ماسٹر صاحب نے فرمایا کہ دوسرے دن سب لڑکے اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لیے نئی کاپیاں خرید کر لائیں۔ جب دوسرا دن ہوا تو بہت سے لڑکے نئی کاپیاں لے آئے لیکن وہ ان میں شامل تھا جو کاپیاں نہ لائے تھے۔ خیر اس دن جگل کشور نے محض لعنت ملامت کرنے پر اکتفا کیا اردو کی چند سطریں ترجمے کے لیے دیں۔ دوسرے دن شہباز تو جماعت میں ہی نہ آیا باقی سب لڑکے ترجمہ کر لائے تھے سوائے دو کے۔ ان دونوں میں ایک وہ خود تھا۔ ماسٹر صاحب کی آنکھیں مارے غصہ کے خون کبوتر ہو گئیں۔ ماسٹر نے بید منگوایا پہلے تو دوسرے لڑکے کو بید پڑے۔ دونوں ہاتھوں پہ چار چار۔ جب اس لڑکے کے ہاتھ پہ بید پڑتی تو وہ ہاتھ جھٹک کر گھٹنوں میں دبا لیتا۔ منہ سرخ ہو جاتا۔ غرض اس طرح اس نے مار کھائی۔ پھر اس کی اپنی باری آئی۔ ماسٹر صاحب مارنے میں ماہر تو یہ مار کھانے میں ماہر۔ ماسٹر نے بید جو ماری تو اس کا ہاتھ جوں کا توں۔ دوسری مرتبہ پھر اس کا ہاتھ بے حس و حرکت بید لگنے پر اس کا ہاتھ سرخ ہو گیا۔ لیکن ہاتھ کو جنبش نہیں ہوئی۔ چار ضربوں کے بعد ماسٹر نے کہا بڑھاؤ دوسرا ہاتھ۔ اس نے دوسرا ہاتھ اطمینان سے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال رکھا تھا۔ بولا، آپ اسی پہ لگا لیجئے باقی چار...... زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ ماسٹر دم بخود۔ اس نے بید پھینک دی۔ بے شرم!...... پھر اس کو کبھی مار نہیں پڑی۔

دوسرے دن جب شہباز نے اس کے مار کھانے کا معرکہ خیز کارنامہ سنا تو وہ اس کے گلے سے لپٹ گیا۔ محبت کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہو گیا۔

اس کے بعد شہباز کا کارنامہ بھی یاد رہے گا۔ غریب اسکول نے نہ معلوم کیسے پانچ چھ سو روپیہ جمع کر کے سائنس کا سامان خریدا۔ تجویز یہ تھی کہ لڑکوں کو سائنس کی ابتدائی

www.taemeernews.com

تعلیم بھی دی جائے۔ پہلے پہل شہباز اور وہ شیشے کی نلکیاں، پیالیاں، سپرٹ کے چراغ وغیرہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بڑی بے صبری سے ان کو استعمال کرنے کے موقعہ کا انتظار کرنے لگے۔ شروع شروع کے تجربے بھی کھیل تماشے سے کم پُرلطف نہ تھے لیکن جب نئے نئے فارمولے یاد کرنے پڑے اور پھر عملی تجربوں سے ان کو ثابت کرنے کی نوبت آئی تو سب لوگ بہت گھبرائے خصوصاً سردار شہباز سنگھ ... چنانچہ ایک دن علی الصبح دیکھا تو کھڑکی کے شیشے ٹوٹے ہوئے، سلاخیں مڑی ہوئی، سائنس کا کُل سامان غائب ــــ فرش پر جمی ہوئی گرد کی تہ پر پاؤں کے یہ بڑے بڑے نشان سنئے بڑے بڑے پاؤں اسکول بھر میں کس کے ہو سکتے تھے؟ ...... شہباز سے باز پُرس ہوئی وہ صاف مکر گیا۔ پولیس کو اطلاع دی گئی۔ شہباز کو اسکول کے سامنے والے بڑ کے نیچے کوتوال کے ہاتھوں وہ مار پڑی کہ خدا کی پناہ۔ اس کی پگڑی اتر گئی، بال بکھر گئے۔ دو تین دن حوالات میں رکھا گیا، جرح ہوئی، دھمکیاں دی گئیں لیکن وہاں وہی ڈھاک کے تین پات۔ آخر جب ہنگامہ ختم ہوا اور بات آئی گئی ہو چکی تو ایک پُرسکوت شام کو شہباز اس کو اپنے ساتھ شہر سے باہر لے گیا۔ ویرانے میں آپ نے سائنس کا کُل ٹوٹا پھوٹا سا سامان دکھا دیا...... شمبو مسکرانے لگا۔ نوکر روٹی دینے آیا "کیوں سب وہ جو ملنے آئے تھے کیا وہ سکھ تھے؟" معلوم ہوا سکھ نہیں مسلمان تھے۔ "اب یہ مسلمان؟ سچ کہنا:..." "مسلمان کون ہو سکتا تھا۔ وہ کئی اسکولوں میں پڑھ چکا تھا جس جگہ والد صاحب کا تبادلہ ہو جاتا اس کو بھی ہمراہ جانا پڑتا۔ نیا اسکول نئے ساتھی۔ ...... اس نے ذہن پر زور ڈالا... مسلمان، آخر مسلمان کون..... کہیں حنیف نہ ہو۔ ارے حنیف وہ کدھر بھول پڑا۔ ...... برف کے لڈوؤں کا شوقین دبلا پتلا، سر پر بے پھندنے کی ٹوپی، کم گو، سست

www.taemeernews.com

تھا۔ ۔ ۔ ۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ اس جگہ کیسے آیا۔ اس کو پتہ کیسے چلا۔ او حنیف! افسوس کہیں بے چارا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے لئے یہ شہر اجنبی ہے لیکن کیسے ٹیپ ٹپا وہ اب ملے بغیر کیونکہ معلوم ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہائے کاش آج وہ سرکس دیکھنے نہ جاتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب تو سالا تنہا ہو گیا ہوگا۔ کتنی بے تکلفی تھی دونوں میں۔ نہ کھانے میں پرہیز نہ پینے میں ۔ ۔ ۔ ۔ اور تو اور پٹنے میں بھی دونوں ساتھی تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان دنوں وہ اے پی مشن ہائی سکول کا طالب علم تھا۔ اسکول کی عمارت بیچ شہر میں تھی۔ اردگرد تھوڑی سی خالی جگہ بھی چھوڑی ہوئی تھی۔ آدھی چھٹی میں لڑکے وہاں والی بال کھیلا کرتے تھے۔

حنیف یوں تو کم گو لڑکا تھا۔ لیکن جس کسی سے گھل مل جاتا تو پھر اس کی زبان بے لگام ہو جاتی۔ اس کی باتیں اور اس کے پروگرام ختم ہونے میں ہی نہ آتے تھے۔ اسکول کا کام شروع ہونے سے پہلے جب یسوع کے پہاڑی والے وعظ یا لوقا، متی، یوحنا کسی رسول کی کتاب میں سے کچھ پڑھ کر سنایا جاتا۔ کبھی امریکن پرنسپل حضرت داؤد کے گیت پڑھتا۔ اس کے بعد دعا شروع ہوتی۔ "اے خدا! تو جو آسمان پر ہے ۔ ۔ ۔" اس دوران میں حنیف کھسر پھسر کرتے جاتا۔ کلاس میں، آدھی چھٹی میں، گھر میں، بازار میں ان دونوں کا ساتھ تھا۔

ایک ماسٹر رینگ تھے۔ جو لڑکوں کو پیٹنے میں بڑا لطف محسوس کرتے تھے۔ وہ کلاس میں آتے آہستہ کر بجائے کرسی کے میز پہ چڑھ بیٹھتے۔ مارپیٹ کا بہانہ ڈھونڈتے دیر نہ لگتی چنانچہ لڑکوں کی پٹائی شروع ہو جاتی۔ اگر لڑکا بید کھانے کے بعد آہستہ آہستہ سسکیاں بھرتا ہوا روتا تو کہتے آہا! ہا کیسی میٹھی آواز ہے جیسے پہاڑی ندی بہ رہی ہو۔ کبھی لڑکے کی دبی دبی سی چیخ نکل جاتی تو فرماتے یہ لیجئے گاڑی کے انجن نے

www.taemeernews.com

سیٹی دے دی .... تشبیہ و استعارے کے معاملے پر زیادہ غور نہ کرتے تھے ان کو تو کچھ نہ کچھ کہنے کی لت تھی۔ بات بیٹھے یا نہ بیٹھے۔ لیکن اس بات میں شبہ نہیں کہ لڑکوں کے پیٹنے کا اصلی شوق انہیں کو تھا جس دن سب کے سب لڑکے کام کر کے لے آتے کوئی بہانہ پیٹنے کا نہ سوجھتا تو سست پڑ کر رہ جاتے۔

ایک صاحب اور تھے ماسٹر پیٹرک۔ یہ مجھولے قسم کے صاحب تھے۔ نام مسلمانوں سے آدھے تیتر آدھے بٹیر۔ ماسٹر پیٹرک کا رنگ کالا تھا۔ لیکن ان کے دہانے پر اندرونی سرخی جھلک دکھاتی تھی۔ ان کے منہ کا دہانہ بھیڑیئے کے جبڑے کی طرح نظر آتا تھا۔ لڑکوں کو ہر وقت نہیں پیٹتے تھے۔ لیکن اگر اس پر اتر آئیں تو پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ اس قدر مارتے کہ ادھ موا کر کے چھوڑتے۔ وہ نوجوان تھے۔ چاق چوبند۔ سیماب کی طرح بے چین اور کلبلاتے ہوئے۔ لڑکوں کو ڈرل بھی کرواتے تھے۔ آنکھ جھپکتے میں زمین پر ہاتھ ٹکا کے بل ٹو مر چلنے کے انداز میں ..... اور پھر جست سے سیدھے کھڑے ہو جاتے ایسا معلوم ہوتا جیسے ان کے پیر میں سپرنگ لگے ہوئے ہوں۔ میاں نینین ان کی ڈرل سے بہت گھبراتے تھے اور وہ سست لڑکوں کے دشمن۔

لیکن ایک ہستی ایسی بھی تھی جس کو وہ عمر بھر نہ بھلا سکے۔۔۔ ٹرنڈ جینز ۔۔۔ جینز بچارے دائم المریض۔ ان کے کندھے جھکے ہوئے گردن خم کھائی ہوئی پیشانی پر نیلی نیلی ابھری ہوئی رگیں بے نور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ مزاج چڑچڑا۔ ہاتھ میں بالشت بھر کا بید۔ ہنسنے کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ وہ مسکرانے سے کتراتے تھے۔ ان کی مونچھیں نہ لمبی نہ چھوٹی، نہ تنی ہوئی نہ گری ہوئی .... وہ لڑکوں کو مارتے وقت زیادہ تر اپنے پیچھے سے بید سے کچوکے دیتے۔ ایک مرتبہ مارتے تو چار مرتبہ کچوکے دیتے۔ اس کے ساتھ

www.taemeernews.com

ایک ہی سوال کی گردان کرتے "کیوں؟" جناب میرے سر میں درد تھا۔ "کیوں؟" جناب میری بہن نے مجھے سوئی خریدنے کے لئے بازار بھیجا تھا۔ "کیوں؟" جناب میرے خالو آ گئے تھے "کیوں؟" جناب میری دادی اماں کا انتقال ہو گیا تھا..... "کیوں؟"

اُن کی کسی ٹیچر سے دوستی نہ تھی۔ آدھی چھٹی میں وہ شوربہ دار چنوں کے ساتھ ایک آدھ کلچہ کھا کر پانی پی لیا کرتے اور اپنے کمرے میں پڑے اُونگھتے۔

ایک مرتبہ آدھی چھٹی میں حنیف اور وہ بازار میں گھوم رہے تھے۔ دفعتاً مسٹر جیمز سامنے آ گئے۔ یہ دونوں ان کو دیکھ کر اس قدر گھبرا گئے کہ سلام کر دیا۔ مسٹر جیمز نے اشارے سے ان کو بلایا۔ اپنے کمرے میں لیجا کر بید سنبھالتے ہوئے پوچھا یہ سلام کرنے کا وقت؟ حنیف بولا جناب ہم نے سلام ہی تو کیا کوئی بُری بات تو نہیں کی نا!" کیوں؟" انہوں نے بید کے کچوکے دینے شروع کئے۔ صاحب! اس میں تو کچھ بُرائی نہیں" کیوں؟" جناب ہم سے غلطی ہو گئی" کیوں؟" ہم آئندہ ایسا کبھی نہیں کریں گے" کیوں؟" جناب ہم کو کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں توبہ کرتے ہیں" کیوں؟".....

اتنے میں ہوٹل کا منیجر ادھر سے گزرا۔ بشمبر نے کہا منیجر صاحب! آپ نے غضب کر دیا وہ تو میرے پرانے دوست تھے۔ حنیف صاحب بہت دُور سے آئے تھے بیچارے یو۔ پی کے رہنے والے۔

"حنیف تو اسلامی نام ہے وہ مسلمان کہاں تھا۔ وہ تو ہندو تھا ہندو"

"ہندو تھا؟ منیجر صاحب! ہوش کی بات کیجئے۔ آخر یہ کیا مذاق ہے۔ میرا مہمان آیا۔ آپ نے اس کو بٹھایا" کہ۔ نہیں..... دال بھیجئے اور پیاز بھی۔ واہ صاحب واہ!"

"ابھی صاحب! وہ ہندو تھا۔ کس گدھے نے کہدیا کہ وہ مسلمان تھا۔ ہندو تھا۔

www.taemeernews.com

کاشمیری ہوگی۔ گورا چٹا...... کچوری کے سے گال......

کچوری کے سے گال؟ علم میں نیا اضافہ ہوا...... گورا چٹا کچوری کے سے گالوں والا شخص کون ہو سکتا تھا۔ اس کے واقفکاروں میں کسی کا حلیہ ایسا نہ تھا۔ کس قدر غیر ذمہ دار لوگ ہیں یہ ہوٹل والے۔ کوئی ملنے آئے تو اس کا نام تک نہیں پوچھتے۔ آخر کیونکر معلوم ہو کہ وہ کون شخص تھا...... یہ حلیہ...... ایک دھندلی سی صورت حافظہ میں محفوظ تھی۔ گورا چٹا، یہ بڑی بڑی آنکھیں۔ کچوری کے سے گال...... وہ اس حلیہ والے شخص سے ملا ضرور ہے...... نہ معلوم کہاں...... یاد پڑتا ہے...... اب وہ دھندلی صورت واضح ہوتی جا رہی تھی...... لیکن کہاں، کب؟...... یاد آگیا۔ یاد آگیا...... وہ ان دنوں ایک انگریزی اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہ اس کا ہم جماعت تھا۔ کتنی مشکل سے یاد آیا۔ وہ اتنے گہرے دوست نہ تھے لیکن پھر بھی دونوں میں راہ و رسم تھی...... وہاں زندگی دلچسپ تھی۔ دو چار مرتبہ تو وہ اچھے خاصے دوستوں کی طرح مچھلیاں پکڑنے بھی گئے کانٹے پانی میں چھوڑ کر وہ ندی کے کنارے درخت کی چھاؤں تلے بیٹھے لوڈو کھیلا کرتے تھے۔ مچھلی پکڑنا بھی ایک بہت صبر آزما شغلہ ہے...... اب تو اسے اس کا نام بھی یاد نہ رہا تھا۔ ان کی دوستی بتدریج بڑھ رہی تھی لیکن انہیں دنوں اس کے والد کا تبادلہ ہو گیا ورنہ یہ معمولی دوستی ضرور گہری دوستی میں تبدیل ہو جاتی۔

وہ چند سال جو اس نے انگریزی اسکول میں گزارے تھے۔ اس کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ اس قدر پُر لطف دن اس نے نہ پہلے کبھی گزارے تھے اور نہ آئندہ اس بات کی امید ہی تھی۔ اسکول کی ظاہری صورت بھی اور اسکولوں کی طرح نہ تھی۔ بلکہ وہ دو عمارتیں کسی رئیس کی کوٹھیاں معلوم ہوتی تھیں۔ ہلکے صندلی سے رنگ کی دلکش

ہوا دار کمرے تھیں۔ عام طور پر ان کا اسکول یلو ہاؤس Yellow House کہلاتا تھا
ان کوٹھیوں کے ارد گرد وسیع کھلے لان تھے۔ روشوں کے دونوں کناروں پر گلاب کے گھنے پودے
قطار در قطار کھڑے تھے۔ موسم آنے پر یہ پودے بڑے بڑے خوش رنگ کے پھولوں
سے لد جاتے تھے ...... فیسیں بہت زیادہ تھیں صرف امرا کے لڑکے پڑھتے تھے یا اینگلو
انڈین طلبا بھی تھے کسی کلاس میں بھی بیس پچیس سے زیادہ طالب علم نہ تھے۔ برآمدوں
میں کلاسیں لگتیں۔ وہ مختصر سی کلاسیں کس قدر معصوم معلوم ہوتی تھیں۔ کوٹھی کے سرخ
پر خوش پوش لڑکوں کی ایک کلاس۔ ابتدائی جماعتوں کے لئے علیحدہ عمارت تھی۔ جونیر
کلاسیں برآمدوں میں اور سینیر کمروں میں۔ وہاں سب لڑکے خوب سج دھج کر آتے۔
ماسٹروں کو پیٹنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف پرنسپل لڑکوں کو سزا دے سکتا تھا۔ وہ بھی اپنے
دفتر کے کمرے میں۔ بلکہ سزا شاذ و نادر ہی دی جاتی۔ کھیل کود کی طرف بھی کافی توجہ
کی جاتی۔ اس کے علاوہ تراشے بھی کھیلے جاتے تھے ہر ہفتے سینما دیکھنے کی بھی اجازت تھی
ہوسٹل میں ان کی دیکھ بھال کے لئے دو انگریز عورتیں مقرر تھیں۔ ایک بڑی تھی
دوسری چھوٹی۔ وہ سب ان کو میڈم کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ ان کے سب کام میڈم کی نگرانی
میں ہی ہوتے تھے خصوصاً چھٹی والے دن تو میڈم بھی بہت چہکتی پھرتی تھیں۔ لڑکے
بھی میڈم میڈم کی رٹ لگائے ان کے آگے پیچھے گھومتے پھرتے۔ میڈم! کیا یہ
ٹارزن کی فلم ہے؟ میڈم! اس کھیل میں کون کام کرتا ہے۔ میڈم! کیا پکچر میں لڑائی
بھی ہوگی۔ اسی قسم کے بیہودہ سوالات سے میڈم کو پریشان کیا جاتا تھا۔

کیسے کیسے ساتھی تھے وہاں بھی ..... اور وہ بلیک برڈ ...... ہو ہو ...
اس کا اصلی نام [illegible] کہا تھا۔ لیکن سب اس کو بلیک برڈ ہی کہتے تھے۔ جو کچھ جماعت

www.taemeernews.com

ہیں سمجھایا جانا چاہیے تو وہ جلدی سے لکھ لیتا پھر پر مشکل یہ پہنچ کر وہ سب کچھ از سر نو خوشخط لکھتا۔ ٹیچر ہمیشہ اس کی تعریف کیا کرتے تھے ویسے بھی وہ بڑا ذہین طالب علم تھا لیکن جب امتحان نزدیک آتے تو اسکی بھوک پیاس جیسی باتیں۔ بے چارے کو سال بھر کی محنت بیکار ہوتی نظر آتی۔ بھاگ دوڑ کرکے بے چارا دوسروں کی کاپیاں مانگ مانگ کر کچھ نقل کرتا کچھ یاد کر لیتا —۔

وہ ساجد ہو یا دوسرے بھی تھے۔ تین بھائی تھے تینوں لاڈلے اور پڑھنے میں تیز کے مقابلے میں ہر جماعت میں پہلا ایک دو برس فیل ہوتا ان کے باپ یا بڑے کا کھیل تھا پہلے سال فیل ہونے پر ان کے کسی رشتہ دار یا دوست کو رنج یا تعجب نہ ہوتا تھا اور پھر اس کا وہ دوست جو آج اس کا مہمان بن کر آیا تھا اور جس کا نام تک اس کو یاد نہ تھا۔ یہ معلوم کر کے کہ یہاں اس کو ناغہ کرنا پڑ رہا ہے اس کو کس قدر رنج ہوگا۔ ... وہ باغیچہ جہاں گرمیوں کی دوپہر گزارنے کے خیال ہوتے ہوتے وہ کانوں میں جا کر بسنے دہائے تھے گزشتہ کرتے یا پھر امرود کے کسی درخت تلے بیٹھ جاتے۔ اس کے دوست کو تم فریاد کرتا تھا۔ اس کی تعلیم پسند کی مانند۔ وہ لیٹ کر جب ہوتا تو ہر شے کو بیٹا گوداچپا کچھ نہیں کے سے کا وہ دانا دو بیٹھا رہا۔ سے پہلے بیٹھنا تھا ہمیشہ کسی شاخوں سے ٹانگیں چھوڑ کر اس پر گرا پڑتا تھا ... مگر اس کے کاندھے پر رکھ کر وہ بہت اچھا جاتا کوئی بات سننا تو مزیدار ۔ ۔ ۔

اتنے میں ہوٹل کا بادشاہ ادھر سے گزرا۔ منو بھائی بکتے رہتے تو مجھ سے کہا کہ ہو کرو گے کوئی نئے آتے تو اس کا نام پوچھ لیا کرو لیکن تم سے اتنی سی بات بھی نہیں ہو سکتی اب مجھے کیا خاک پتہ چلے کہ وہ کون تھے، جناب کہاں کھلا رہا تھا اس وقت

www.taemeernews.com

ورنہ ضرور پوچھتا.... لیکن وہ واپس آنے کے لئے کہہ گئے تھے بلکہ اب آنے ہی والے ہوں گے۔ میں نے ان سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ بولے ذرا بازار تک گھوم آئیں۔ اسی لئے میں نے نام نہیں پوچھا۔ آئیں گے وہ ضرور...... عورت ذات کا ساتھ...؛

"عورت؟... کیا اُن کے ساتھ عورت بھی تھی؟"

"ہاں جی۔" باورچی نے انگلیاں نچائیں "لڑکی تھی، نوجوان، سانولا رنگ تیکھی ناک اور ناک میں ایک کیل..... آئے تو مجھ سے بولے "کیوں بھائی یہاں کوئی مسٹر بشمبر لعل بھی رہتے ہیں... "ہاں صاحب! رہتے ہیں" پھر وہ کہنے لگے......

"ارے لڑکی کا تو کسی نے ذکر بھی نہیں کیا۔ اُف وہ کمبختوں نے کیسا بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ وہ تو ہمارے گاؤں کے چمن لعل تھے ہم دونوں بچپن کے ساتھی۔ گاؤں میں ہم اکٹھے رہے، اکٹھے پڑھے اس کے ساتھ اس کی بہن بھی تھی میں کئی برس بعد گاؤں گیا تو مجھے وہ میرا لنگوٹیا یار ملا میں نے پوچھا بھئی وہ بیلا کہاں ہے۔ اس کی بہن بھی ہمارے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ وہ بولا تجھے معلوم نہیں اُس کی شادی ہو چکی ہے۔ اب وہ سسرال میں ہے۔ میں نے اس سے کہا بھئی بیلا سے ملنے کو دل چاہتا ہے۔ اس نے جواب دیا اب میں اس کو سسرال سے لاؤں گا تو راستے میں تمہارے پاس ٹھہروں گا۔ دو دن..... لو کتنی سیدھی سی بات تھی۔ تم لوگوں نے تو چکرا دیا مجھ کو۔ گورا چٹا تو نہیں ہے وہ:

"باورچی چکرایا۔ صاحب کس نے کہہ دیا گورا چٹا۔ اچھا خاصہ گندمی رنگ ہے ہاں گال تو پھولے ہوئے ہیں اس کے......"

غضب ہو گیا۔ بشمبر نے چھوٹے نوکر کو آواز دی "تم جانتے ہو نا پچھلی گلی میں

www.taemeernews.com

جو بابو رہتے ہیں، ..... ایسے وہ ہمارے ہاں آیا کرتے ہیں ناجن کے منہ پر چیچک کے ہلکے ہلکے داغ ہیں، ..... تو ان کے ہاں جا کر کہنا کہ شمبھو بابو نے وہ بستر منگوائے ہیں۔ اور دیکھ دوچار پائیاں میرے کمرے میں پہنچا دے..... بھاگا چلا جا۔ سن رہا ہے ... فوراً جا ایسا نہ ہو وہ لوگ سو جائیں، ..... ہاں برتن صاف کر لے لیکن فوراً...

وہ جلدی جلدی روٹی کھانے لگا۔ کمبخت ایک دم سب کچھ نہیں کہہ دیتے کتنی سیدھی سی بات تھی... میں الگ پریشان... میں بھی کہوں کہ آخر کون ہے مجھ سے ملنے والا.....

..... واہ رے چمن لال ..... میرے دوست .... چھوٹے سے تھے۔

جب گھر کی چھت پر زرد رنگ کی کوڑیوں سے دونوں کھیلا کرتے تھے۔ چمن لعل لمبا سا لڑکا تھا۔ میں تھا بچارا کمزور دبلا ڈھالا... اور وہ لیلا..... سانولی سلونی..... ان کے گھر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے جیسے کہ عام طور پر گاؤں کے کچی مکان ہوتے ہیں..... سردیوں کے دن تھے وہ اپنی چھت پر ٹاٹ بچھائے کاغذ کی جھنجھیریاں بنا رہا تھا۔ اس وقت لیلا کٹوری میں ساگ لئے ان کے گھر آئی۔ جب وہ سیڑھیوں سے اترنے لگی تو ان دونوں کی نظریں ملیں۔ وہ بے اعتنائی کے ساتھ نیچے اتر گئی۔ اس کو لیلا کا یہ انداز ذرا نہ بھایا شیخی خوری! جب وہ اوپر آئی تو اس نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ ایک ہاتھ میں روٹی اور ساگ دوسرے میں لسی کا کٹورا لئے تھی۔ چاچی نے بھیجا ہے۔ اس کی ماں کو وہ چاچی کہتی تھی۔ "رکھ دے" اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

روٹی کی رکابی اس کے پاس رکھنے کے بعد وہ اس کے قریب ہی کھڑی

www.taemeernews.com

رہی۔ قدرے سکوت کے بعد وہ بولی کیا بنا رہے ہو؟ اس نے ذرا فخر سے جواب دیا۔ گھمبیری، وہ اس کے پاس ہی آکر دوں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک اس کی انگلیوں کی طرف دیکھتی رہی۔ کیا یہ گھومے گی؟ ہاں بھئی! گھومے گی اور نہیں تو کیا ——— بچاری پر رعب جما دیا۔ اس نے اس نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کو وہ بہت پیاری معلوم ہوئی۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے ایک انگریزی فلم دیکھی تھی جنگل کی شہزادی بیلا جنگل کی شہزادی کی طرح خوبصورت تھی۔ سانولی سی رنگت، ایک وحشی سی آنکھیں...... اور ہیرو نے جنگل کی شہزادی کے کس کس طرح بوسے لیے تھے......

اس کے بعد لیلا کو تکنے کے علاوہ ہر "دل کم" کا ڈھنا تھا۔ اس نے پنسل سے حروف "دل کم" لکھ دیا۔ بلکہ ادھر ادھر کونوں پر پھول بھی بنا دیئے۔ اس دن سے تو لیلا اس کی کنیز بن گئی...... پھر تعلقات بڑھے میاں بیوی بن کر کھیلتے بھی۔ موقعہ پاکر وہ اس کو چوم بھی لیتا...... اس نے لیلا کو ہوائی بوسہ کی ترکیب بھی بتا دی۔ وہ دور سے اپنے ہاتھ کو چوم کر بوسہ ہوا میں اڑا دیتا۔ جواب میں وہ بھی دور کھڑی ہوا میں بوسہ اڑا دیتی...... وہ اس کے لئے کچھ نہ کچھ تحفے بھی لاتا۔ صابن، پین، کلپ...... وہ بہت خوش ہوتی معمولی سی بات پر بھی وہ پھولی نہ سماتی......

ان دنوں وہ معصوم تھے نابالغ تھے۔ اب لیلا نے کیسا جوبن نکالا ہوگا۔ مکمل جوان عورت ہوگی پکے ہوئے پھل کی طرح...... کیا اب بھی وہ...... اب اگر وہ موقعہ پاکر اس کو گلے سے لپٹا لے تو وہ برا مان جائے گی...... اس کو بھی اشتیاق ہوگا ملنے کا اس کی کھاٹ کے قریب چین لعل کی چارپائی اس سے پرے لیلا کی...... وہ اپنے

بستر پر گٹھڑی بنی بیٹھی ہو گی۔

اب وہ اس کے بھائی کے سامنے براہِ راست اس سے تو کچھ نہ کہے گا۔ یہ تو ہو گی بدتمیزی۔۔۔۔۔ ہاں باتیں تو وہ جمیل سے کرے گا۔ لیکن باتوں باتوں میں لیلیٰ کی معصوم شرارتوں کا بھی ذکر چھیڑ دے گا۔۔۔۔۔ تو وہ آنچل میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔۔۔۔۔ اور جب جمیل پیشاب کرنے کی غرض سے یا کسی اور کام سے باہر جائے گا تو حسبِ موقعہ وہ اس کا ہاتھ تھام لے گا۔ گلے سے لپٹا لے گا۔ یا اس کے ہونٹ چوم لے گا۔۔۔۔ اور پھر نہ معلوم۔۔۔۔۔

وہ کھانا تو ضرور کھائیں گے۔ ان کے کھانے کے ساتھ کچھ دیر ہی اور دوستی بڑھے گی۔ لیتے ہیں کھانے کے بعد ٹہلنے کا انتظام ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شاید پچھلی والے کی دوکان ابھی تک کھلی ہو۔ اس نے کھانے کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ تھوڑی دیر میں باہر سے منیجر کی آواز آئی — "آپ آ گئے۔ اچھا ہوا صاحب وہ تو بہت دیر سے منتظر ہو گئے۔ کہنے لگے تم نے آج سے مہمانوں کو ٹھیک یا کیوں نہ۔۔۔۔۔ ہاں ادھر دائیں جانب۔۔۔۔ آ گئے بڑے دیا بیٹھئے۔۔۔۔ بیٹھئے کھانا کھا لیجیے۔۔۔۔

بشیر نے گھوم کر دیکھا ایک مرد اور عورت کے پیچھے ایک نوجوان لڑکی۔۔۔۔ وہ کرسی سے اٹھنے لگا — وہ ان صورتوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا منہ کچھ کہنے کے لئے کھلا۔۔۔۔ تو اس مرد کے لبوں پر ایک مسکراہٹ پیدا ہو کر معدوم ہو گئی۔ ایک لمحہ کے لئے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ وہ چپ چاپ رہا۔ تو اس نے کچھ محجوب ہو کر معذرت چاہی۔۔۔۔ "وہ معاف کیجئے۔۔۔۔ آپ نہیں۔۔۔

www.taemeernews.com

..... بابو بشمبر لعل کمپونڈر .....

منیجر بھی آگیا۔ جناب ہمارے ہاں تو یہی بابو بشمبر لعل رہتے ہیں۔"

نوجوان عورت کی آنکھیں پل بھر کو دکھائی دیں۔ پھر اس نے منہ پھیر لیا۔ نووارد نے پھر معذرت چاہی..... غلطی ہوئی معاف کیجئے گا...... وہ ادھر ہیں بابو بشمبر لعل کمپونڈر..... انہوں نے اسی بازار کا پتہ دیا تھا...... آپ نہیں جانتے ان کو؟"

منیجر، نوکر، اور اجنبی باتیں کرتے ہوئے پرے چلے گئے۔ بشمبر پھر کرسی پہ بیٹھ گیا ... اس نے روٹی کا نوالہ توڑا، بجائے کھانے کے وہ تنہائی میں اس کو اپنی انگلیوں سے ٹھوکریں لگا لگا کر کھیلنے لگا۔

www.taemeernews.com

شہناز

آگے برساتی ندی تھی ایک میل چوڑی ——

کوچوان نے گھبی روک لی۔ گھوڑے تھرتھرائے اور سر گھما گھما کر پیچھے کی طرف دیکھنے لگے۔ کوچوان نے کچھ کہنے سے پہلے جھک کر گھبی کے اندر کی طرف جھانکا مگر دونوں عورتیں سو رہی تھیں ..... ایک کی عمر ہو گی تقریباً پینتالیس برس۔ چہرہ جوانی کے عالم میں اگر خوبصورت نہیں تو بدصورت بھی نہ ہوا ہو گا۔ اب وہ دادی تو نہ معلوم ہوتی لیکن ایک خوش مزاج ماں ضرور نظر آتی تھی۔ اس کے ہمراہ اس کی بوڑھی خادمہ تھی، کہنے کو خادمہ لیکن عورت اس کی گود میں پلی تھی۔

موسلا دھار بارش میں کوچوان کو اپنی جگہ سے اٹھنا پڑا۔ دروازے کے قریب آ کر چلایا "بیگم صاحب ....."

دونوں نیند میں مدہوش ..... بڑھاپے کی نیند!

"بیگم!!"

بڑھیا نے جماہی لی۔

"آگے ندی ہے ..... پانی چڑھا ہوا ہے"

دوسری عورت کی آنکھ بھی کھل گئی۔ کوچوان کے ابروؤں سے پانی کے قطرے

www.taemeernews.com

پہنچ گئے۔

"بیگم ایسے میں پار جانا مشکل ہے۔"

بیگم نے گردن بڑھا کر ندی کا پانی دیکھنا چاہا، لیکن تاریکی میں کچھ دکھائی نہ دیا۔

"پانی اتر رہا ہے۔ دن ہونے تک کافی اتر جائے گا۔"

عورت نے بجلی کی چمک میں گھڑی دیکھی۔ بارہ بجے تھے۔ آخر وہ پناہ کس جگہ لے سکتے تھے؟ "گاڑی موڑ دو۔"

گاڑی گھما لی گئی اور وہ ناہموار سڑک پر ہچکولے کھاتی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ جگہ سنسان تھی۔ شہر کی سول لائنز سے بھی باہر ایک میل تو بھی نظر آ جاتی تھی لیکن سب جان پہچان کس کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ بس پندرہ منٹ گزر گئے ہوں گے دفعتاً جانور ٹھٹک کر جاگے۔ گھوڑے بدکے۔ چابک کھانے پر بھی بجائے آگے بڑھنے کے الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگے۔ ایک دفعہ تو اگلی ٹانگیں اٹھا کر پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو گئے۔ گاڑی سنسنی سی ہو گئی۔ گاڑی ایک جھاڑی باڑ میں گھس گئی۔

"کیا ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

"حضور گھوڑے بدک گئے ہیں آگے نہیں بڑھتے۔"

"ہائے اللہ!" وہ عورت دہشت زدہ ہو کر چیخی۔

گھوڑوں نے پیچھے ہٹ کر زور مارا بگھی باڑ کے اندر ہی گھستی چلی گئی۔ عورتیں گھبرا کر نیچے اتر آئیں۔ گرم گرم کمبلوں میں سے یکلخت بارش میں، "چھتری! چھتری!!"

خادمہ نے چھتری اس کے سر پر تان دی۔

"ہو ہو کون ہے؟" ایک سفید رنگ آدمی نے پھاٹک میں سے ذرا لیٹیں آگے

www.taemeernews.com

کرتے ہوئے گردن بڑھائی .... پھر وہ لٹھ لئے ہوئے آگے بڑھا۔ کون ہو بھائی کیا معاملہ ہے؟"

"کچھ نہیں بھیا گھوڑے بدک گئے ہیں۔ جانا ہے۔"

"ارے بنیا پار جانا تھا۔ ندی میں پانی ہے۔ گھوڑے بگڑے ہوئے ہیں۔ بارش ہو رہی ہے۔" خادمہ نے تائید کی۔

نووارد جو صورت سے دربان معلوم ہوتا تھا پہلے منہ کھولے ان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس کو اصل معاملے کی اہمیت کا احساس ہوا۔

"بھئی اگر کہو تو ہم اندر چلے آئیں گھڑی کی گھڑی بارش تھمے تو چل دیں۔"

دربان اپنا کد و سا سر انکار کے طور پر ہلانے کو ہی تھا کہ خوش پوش عورت نے ملتجیانہ لہجہ میں کہا۔ "بھائی ہم شریف لوگ ہیں۔ کوئی چور چکار نہیں..... اگر تم اجازت دو تو....."

عورت سمجھدار بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس قسم کے اشخاص کی نفسیات کو خوب سمجھتی ہے۔

"سرپ تو آپ بے سک ہیں... پھر نا کیسے کہیں؟" اس نے پھاٹک کھول دیا۔

عورتیں تو کوٹھی کی طرف بڑھیں۔ اور وہ دونوں گھوڑوں کو آگے پیچھے سے ہانکنے لگے۔ بہ ہزار دقت بگھی سائبان کے نیچے پہنچی۔

برآمدے میں بید کی کرسیاں پڑی تھیں عورتیں ٹھنڈے ٹھنڈے گدوں پہ سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئیں۔ دربان نے بجلی کا بٹن دبایا۔ روشنی ہو گئی۔

www.taemeernews.com

عمارت سُرخ رنگ کی تھی۔ دیواروں پر بیلیں اور کائی جمی ہوئی تھی جگہ بہت وسیع تھی ایک اونچی اور گھنی باڑ کوٹھی کا احاطہ کیئے ہوئے تھی۔

دربان ابھی تک متجسس نظروں سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خوش پوش عورت کے کپڑوں احساس کی عورت سے بہت متاثر ہوا۔ عورت کی شکل سے متانت اور شرافت ٹپکتی تھی۔ رنگ سرخی مائل جسم کچھ بھاری سا۔ اس کے بیٹھنے کے انداز اور طرزِ گفتگو میں ایک خاص وقار پایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ دربان کو قطعاً یقین ہو گیا کہ وہ "سرپھا" ہیں ...... اور وہ وہاں سے کھسک گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ نمودار ہوا "آپ لوگ اندر چلیے مالک نے بلایا ہے"

"اندر ......؟" خوش پوش عورت سوچ میں پڑ گئی۔ "کیا اندر عورتیں ہیں؟"

"جی نہیں عورت یہاں ایک بھی نہیں"

"تو پھر ہم اسی جگہ ٹھیک ہیں۔ کوئی حرج نہیں ہم آرام سے ہیں"

"مگر مالک بولتے ہیں آپ لوگوں کو اندر بٹھلایا جائے"

"کون ہیں تمہارے مالک؟"

"........."

"اچھا تو بوڑھے ہیں اکیلے رہتے ہیں؟ کوئی بچہ کوئی عورت وغیرہ کوئی بھی نہیں"

"کوئی بھی نہیں"

عورتوں نے ایک دوسرے کی طرف پُرمعنی نظروں سے دیکھا۔

"بہت سرپھ ہیں ہمارے مالک آپ کی طرح سرپھ"

عورت کو دربان کی اس بات سے دھوکے کی بُو نہیں آئی۔ مگر دونوں عورتیں

www.taemeernews.com

نامعلوم خوف کا احساس کرتی ہوئی اندر جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔

برآمدے میں اوپر کی طرف وسیع سیڑھیاں تھیں۔ دربان ان پر چڑھنے لگا۔
آگے ایک بہت بلند دروازہ تھا۔ دربان نے دروازے کے تختوں کو باری باری کھولا اور
خوش رنگ پردوں کو ہٹا دیا۔

پہلا کمرہ بہت وسیع تھا۔ بڑے بڑے دروازے عام دروازوں کے برابر کھڑکیاں
اونچی چھت، فرش پر دری، قالیچے، کوچ، خوش رنگ بھاری پردے، دیواروں پر
قیمتی تصاویر، عمدہ فرنیچر۔

دربان کی رہنمائی میں وہ آگے بڑھتی گئیں۔ بڑے کمرے کے بعد ایک تنگ لیکن
طویل کمرے میں سے گزرنا پڑا، روشنی بھی مدھم تھی۔ اس کے بعد جو دروازہ کھلا تو
آنکھیں چندھیا گئیں۔

تیسرا کمرہ چھوٹا مگر سجا ہوا تھا۔ سجاوٹ میں بھی سادگی اور عمدہ ذوق نظر آتا تھا
ایک طرف ایک بھاری میز تھی، اس پر کاغذات، کتابیں، انسائیکلو پیڈیا، ڈکشنریاں
وغیرہ بکھری پڑی تھیں۔ الماریوں میں بے شمار کتابیں۔ صاحب خانہ علم و ادب کا شوقین
معلوم ہوتا تھا۔ ایک طرف بڑا تخت جس پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی اور کونوں پر دو گاؤ تکیے
عورتیں کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ دربان رخصت ہو گیا۔

بغل کے دروازے کا پردہ اٹھا۔ ایک پچاس پچپن سال کا بوڑھا تولیے سے
ہاتھ پونچھتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ رسمی علیک سلیک ہوئی۔
"آپ کو ہماری وجہ سے یقیناً بڑی تکلیف ہوئی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ آپ کو

www.taemeernews.com

جگایا جائے۔ نوکر نے ہماری رضامندی کے بغیر آپ کو جگا دیا۔" عورت نے معذرت چاہی۔

"مطلقاً نہیں، میں آجکل چار پانچ گھنٹہ سے زیادہ نہیں سو سکتا۔ یوں سمجھیے میں دس بجے کے قریب سو جاتا ہوں۔ تین بجے سے پہلے یا اس کے لگ بھگ جاگ اٹھتا ہوں..... البتہ اگر آپ آرام کرنا چاہیں تو انتظام ہو سکتا ہے۔"

"شکریہ ہم سوئیں گے نہیں۔" عورت نے اپنے سامان کا خیال کرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ ابھی تک اس کو کھٹکا تھا۔ "پالم پور سے آگے میرے ایک عزیز ہیں انہیں ملنے کے لئے جا رہے تھے۔ ابھی ابھی گاڑی سے اترے تھے، خیال تھا صبح تک پہنچ جائیں گے، راستے میں آپ کی ندی حائل ہو گئی۔"

بوڑھا ہنسا۔ "جی ان برساتی ندیوں کا کچھ اعتبار نہیں..... یہاں سے قریب بائیس میل مغرب کی طرف موتی چور جنگل ہے۔ ایک دفعہ ہم وہاں شکار کھیلنے کیلئے گئے موسم برسات کا تھا۔ واپسی پر ایک برساتی ندی میں سے ہو کر گذرے۔ شام کا وقت تھا، ندی میں پانی معمولی تھا۔ طے پایا کہ رات ندی کے کسی ٹیلے پر بسر کی جائے۔ ایک چٹان پر چڑھ گئے۔ مطلع صاف تھا۔ چھ سات گھنٹے کے بعد آنکھ کھلی تو دیکھتے کیا ہیں کہ ہر طرف پانی ہی پانی..... لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا..... ہم کو تو ڈر محسوس ہوا کہ کہیں پانی چٹان کے اوپر سے ہو کر نہ گذر جائے۔ لیکن بچ گئے..... برساتی ندیاں جلد ہی اتر جاتی ہیں۔ اگر صبح تک پانی نہ اترا تو آپ پل پر سے چلے جائیے گا۔ پانچ چھ میل کا چکر تو ضرور پڑے گا۔"

"آپ کو شکار کا شوق ہے!" عورت نے بات کا رخ بدلا۔

www.taemeernews.com

"شوق؟ شوق تو بہت تھے۔"

خادمہ آتشدان کے پاس جادراز ہوئی آرام کرسی پر۔ کمرہ خوب گرم ہو رہا تھا۔ عورت نے بوڑھے کی طرف غور سے دیکھا۔ میانہ قد، چہرہ پر گہرے نقوش، چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی، زردی مائل سفید بال، لب ولہجہ میں متانت، نشست و برخاست سے مہذب۔ جسم کے ڈھانچہ سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی زمانہ میں اچھا خاصہ مضبوط شخص ہوگا

"میرا خیال ہے آپ کے کپڑے بھیگ گئے ہوں گے۔"

"قطعاً نہیں، ہم گاڑی کے اندر تھے، چھاجوں پانی برس گیا۔ لیکن ہم محفوظ رہے، گاڑی سے اترتے وقت دو چار چھینٹے ممکن ہے پڑ گئے ہوں۔ سو ان کا کچھ مضائقہ نہیں"

بوڑھے نے سرگوشی میں پوچھا "یہ آپ کی والدہ ہیں؟"

"نہیں خادمہ ہیں لیکن میں ان کو اماں ہی کہتی ہوں، جب میں چھوٹی سی تھی اس وقت یہ جوان تھیں۔ میں ان کے ہاتھوں میں ہی بڑی ہوئی۔"

کچھ دیر سکوت رہا۔

"عجب اتفاق کی بات ہے۔ چار برس سے میرے ہاں کوئی شخص بطور مہمان کے نہ آیا تھا۔۔۔۔"

"آپ کا کوئی عزیز نہیں ہے؟"

"نزدیک کی کوئی بھی نہیں۔۔۔۔ دور کی رشتہ داریاں آپ جانتی ہیں۔۔۔۔"

"آپ اس جگہ بالکل تنہا رہتے ہیں؟"

"بالکل"

"آپ علم و ادب کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں!"

"میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میرے شوق محدود نہیں تھے، اب تو میں کمزور ہو چکا ہوں۔ اس لیے دو ہی شوق باقی رہ گئے ہیں جن میں کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ موسیقی سے مجھ کو لگاؤ رہا ہے۔ جوانی میں بانسری اور ستار بجایا کرتا تھا۔ شکار کا مجھ کو خاصہ شوق تھا۔ شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ اگرچہ میں نے شعر کبھی کہے نہیں۔ ادب سے بھی شغف رکھتا ہوں۔ فلسفہ میرا محبوب مضمون ہے۔ مصوری سے مجھ کو عشق ہے۔ میں اپنے واٹر کلر اور آئل کے کام دکھاؤں گا۔ مجھ کو امید ہے کہ آپ پسند فرمائیں گی۔

مثلاً یہ آپ کے سامنے کی تصویر وین گف کی ہے!"

"جی ہاں! تو گویا آپ بھی ان چیزوں سے دلچسپی رکھتی ہیں؟"

عورت مسکرائی، مسکرانے میں اس کی آنکھوں کے گوشوں کی مدھم جھریاں گہری ہو گئیں۔ "ہاں دلچسپی ہی رکھتی ہوں ..... دلچسپی رکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ یوں تو مجھ کو ادب سے بھی ہمیشہ سے لگاؤ رہا ہے۔ لکھا وکھا کبھی نہیں، پڑھنے کا شوق البتہ ہے۔"

"سچ پوچھیے تو میں دل میں سوچ رہا تھا کہ دو بوڑھی عورتیں! خیر آپ اتنی بوڑھی نہیں اور ایک بوڑھا کیونکر وقت گذار سکتے ہیں ———— لیکن یہ معلوم کر کے کہ آپ ادب اور آرٹ سے دلچسپی رکھتی ہیں۔ مجھ کو بے حد خوشی ہوئی ....."

"ذرہ نوازی ہے آپ کی، آرٹ اور ادب تو بڑی چیزیں ہیں۔ میں کس شمار میں ہوں بھلا!"

بوڑھے کے لبوں پر پسندیدگی کی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "وین گف میرا محبوب مصور ہے۔ مجھ کو اس کی شوریدہ سری بہت مرغوب ہے جتنا زور اس کے کاموں

www.taemeernews.com

میں سمجھتے شاید ہی کسی اور کے ہاں ہو۔ یہ سامنے کی تصویر اس کی مشہور تصویروں میں سے ہے۔ آسانی کے لئے ہم اس کو تین حصوں میں تقسیم کئے لیتے ہیں۔ آسمان پہاڑ اور آگے دور کھیت۔ تصویر میں ایک چیز آپ کو غالب نظر آئے گی۔ ایک انتہائی سی بے چینی کی شوریدہ سری سی۔ آسمان کو دیکھئے، بادلوں کے سلسلے کیسے اچھلے پڑتے ہیں کس قدر جاندار معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے حرکت کر رہے ہوں۔ یہی کیفیت پہاڑوں کی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا پتھر گھومتا ہوا سا نظر آتا ہے چٹانیں جیسے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہی ہوں کتنی تیز رفتاری کا احساس ہوتا ہے۔ ادھر میدان میں اُگی ہوئی فصل پر نظر ڈالئے۔ جیسے پودے ہوا کے ایک ہی تند جھونکے کے ساتھ آسمان کی طرف اڑ جائیں گے۔ اور وہ پیڑ جیسے آگ کا چنار اور پتے شعلے معلوم ہوتے ہیں۔ اسکی تصویروں کی اس پریشانی، اس بے چینی، اس حرکت، اس زور کا میں دلدادہ ہوں یہ سب کچھ اس کی ذہنی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کمبخت نے برش نہیں تلوار چلائی ہے۔ جیسے رنگوں کو ایک چکر دے دیا گیا ہو۔ اور جیسے ابد تک وہ گھومتے ہی چلے جائیں گے۔"

عورت نے بوڑھے میزبان کی حرکات اور اس کے لہجہ میں جوانوں کے سے جوش کا احساس کیا۔ اس کو محسوس ہوا کہ کمرے کی شکستہ فضا میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔

"میں سمجھتی ہوں کہ یہ آپ کے جذبات کی بھی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ورنہ آپ اس قدر یگانگت کا احساس نہ کرتے........ آپ خود بھی بڑے جوشیلے ہونگے"

یہ کہہ کر وہ ہنسی اس کی ہنسی کشش سے خالی نہ تھی۔

www.taemeernews.com

بوڑھے نے گھنی بھنوؤں کے نیچے سے اپنی پلکوں کو اٹھایا۔ اس کے چوڑے جبڑے کو حرکت ہوئی، اس کی ٹھوڑی آگے کو بڑھی۔ منہ کھلا پھر وہ منہ سے ایک ہلکی سی چٹاخ کی آواز نکال کر رہ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کو ایک ذہین اور معاملے کی تہہ تک پہنچنے والی عورت سے واسطہ پڑا ہے۔

"بہتر ہو اگر ہم کافی منگالیں..... آپ کافی پسند فرمائیں گی یا چائے"

"جو آپ پسند فرمائیں"

"تو کافی رہے..... بڑی بی تو اونگھنے لگیں"

نوکر کو بلا کر کافی کے لئے کہا گیا۔ مہمان عورت کے دل سے بیگانگی کا احساس دُور ہونے لگا۔

گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے میزبان نے کہنا شروع کیا: "آپ درست سمجھیں میرا جوشِ جسمانی کم تھا ذہنی بہت زیادہ۔ میرا دماغ تو ایک کوہِ آتش فشاں سے کم نہ تھا۔ ایک ایسا درد، ایک ایسی جستجو، ایک ایسی کریدگی رہتی تھی جس کی میں تشریح نہیں کر سکتا تھا۔ میں تنہائی پسند تھا۔ مجھ کو ایک آدھ دوست کی صحبت پسند تھی میرا ایک ہی دوست تھا، مہندر۔ مہندر ان دنوں کیمبرج اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہمارے اسکول کی عمارت بالکل سفید تھی۔ شہر سے دور، ایک چوڑی برساتی ندی کے کنارے پر۔ دور پہاڑ پر بسے ہوئے شہر کی زرد زرد عمارتیں نظر آتی تھیں۔ کالی راتوں کو جب اس پہاڑی شہر پر برقی روشنیاں جگمگاتیں تو یوں معلوم ہوتا جیسے وادی کے سب جگنو روٹھ کر پہاڑ پر جا اکٹھے ہوئے ہوں۔ کبھی کبھی کسی پہاڑ کی برف پوش سربلند چوٹی ایسے دکھائی دیتی جیسے کوئی شہزادی سفید تاج سر پہ رکھے ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر

www.taemeernews.com

ہمیں دیکھ رہی ہو۔ یوں تو پہاڑ بالکل قریب نظر آتے تھے۔ لیکن جوں جوں ہم ان کی طرف بڑھتے وہ پیچھے ہٹتے جاتے۔ ہم کو ان دنوں قدیم یونان و روما کے بہادروں کے قصے پڑھائے جاتے تھے۔ اس لئے ہم پر ایسے مناظر دیکھنے سے ایک رومانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ میں اپنے دوست کے ساتھ ندی پار سیر کرنے جایا کرتا تھا۔ میں عموماً سرخ سویٹر، نیکر اور فل بوٹ پہنا کرتا تھا۔ کسی خنک شام کو راستے میں جینی ہماری ہم جماعت جسے میں پیار سے سائیکی کہا کرتا تھا۔ سفیدے کے درختوں تلے گھومتی اور لیچیاں کھاتی دکھائی دے جاتی تھی ـــــ اسے میرا سرخ رنگ کا سویٹر بہت پسند تھا۔ جینی کو دیکھتے ہی میں اس کے ٹبن جان بوجھ کر کھول دیتا اور اس کے قریب جا کر کہتا اچھی سائیکی! ہمارے ٹبن تو لگا دو ذرا۔ جینی اپنی چمکیلی آنکھیں مٹکا کر ہنستی، اپنے ننھے منھے ہاتھوں سے ٹبن لگا دیتی اور کہتی "تم..... مجھ کو یقین ہے بڑے ہو کر جیسن (Jason) بنو گے" اور میں اکڑتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ جب کبھی کوئی بڑا سا چمگادڑ اپنے پر پھیلائے ہمارے سروں پر سے گذر جاتا تو ہم سوچتے ممکن ہے یہ پری آپس ہی ہو، اب شاید میڈوسا کا سر کاٹ کر لایا جا رہا ہے۔ جنگل کی جھاڑیوں میں گھومتے وقت خیال آتا۔ ممکن ہے اپالو اپنا رتھ چھوڑ کر یہیں کسی جگہ آن بیٹھا ہو، حسن اور موسیقی کا دیوتا، دفنی کا ناکام عاشق، اسے دیکھ پائیں تو شکایت کریں کہ تمہاری داستانِ عشق والا سبق بہت مشکل ہے..... اور وہ آہ سرد بھر کر خاموش ہو جائے ـــــ بھلا اس کے لئے وہ سبق کب آسان تھا۔ ہم چشمے کے قریب بیٹھ جاتے ـــــ ہوا زیادہ خنک ہو جاتی، درخت سائیں سائیں کرنے لگتے، دور چائے کے باغیچوں سے گیدڑوں کی ہوا ہو ہوا ہو کی صدائیں بلند ہوتیں۔ پہاڑوں کی اوٹ سے چاند نکل آتا۔ اور اس کا

www.taemeernews.com

عکس پانی میں دکھائی دینے لگتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سے بھی نارسیس کی طرح پانی میں اپنا چہرہ دیکھنے کا بہت چاؤ تھا۔ مگر یہ شوق تھا بُرا ——— نارسیس بہت ہی حسین لڑکا تھا شفق گوں گال، گہری چمکیلی آنکھیں نیلے سونے کے سے بال۔ اس نے ایک مرتبہ اپنا عکس پانی میں دیکھ لیا، اور اس صورت پہ فریفتہ ہو گیا، وہ بلاناغہ گھنٹوں پانی میں اپنا عکس دیکھا کرتا، آخر یہ جنون رنگ لایا، وہ وہیں مر گیا تڑپ تڑپ کر اور ۔ ۔ ۔ ۔ وہ آسکر وائلڈ کے الفاظ یاد کیجئے: جب نارسیس مر گیا تو وادی کے حسین پھولوں کے دلوں پہ غم و اندوہ کی گھٹائیں چھا گئیں، وہ اس چشمے سے پانی مانگنے لگے تاکہ وہ اس کے ماتم میں آنسو بہا سکیں ——— تو چشمہ نے جواب دیا، اگر میرے پانی کے قطرے آنسو ہی ہوتے تو بھی نارسیس کو رونے کے لئے ناکافی تھے ——— مجھے خود اس سے عشق تھا۔ تم بھلا اس سے محبت کئے بغیر کیونکر رہ سکتے تھے۔ پھولوں نے کہا، اتنا حسین تھا وہ' ——— کیا وہ واقعی حسین تھا؟ چشمہ نے پوچھا۔ اس بات سے تمہاری نسبت اور کون زیادہ آگاہ ہو سکتا ہے، پھول بولے کیونکہ بلاناغہ پیٹ کے بل لیٹ کر وہ تمہاری سطح پہ اپنا عکس دیکھا کرتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر میں اس سے محبت کرتا تھا، چشمہ نے جواب دیا، تو اس کا سبب یہ تھا کہ جب وہ مجھ پہ جھکتا تھا تو اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے ہی حسن کی جھلک نظر آیا کرتی تھی۔

مہمان عورت بڑے انہماک سے میزبان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آتشدان میں آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ بارش کے شور میں بوڑھے میزبان نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا: "وہ وادی گیہ و گل، وہ فرحت انگیز اور عطر بیز ہوائیں، جہاں بہار ایسے آتی تھی جیسے دیوی دبیں دبے پاؤں، تبسم بر لب بھیگی راتوں کو جو پیڑ کی

www.taemeernews.com

خواب گاہ میں جا گھسی تھی، دیکھتے دیکھتے برف پگھل جاتی پہاڑیاں اور ٹیلے مخملی لباس میں کھڑے نظر آتے۔ رنگ برنگ کے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ ان جگہ ہوتے اور ذرّے ذرّے میں حسن و شباب انگڑائیاں لینے لگتا۔ دن کے وقت سورج چمکتا رہتا۔ خاموش راتوں میں چاندنی اپنی آب و تاب دکھاتا۔ کتنا قیامت خیز! کس قدر حسین!! احسن آنکھ جھپکنے میں نیست و نابود ہو جانے والا تھا۔ یہ ایک خاموش فریب ہے۔۔۔۔۔ آہ اب از سر نو پھر جینے کی تمنا دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اس پھر فریب کھانے کو جی چاہتا ہے۔۔۔۔

بات ختم کر لینے کے بعد بھی میزبان کا منہ کھلا رہا۔ جیسے ابھی وہ کچھ کہنے کو ہے لیکن پھر مسکراہٹ سے کر چپ ہو گیا۔ عورت چند لمحوں تک اس کی آواز کی مترنم گونج سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ پھر عورت نے کافی کی پیالی بڑھا دی۔

"شکریہ۔"

"یہ تھا آپ کا بچپن۔"

میزبان خاموش رہا۔ لیکن بشرے سے ظاہر تھا کہ اس نے سوال سنا ہے۔ مگر وہ اثبات میں جواب نہ دینا چاہتا تھا۔ شاید اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی تو اسے بہت کچھ کہنا تھا۔

"کیا بیتے ہوئے زمانے کی حسرت ابھی تک دل میں ہے؟"

میزبان ہنسا۔ "آپ کے سوالات اور میرے جوابات سے ظاہر ہوتا ہے۔ جیسے آپ مجھ سے انٹرویو کرنے آئی ہیں —— آپ میری مہمان ہیں میرا یہ فرض ہے کہ آپ کے دل کے بہلانے کا سامان کروں۔ آپ اپنی زندگی کے حالات اس طرح

www.taemeernews.com

بتانے پر شاید ہی راضی ہوں لیکن آپ تعلیم یافتہ ہیں، یہی سبب ہے کہ ہم اتنے تھوڑے عرصہ میں دو بے تکلف دوستوں کی طرح تبادلہ خیال کر رہے ہیں۔"

"میں واقعی بہت محظوظ ہو رہی ہوں" یہ کہہ کر عورت اپنے مخصوص انداز میں مسکرائی۔ میزبان بھی اس مسکراہٹ سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

کافی پینے کے بعد دونوں آرام کرسیاں گھسیٹ کر آتشدان کے نزدیک ہو بیٹھے۔ بارش کی بوچھاڑ کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔ لکڑیاں چٹخ چٹخ کر جل رہی تھیں۔ کچھ دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

"میرا خیال ہے کہ ہم اصل موضوع سے بھٹک گئے ہیں۔ آپ اپنی بابت کچھ بتا رہے تھے۔"

"جی وہ بات میں ختم کر چکا ——"

"میں آپ کے بچپن کے حالات کو باب التمہید سمجھی تھی۔"

"تمہید؟ ہا ہا ہا —— جی نہیں بہت دنوں بعد گفتگو کا موقع ملا تھا اس لئے آج ہی غبار نکال لیا۔"

"میرے خیال میں ایسے رومانی بچپن کے بعد زندگی کے تلخ حقائق نے آپ کے رومان انگیز نظریۂ حیات کو تو ملیا میٹ کر دیا ہوگا۔"

کچھ سوچنے کے بعد بوڑھے نے جواب دیا۔ "سچ پوچھئے تو زندگی کے وہ حقائق جن کو عام طور پر حقائق سمجھا جاتا ہے، ان سے میں اتنا متاثر نہیں ہوا۔ زندگی میں تنگ دستی بھی ایک تلخ حقیقت ہے۔ مگر مجھ پر اس کا کبھی گہرا اثر نہیں ہوا۔ میں بیکار بھی رہا۔ بھوکا پیاسا بھی رہا، لیکن یہ ایسی فروعی چیزیں تھیں۔ جن سے میں زیادہ اثر

www.taemeernews.com

نہ لیتا تھا۔ ... میں سمجھتا تھا کہ جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق ہے میں جب چاہوں روپیہ کما سکتا ہوں اگرچہ میں اُس شے کا زندگی کی عام ضروریات کے علاوہ حاصل کرنا لازمی نہیں سمجھتا تھا..... اس کا سبب کوئی مہاتما پن نہ تھا بلکہ یوں سمجھئے کہ میری دلچسپی ہی ان باتوں میں نہ تھی۔ لیکن میں نے زندگی کا کچھ حصہ روپیہ کمانے پر بھی صرف کیا۔ ..... کامیابی بھی خاطر خواہ ہوئی۔"

"آخر وہ کیا شے تھی جس کی طرف آپ کا ذہن ایسا منتقل ہوا کہ دوسری باتوں کی سُدھ بُدھ نہ رہی۔"

بوڑھے نے تامل کیا۔ اس کی گھنی بھنوؤں کے درمیان پیشانی پر سلوٹیں نمایاں ہوگئیں۔ "آپ اس قسم کے سوالات کر رہی ہیں جن کے جواب کے لئے میں تیار نہ تھا۔ مختصراً یہ کہ ایک احساسِ تنہائی تھا جس نے میرا ذہن سوچ بچار کی طرف منتقل کر دیا۔ اور یہ احساسِ تنہائی اس لئے نہیں تھا کہ دنیا میں میرا کوئی نہ تھا۔ بلکہ اس لئے کہ میرا جذبۂ محبت اس قدر شدید تھا کہ اس میدان میں میرا کوئی بھی حریف نہ تھا۔ یا یوں سمجھئے کہ میرے خیالات نئے یا دوسروں سے مختلف تھے۔ اسلئے میرا کسی سے سمجھوتہ نہ ہو سکا..... دراصل میں آپ کو سمجھا نہ سکوں گا بس اتنا سمجھ لیجئے کہ میں بالکل تنہا رہا۔ کسی ایسی شے کا منتظر رہا جس کو میں خود نہ جانتا تھا نہ بیان کر سکتا تھا اور نہ اس کو پا ہی سکا، نہ کسی شخص نے مجھ میں ایسی خوبی ہی دیکھی کہ وہ مجھ کو غیر معمولی اہمیت دے....."

"آپ مایوس ہو گئے ہونگے، آپ کو کوئی نہ ملا جسے آپ اپنا بنا سکتے۔"

"میں نے کسی سے نہیں کہا کہ وہ میرا بنے..... اور نہ کسی نے از خود اس بات کی ضرورت ہی محسوس کی۔"

www.taemeernews.com

"زندگی آپ کے لیئے تاریک ہوگئی ہوگی"

"یہ بات نہیں ہوئی۔ میری طبیعت میں ایک ضد یا اجڈ پن تھا جس نے مجھ کو زندہ رکھا۔ درحقیقت میری زندگی میں محبت کی کمی ہی رہی۔ زندگی میں محبت کی کمی رہ جانا ایک پرانی کہانی ہے۔ بہتوں کی زندگی میں ایسا ہو جاتا ہے۔ لیکن میں نے ایک تو بڑی نفرت کے ساتھ تنہا رہنا منظور کیا۔ دوسرے اس کا احساس کم ہو جانے کے باوجود اس کے اثرات کم و بیش موجود ہیں..... سب سے زیادہ مایوس کن پہلو اس امر کا یہ تھا کہ میں نے شکست کا اعتراف کبھی نہ کیا اور نہ کبھی اپنے دکھ کا اظہار ہونے دیا۔ میں اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ کائنات میں میرا وجود یا عدم وجود کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ میری انفرادی زندگی کا مسئلہ بنی نوع انسان کے مسائل میں کچھ بھی اہمیت رکھتے جانے کے قابل ہے۔ یہ تو میرے نجی معاملات ہیں، قطعاً میری ذاتی الجھن جسے آپ کرید کرید کر دریافت کر رہی ہیں۔"

عورت دونوں ہاتھوں پر رخسار ٹکائے کھوئی کھوئی نظروں سے بوڑھے کی طرف دیکھتی رہی۔ "زندگی....."

"ہاں انسانی زندگی کی بابت بھی جو کچھ رائے میں نے قائم کی ہے۔ اس پر میرے ذاتی حالات کا اثر ہے۔ مجھ کو زندگی کے کھوکھلے پن کا سخت احساس ہے۔ میں جانتا ہوں یہ خالص مشرقی خیال ہے لیکن زندہ رہنے کے جواز میں کونسی دلیل ہے جو پیش کی جا سکتی ہے یعنی اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ دراصل زندگی صرف ایک ہی ہے اور کچھ بھی فنا نہیں ہوتا....."

عورت نے تامل کیا۔ "اب بات کا رُخ بدل چکا ہے۔ اور شاید اس سے

www.taemeernews.com

آ گئے ہیں آپ کا سامنا نہ دے سکوں ..... لیکن میں جاننا چاہتی ہوں کہ کیسا آپ خیر و شر پہ یقین رکھتے ہیں؟ کیا آپ انسان کی بہبودی پہ ایمان رکھتے ہیں؟“

”خیر و شر بجائے خود ایسی چیزیں ہیں جن کے لئے دائمی اقدار کا قائم کرنا مشکل ہوگا۔ ”انسان کی بہبود“ ایک بہت ہی مبہم سی بات ہے۔ آخر کہاں زندگی انسان یا انسانیت کی بہبود ...... لیکن اگر ہم کو زندہ رہنا ہی ہے یعنی اگر ہم زندہ رہنے پہ بلا کسی خاص وجہ کے مجبور یا مصر ہی ہیں تو یقیناً ہم کو سوچنا پڑے گا کہ زندہ رہنے کا سب سے بہترین طریقہ کونسا ہو سکتا ہے؟ اگر یہ بات تشریح طلب ہو تو اور وضاحت کردوں؟“

”شکریہ! میں چاہتی ہوں گفتگو ہلکی قسم کی ہو۔ یہ مسائل تو حل ہونے سے رہے کیوں نہ ہم آرٹ کے موضوع پہ ہی گفتگو کریں۔“

بادل خوب گرجنے لگے۔ بجلی تو ایسی کڑکی جیسے کسی جگہ گری ہو۔

”آرٹ کی صلاحیت ـــــ قدرتی طور پر مجھ میں تھی۔ لیکن میں دوسری باتوں سے تنگ آکر اس طرف متوجہ ہوا۔ میں نے آرٹ کو زندگی کے مسائل کے لئے وقف کر دیا۔ اور زندگی کے مسائل کی بابت آپ سن چکی ہیں کہ میرے خیالات کیا ہیں۔ ..... تخلیق کرنے میں یقیناً آرٹسٹ کو کچھ پناہ ملتی ہے۔“

عورت سوچنے لگی کہ بات گھوم گھام کر پھر زندگی کے مشکل ترین مسائل کی دلدل میں پھنس جاتی ہے۔ وہ آتشگیر سے جلتی ہوئی لکڑیوں کو کچوکے دینے لگی۔ بوڑھی خادمہ کی بھی آنکھ کھل گئی۔ اور آگ ایک مرتبہ پھر بھڑک اٹھی۔

”اس عمر میں آپکے احساسات اور بھی شدید ہو گئے ہوں گے۔ آپ کے

www.taemeernews.com

بال بچے کیا ہوئے؟"

بوڑھے نے حیرت سے عورت کی طرف دیکھا۔ "بچے؟ بچے کیسے؟ میں نے شادی ہی کب کی تھی۔ باقی احساسات کے شدید ہونے کی بات بس یہ سمجھ لیجئے کہ یہ دنیا کسی کی رعایت نہیں کرتی۔"

اس کے بعد بہت دیر تک سکوت طاری رہا صرف بارش کی آواز آتی رہی۔ مہمان اور میزبان دونوں کے سر جھک گئے۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئے۔ بوڑھی خادمہ کا چہرہ جذبات سے خالی تھا۔ وہ اُن کی خشک باتوں سے قطعی بے نیاز نظر آتی تھی۔

"کیا کبھی کسی عورت سے آپ کے تعلقات پیدا نہیں ہوئے؟" عورت نے آگ کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

میزبان آتشدان کو گھورتا رہا — تعلقات تو ضرور پیدا ہوئے، ایک دوسرے کے بہت قریب جانے کا موقع بھی ملا۔ لیکن..... لیکن کسی سے بھی مجھ کو یگانگت کا احساس نہ ہوا۔"

"کسی سے بھی نہیں؟"

بوڑھے میزبان نے ہاتھ ملتے ہوئے کچھ تامل کے بعد مہمان کی طرف دیکھا "سوائے ایک کے....."

"ایک؟"

"جی ہاں ایک۔ لیکن میں نے اس کو دیکھا کبھی نہیں۔ بس قُرب کا احساس ہو کر ہی رہ گیا۔ آپ شاید ایک ناکام داستانِ محبت سننے کی توقع رکھتی ہوں لیکن وہ بات نہیں ہے۔"

www.taemeernews.com

عورت پھر ایک مرتبہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائی۔ "وہ کون تھی؟"

"میں زیادہ کچھ نہیں جانتا — اس کا نام تھا....."

عورت آگے کو جھک گئی۔

بوڑھے نے فرش پر نظریں گاڑ کر کہا۔ "اس کا نام تھا شہناز۔"

عورت نے دوپٹے سے سر ڈھانپ لیا اور ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گئی

"مجھ کو اس کی دو چٹھیاں موصول ہوئیں..... اس نے کسی نمائش میں میرے ہاتھ کی بنی تصویریں دیکھیں اور اس کو اس قدر پسند آئیں کہ وہ مجھ کو چٹھی لکھنے پر مجبور ہو گئی۔ امید ہے کہ برا نہیں مانیں گے۔ جواب جلد از جلد دیں وغیرہ۔"

"آپ نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے..... آپ جانتی ہیں عورتوں سے تعلقات بڑھانے کے آداب سے نابلد محض ہوں۔ خیر اس چٹھی کا جواب تو میں نے دے دیا۔ پہلے تو میں نے لکھا کہ شہناز اس کا فرضی نام تھا۔ چاہیئے کہ وہ اپنا اصل نام اور حالات لکھے۔ پھر میں نے اپنی جدید تصویروں پر اس کی رائے طلب کی۔ اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ اس کو میرا پتا کہاں سے ملا۔ آخر میں میں نے لکھا کہ عورتوں سے خط و کتابت کرنے کے آرٹ سے واقف نہیں آپ کسی بات کا برا نہ مانیں۔"

عورت کی دلچسپی بڑھی۔ "اس نے کیا جواب دیا؟"

اس نے جواب بہت عرصہ کے بعد دیا..... یعنی وہی حوا کی پرانی عادت..... اس نے لکھا..... ذرا ٹھہریئے۔ شاید اصل چٹھی ہی یہیں کہیں مل جائے۔"

بوڑھا اٹھا۔ بڑی میز کی دراز میں باہر کھینچ کھینچ کر ٹٹولیں اور ایک قدرے بڑا سا

www.taemeernews.com

بوسیدہ لفافہ اٹھالایا" یہ رہی سنیئے :۔ جواب غیر معمولی تاخیر سے دے رہی ہوں آپ تو انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہوں گے۔ بخار اور کھانسی نے اتنا طول کھینچا کہ خدا کی پناہ۔ نقاہت بے حد ہو گئی ہے۔ آپ کی ناراضی کا خیال نہ ہوتا تو ابھی خط لکھنے کی ہمت نہ ہوتی۔

"آپ میرے متعلق کیا جاننا چاہتے ہیں؟ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ جو سوالات کریں گے ان کا صحیح جواب دوں گی۔ نام تو میرا واقعی شہناز نہیں لیکن آپ مجھے اس کیلئے مجبور نہ کریں۔ تو بہتر ہوگا آپ کے پتے کے متعلق یہ عرض ہے کہ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ . . . .

مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میری جرأت کا بُرا نہیں مانا . . . ." وغیرہ وغیرہ اس کے بعد میری تصویر پر تنقید ہے آخری سطور یہ ہیں۔ میں نے وضاحت سے اپنے خیالات ظاہر کر دیئے ہیں۔ اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں تو عین نوازش ہو گی۔

آپ کے خط کی آخری سطور کے متعلق یہ عرض ہے کہ مجھے آپ کے خط سے بڑی مسرت ہوئی۔ ناگوار کیوں گزرنے لگی کوئی بات۔

"آخر میں غیر معمولی تاخیر کی پھر سے معافی چاہتی ہوں . . . . آپ کے جواب کا بے حد انتظار رہے گا براہِ کرم دیر نہ فرمائیں۔

منتظر "شہناز"

عورت نے آنکھیں جھپکائیں "۔ آپ نے کیا جواب دیا؟"

بوڑھا کچھ دیر تک اس کی طرف بے معنی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "اُن کو اب تک جواب کا بے حد انتظار ہے۔"

www.taemeernews.com

عورت کرسی کے پیچھے کی طرف جھک گئی: "آپ نے ایسا رویہ کیوں اختیار کیا؟"
" ذرا الفاظ پر غور فرمایئے ـــ مثلاً آپ تو انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہونگے
احمق کہیں کی! میری بلا انتظار کرے۔ اس کے بعد اپنی نقاہت اور بیماری کا رونا اور
پھر آپ کی ناراضی کا خوف نہ ہوتا...... "! احمق کو دیکھو بھلا مجھ کو ناراض ہونے کا کیا
حق تھا؟ پھر اپنی ذات کو اتنی اہمیت دے دی کہ شریف زادیوں کی طرح سیدھی بات
نہ لکھ دی کیا نام ہے، کون ہیں، کیا کام کرتی ہیں، کیا شغل ہے بس دور از کار بکواس
بے معنی؟"

عورت نے سفارش کے لہجہ میں کہا: "آخر عورت ذات تھی، ممکن ہے کچھ مصلحت
مدِ نظر ہو؟"

"عورت ذات؟ ممکن ہے وہ کوئی چڑیل ہو، ممکن ہے ایک سرے سے عورت کا
وجود ہی نہ ہو، یونہی کوئی حضرت دل بہلا رہے ہوں ـــ آپ ذرا چٹھی کے الفاظ پر غور فرمایئے"
"ممکن ہے وہ شریف زادی ہو، آپ کی دلدادہ۔ آپ کی دوست ـــ خیر کبھی
اس کی یاد تو آتی ہوگی؟"

بوڑھے نے ماتھے پر تیوریاں ڈالیں: "یاد؟ کبھی نہیں، میں اس کو ہمیشہ کے لئے بھول
گیا، بلکہ نفرت کرنے لگا۔"

اس بات پر عورت گہری سوچ میں ڈوب گئی: "ارے آپ سوچنے کیا لگیں..
....بوڑھا قہقہہ لگاتا ہوا باہر نکل گیا۔

بادل ہلکے ہوگئے۔ بارش قریب ختم گئی۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔
پندرہ بیس منٹ کے وقفہ کے بعد بوڑھا واپس آیا: "اب آپ لوگ ناشتہ کرلیں

www.taemeernews.com

میں نے نوکر کو ناشتہ لانے کے لئے کہہ دیا ہے۔"

مہمان عورت بولی "اب آپ اجازت ہی دیں تو بہتر ہوگا۔"

ناشتہ پر بھی ادھر اُدھر کی مزیدار باتیں ہوتی رہیں۔ نوکر نے آکر پوچھا کہ کوچوان کہتا ہے کہ گاڑی تیار کی جائے؟ عورت نے اثبات میں جواب دیا۔

آیئے اتنے میں آپ کو اپنا سٹوڈیو دکھاؤں۔"

وہ تینوں اسٹوڈیو میں پہنچے۔ ایک وسیع کمرہ تھا۔ اور بے شمار تصویریں ماڈرن اور آئل کلر میں دیواروں پر آویزاں تھیں۔ عورت ان کو دیکھ کر بہت محظوظ ہوئی ایک گھنٹہ اسی طرح گذر گیا۔ پھر بھی دل نہ بھرا۔ جب وہ جانے کو تیار ہوئی تو بوڑھے نے کہا "ذرا ٹھہریے میں کوٹ پہن آؤں پھر نیچے چلیں گے۔"

اس کے چلے جانے کے بعد دونوں عورتیں پھر تصویروں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ایک طرف بوسیدہ سا دروازہ تھا۔ خادمہ نے اس کی چٹخنی کھول دی۔ عورت نے منع بھی کیا۔ لیکن دروازہ کھل جانے پر اندر جھانک لینے میں اس نے کچھ حرج نہ سمجھا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اِدھر اُدھر معمولی سامان بکھرا ہوا تھا۔ کاغذات رنگوں کی پیالیاں پیمانے وغیرہ۔ وہ دروازہ بند کرنے ہی کو تھی کہ کمرے میں ایک طرف کو ایک خوشنما پردہ نظر آیا۔ خادمہ کے ساتھ وہ آگے بڑھی اور پردہ ہٹا دیا۔ پردے کے پیچھے ایک نہایت حسین دوشیزہ کی قدِ آدم تصویر بڑے اہتمام کے ساتھ ایک سنہری چوکھٹے میں جڑی رکھی تھی۔ لڑکی اس قدر حسین تھی کہ عورت دم بخود رہ گئی۔ وہ حیران تھی کہ بوڑھے آرٹسٹ نے یہ تصویر ان کو کیوں نہ دکھائی۔ یہی تو اس کا شاہکار تھا۔ یہ تصویر مکمل کر لینے کے بعد یقیناً بوڑھے نے اور تصویریں بنانا ترک کر دی ہونگی۔ خادمہ تک تصویر کو دیکھ کر حیران

www.taemeernews.com

رہ گئی نیچے چند مدھم حروف نظر آرہے تھے عورت نے آگے بڑھ کر غور سے پڑھنے کی کوشش کی۔ لکھا تھا ایک لفظ "شہناز"

"شہناز" عورت کے ہونٹ لرزے۔ بارش میں بھیگی ہوئی گلاب کی دو تازہ کلیاں چوکھٹے کے آگے رکھی تھیں۔

اتنے میں بوڑھے کی آواز آئی "ہاہاہا۔۔۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں آپ سے صدیوں۔۔۔۔۔" اُس کی آواز بند ہو گئی، وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔۔۔۔۔۔ جلدی سے دروازے کے اندر داخل ہوا اور دیکھا کہ عورت کانپتے ہوئے ہاتھوں سے "شہناز" کی تصویر پر پردہ گرانے کی کوشش میں ہے۔۔۔۔۔۔ بوڑھا اپنا ایک بازو کوٹ کی آستین میں ڈال چکا تھا اور دوسرا بازو۔۔۔۔۔ وہ ہلا بھی نہ سکا۔۔۔۔

عورتیں بگھی میں بیٹھ گئیں۔

مہمان عورت نے دوسری مرتبہ ملتجیانہ لہجہ میں بوڑھے میزبان سے پوچھا۔ "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں ؟"

بوڑھا خاموش رہا۔ وہ سائبان پر چڑھی ہوئی گھنی بیل کے پتوں سے ٹپکنے والے پانی کے قطروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔۔ پھر اس نے کھوکھلی نگاہوں سے عورت کی طرف دیکھا۔ بے کیف آواز میں آہستہ سے بولا "شکریہ!۔۔۔۔" اس کا منہ کھلا رہا نچلا جبڑا ذرا سا آگے کو بڑھا جیسے وہ کچھ کہنے کو ہے۔ مگر پھر وہ سر کو جنبش دے کر خاموش ہو گیا۔

پیٹھ موڑ کر بوڑھا سیڑھیوں پر بھاری قدموں سے چڑھنے لگا۔ اس کے

www.taemeernews.com

سر کے زردی مائل سفید بال چمک رہے تھے۔ وہ ایسے دکھائی دیتا تھا جیسے ایک بہت بڑا ٹوٹا ہوا جہاز جس کے بادبان پھٹ چکے ہوں ...... ان وسیع سیڑھیوں پر چوڑے اور بلند دروازے کے مقابل وہ کس قدر چھوٹا اور حقیر نظر آتا تھا ....

ایک ہلکے سے ہچکولے کے ساتھ بگھی چل پڑی اور گھوڑوں کے سموں تلے بجری اڑنے لگی۔

عورت کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں ..... پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ یک لخت اس نے جھک کر دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا .....

خادمہ اس کے لرزتے ہوئے شانوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

www.taemeernews.com

خوددار

جن دنوں صوبہ بہار میں زلزلہ آیا میں آسام کی ایک غیر معروف ریاست میں بحیثیت ایک انجنیئر ملازم تھا۔ زلزلے کے بعد ریلیف کا کام شروع ہوا تو میں نے بھی ملازمت کے لیئے ہاتھ پاؤں مارے۔ ریاست کا وزیر ایک بارسوخ شخص تھا۔ اس کے ساتھ میرے اچھے مراسم تھے۔ چٹ پٹ مجھے ملازمت مل گئی۔ میرا کام بہت تسلی بخش تھا۔ جلد ہی اگزیکٹو انجنیئر بنا کر موٹی ماری بھیجدیا گیا۔

اس جگہ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ قدرت کی تباہ کاریاں دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ہمارا دفتر میری کوٹھی کے قریب ہی تھا۔ دفتر کی عمارت ابھی زیر تعمیر تھی۔ تین چار کمرے ہمارے تصرف میں تھے۔ سوائے میرے کمرے کے باقی کمروں میں سفیدی بھی نہ ہوئی تھی۔ فرش کی بھدی اینٹوں کو چھپانے کے لیئے دری بچھا دی گئی تھی۔ میرے کمرے میں دو بڑی کھڑکیاں اور دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ بڑے کمرے میں کھلتا تھا۔ یہاں کلرک کام کرتے تھے۔ اس وقت عملہ میں آٹھ کے قریب اشخاص تھے۔ چپڑاسی ان کے علاوہ۔

زلزلے نے جہاں ایک طرف خاندان کے خاندان تباہ اور بدحال کر دیئے تھے۔ وہاں بیکاروں کے لیئے روزی کے دروازے بھی کھول دیئے۔ کئی اشخاص کے لیئے یہ سانحہ دولت و شادمانی کا مژدہ لیکر آیا تھا۔ جب شام کے وقت سب لوگ سیر کے لیئے باہر

www.taemeernews.com

نکلتے تو جگہ جگہ دھرتی ماتا کو نہنگ کی طرح منہ کھولے پاتے۔ بچے حیرت سے ان اتھاہ دراڑوں میں جھانکتے۔

سردیوں کی ایک صبح کو جب میں دفتر میں پہنچا۔ تو رگھوناتھ نے کاغذوں کا بڑا سا پلندہ میرے سامنے رکھ دیا۔ پچھلی شام کو میں دورے سے واپس آیا تھا۔ تین چار دن کے کاغذات جمع ہو گئے تھے ـــــ پہلے رگھوناتھ کاغذات رکھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ لیکن آج وہ ہاتھ سہلاتا ہوا میری میز کے قریب ہی کھڑا رہا۔ یہ سوچکر کہ شاید وہ مجھے کچھ کہنا چاہتا ہے میں نے اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا

پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہے چپڑاسی خبر لایا کہ پنڈت دیوی دیال اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ میں اس چاپلوس شخص سے ملنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن میری حاضری میں وہ کئی مرتبہ میری کوٹھی کے چکر لگا چکا تھا۔ بچوں کے لیے پھل اور مٹھائیاں بھی دے گیا تھا ..... میں نے اس کو بلوالیا۔ اس پر رگھوناتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

دیوی دیال سینما کے پاس لایا تھا۔ وہ شہر کا ایک متمول رئیس تھا۔ اس کے باوجود وہ میری اس قدر زیادہ چاپلوسی کر رہا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ دھکے دے کر باہر نکلوا دوں میری بے اعتنائی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے دور از کار اشاروں سے اپنا مدعا بیان کیا وہ چاہتا تھا کہ میں ٹھیکیداروں سے اس کے بھٹے کی اینٹوں کی سفارش کروں ...

میرا دھیان رگھوناتھ کی طرف تھا۔ رگھوناتھ ہمارے عملے میں سب سے معمر شخص تھا۔ بلکہ دوسرے تو سب کے سب نوجوان تھے۔ دسویں پاس سٹینوگرافر نشست و برخاست میں سلیقہ مند بات چیت میں ہوشیار، لیکن مجھ کو رگھوناتھ پر ہی بھروسا تھا۔ وہ ہمیشہ

www.taemeernews.com

رُک رُک کر دھیمی آواز میں بات کرتا۔ اس کو دیکھ کر انسان کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک ذمہ دار شخص ہے۔ اسی وجہ سے اس کو کام بھی زیادہ کرنا پڑتا تھا۔

نوکری کے لئے وہ براہِ راست مجھ کو ملنے کے لئے آیا تھا۔ دوپہر کے وقت کھانا کھانے کے بعد قیلولے کے لئے پلنگ پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ نوکر نے رگھوناتھ کا ملاقاتی کارڈ لاکر دیا۔ میں نے اس کی بے وقت آمد کو محسوس کیا۔ نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ ملازمت کے لئے آئے ہیں میں نے جواب بھجوا دیا کہ دفتر میں ملیں۔

اتفاق کی بات اسوقت میں ڈریسنگ روم میں ایک کتاب لینے کے لئے گیا۔ سونے سے پہلے کسی رسالے یا کتاب کی ورق گردانی کرنا میری عادت سی ہو گئی تھی۔ کھڑکی میں سے مجھ کو رگھوناتھ واپس جاتا ہوا دکھائی دیا۔ کھدر کا ایک نیل لگا ہوا پائجامہ۔ انگلش ٹویڈ کا ایک پرانا گرم کوٹ سر پہ کالے رنگ کی گول ٹوپی، گھٹنے کے قریب اس کے پائجامے میں ایک ابھار سا پیدا ہو گیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھ کو خیال آیا کہ بچارا بوڑھا شخص ہے۔ اس کو بلا لینا چاہیئے۔ چنانچہ نوکر بھیج کر میں نے اسے بلوا لیا۔

جب میں نے اس کے چہرے پر خصوصاً اس کی نیچے کو لٹکتی ہوئی سفید مونچھوں پر نگاہ ڈالی تو مجھ کو اپنا جواب یاد کر کے افسوس ہوا۔ اس نے آتے ہی بے موقع آمد کے لئے معذرت چاہی اس نے کہا کہ وہ میرا زیادہ وقت خراب نہیں کریگا۔ وہ نوکری کے لئے آیا تھا ٹائپ کرنا جانتا تھا۔ ہر قسم کی کاروباری نیز دفتری خط و کتابت میں اس کو کافی تجربہ حاصل تھا۔

میں نے اس کو شام تک بٹھائے رکھا۔ وہ اسی جگہ کا باشندہ تھا میں اس سے مختلف باتیں پوچھتا رہا۔ اس کے چشم دید واقعات کے حالات بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ باتوں

www.taemeernews.com

باتوں باتوں میں میں نے اس کے ذاتی حالات بھی معلوم کر لیئے۔ پہلے وہ ایک متمول شخص تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ سب سے بڑا بیٹا وٹرنری ڈاکٹری پاس کر کے سرکاری ملازمت کرنے لگا۔ اس کے ملازم ہو جانے پر گھر والوں کو کچھ تسلی ہوئی کیونکہ اس کی کمائی کا بیشتر حصہ انہیں کی تعلیم اور لڑکیوں کی شادیوں پر خرچ ہو چکا تھا۔۔۔۔ لیکن جب بُرے دن آتے ہیں تو آنکھ جھپکتے میں تقدیر کا پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ بھرا پُرا گھر بُری طرح تباہ ہوا۔ لڑکے چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے تھے۔ شادی شدہ لڑکیاں بھی والدین کو ملنے کے لیئے آئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے یہ سازش کر رکھی تھی کہ ان کے گھر کے سب افراد کو یکجا کر کے کچل دیا جائے۔ قدرت کی ستم ظریفی اب گھر میں رگھوناتھ کی نیم پاگل بیوی اس کی بیوہ بہن اس کا تین سالہ پوتا رہ گئے تھے صرف بڑا لڑکا بچا تھا۔ لیکن وہ بھی دق میں مبتلا ہو کر گھر پہنچا۔ باپ نے رہی سہی پونجی اس پر خرچ کر دی لیکن اس کو موت کے چنگل سے نہ بچا سکا۔۔۔۔ اس کی آپ بیتی سن کر دل کو یقین نہ آتا تھا کہ قدرت اس قدر جابر بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت تھی۔

شام کی چائے کے بعد جب وہ رخصت ہونے لگا تو میں نے کہا "رگھوناتھ جی اتنے مصائب جھیلنے کے بعد بھی آپ کی ثابت قدمی اور حوصلہ دیکھ کر میں آپ کی بہت عزت کرنے لگا ہوں"

وہ اپنی چھڑی سے زمین کریدنے لگا "یہ نوازش ہے جناب کی۔۔۔۔" قدرے سکوت کے بعد مجھ سے نظر ملانے سے کتراتے ہوئے بولا "۔۔۔ لیکن میرا حافظہ کمزور ہو گیا ہے کچھ۔۔۔۔ میں بھول جاتا ہوں کتنی باتیں۔۔۔۔"

اس کے چلے جانے کے بعد میں دیر تک اس کی بابت سوچتا رہا۔

www.taemeernews.com

میری سفارش پر وہ دفتر میں ہیڈ کلرک مقرر ہو گیا۔ اس کی موجودگی میرے لیے اطمینان کا باعث تھی مجھ کو تسلی اس بات کی تھی کہ دفتر میں کم از کم ایک ذمہ دار شخص موجود تھا۔ چونکہ میں خود محنتی اور ذمہ دار شخص ہوں اس لئے اس قسم کے اشخاص پا کر ہمیشہ خوشی محسوس کرتا ہوں۔ غیر ذمہ دار کلرکوں کا مجھے بہت تلخ تجربہ تھا۔ کئی بار مجھ کو رگھوناتھ سے مشورہ بھی لینا پڑا۔ بارہا ایسا ہوا کہ ضروری کام پڑنے پر میں اطمینان کے ساتھ دفتر پر چلا جاتا۔ لیکن میری غیر حاضری میں دفتر کے کام میں گڑبڑ نہ ہوتی تھی۔

اپنی میز کے آگے بیٹھے بیٹھے میرا دل رگھوناتھ کی طرف کھنچا رہتا۔ اس کی بعض حرکتوں سے میرا دل بہت متاثر ہوتا۔ مثلاً اس کے کوٹ کا کالر گردن کے قریب پھٹ گیا تھا۔ وہ قمیص کے کالر کو اس پر چڑھا کر اس کو چھپائے رکھتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ فائل لئے میرے کمرے کی طرف بڑھتا۔ پردے کے قریب پہنچ کر ایک دم رک جاتا۔ مجھ کو معلوم ہو جاتا کہ اس وقت وہ کوٹ کے کالر پر قمیص کا کالر چڑھا رہا ہے۔ کبھی کبھی اس کی قمیص کے بوسیدہ کف کوٹ کی بانہہ سے باہر نکل آتے۔ وہ زخم چھپاتے ہوئے کبوتر کی طرح انگلیوں سے کف کو کوٹ کی بانہہ کے اندر کر دیتا۔ ہر چند وہ یہ حرکتیں اس انداز سے کرتا کہ مجھ کو پتہ نہ چلے لیکن میری متجسس نگاہوں سے اس کی کوئی حرکت پوشیدہ نہ رہتی تھی۔

دیوی دیال باتیں کئے جا رہا تھا۔ لیکن میرا دھیان دوسری طرف تھا۔ چنانچہ جس قدر جلد ہو سکا میں نے اس کو ٹالا۔ پھر تھوڑی دیر تک میں رگھوناتھ کا منتظر رہا۔ لیکن وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ دو تین مرتبہ بلا پیس چپراسی سے پانی منگوا کر پیا۔ کھڑکی کے آگے کھڑا ہو کر سگرٹ کے لمبے لمبے کش لیتا رہا۔ تاکہ رگھوناتھ کو معلوم ہو جائے کہ میں

www.taemeernews.com

اتنا مصروف بھی نہیں وہ چاہے تو آکر مجھ سے بات کرلے۔ اس کے بعد میں کچھ دیر کاغذات دیکھتا رہا..... کھانا بھی دفتر میں ہی منگوالیا۔ لیکن وہ نہ آیا۔

شام کو دفتر کا وقت ختم ہو جانے پر عملہ میری روانگی کا منتظر تھا۔ میں نے چپڑاسی کی زبانی کہلوا دیا کہ وہ میرا انتظار نہ کریں۔ کھڑکی میں سے میں ان لوگوں کو ٹولی چھوٹی اینٹوں کے ڈھیروں کے قریب سے ہو کر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اسکول کے لڑکوں کی طرح ایک دوسرے پر لپکتے جھپٹتے چلے جا رہے تھے لیکن ان میں رگھوناتھ شامل نہ تھا۔ چپڑاسی نے بتایا کہ بابو رگھوناتھ ابھی کام کر رہے تھے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کاغذات پر جھک گیا۔

دس پندرہ منٹ بعد رگھوناتھ اندر آیا۔ میں نے قلم ایک طرف رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ "کیا آپ کا کام ختم نہیں ہوا؟ آج آپ نے دوپہر کے وقت آرام بھی نہیں فرمایا..... اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمایئے۔....."

میں جواب میں ہنس پڑا۔ معمول کی نسبت زیادہ بے تکلفانہ انداز میں بولا۔ "آپ بزرگ ہیں۔ خدمت کرنا تو ہمارا فرض ہے..... آپ ابھی تک گھر کیوں نہیں گئے۔ اگر کچھ کام باقی رہ گیا ہو تو کل ہو سکتا ہے۔"

"جی بس اب چلا جاؤں گا..... آپ، کیا آپ ابھی تشریف رکھیں گے؟"

"جی ہاں میں ذرا ایک صاحب کا منتظر ہوں۔"

رگھوناتھ ادھر اُدھر بے معنی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "..... آپ باہر لان میں بیٹھنا پسند کریں گے؟ کہئے تو کرسیاں نکلوا دوں۔"

میں رگھوناتھ کے روبرو زیادہ افسرانہ شان کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا کچھ اس لئے

www.taemeernews.com

اور کچھ اپنی عمر کے تقاضے سے مجبور ہو کر وہ کبھی کبھی مدبرانہ لہجہ میں باتیں کرنے لگتا تھا۔

"نہیں رگھوناتھ جی۔ میں ذرا یہ کاغذات دیکھونگا۔"

قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ تذبذب میں تھا۔ وہ دفتر کی نامکمل عمارت، فرنیچر، ٹھیکیدار دل، ایک حد سے زیادہ رشوت خور اوورسیئر کی باتیں کرتا رہا..... بالآخر اس نے کچھ کہنے کے انداز سے میری طرف دیکھا میں ہمہ تن گوش تھا"...... اچھا..... تو...... اگر آپ اجازت دیں..... میں جا سکتا ہوں۔"

میں مایوس سا ہو گیا "ضرور ضرور......" میں نے ہنس کر جواب دیا۔
اس نے کھانس کر چھڑی اٹھائی۔ ٹوپی کو سر پر درست کرتے ہوئے وہ رک رک کر دروازے کی طرف بڑھا۔

"رگھوناتھ جی!"

"جی" وہ واپس چلا آیا۔ میرے سامنے میز کے قریب کھڑا ہو گیا۔
میں نے سگرٹ کا لمبا کش کھینچ کر اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا "کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں"

وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر وہ یونہی کمرے کے کونے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے لبوں سے ایک مبہم سی آواز نکلی۔

"کہئے نا"

"میں..... میں....." اس نے اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی "مجھ کو.....،"

www.taemeernews.com

وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا "رگھوناتھ جی آپ کرسی پر تشریف رکھئے۔ کوئی حرج نہیں تشریف رکھئے۔"

وہ بیٹھ گیا۔ مجھ کو منتظر پاکر وہ آہستہ سے بولا "میں بہت شرمسار ہوں۔"

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "رگھوناتھ جی! آج تو آپ نے تکلف کی حد کر دی... توبہ" لاٹھی سے فرش کو بجاتے ہوئے وہ بڑی جرأت سے کام لیکر بولا "... مجھ کو ایک روپیہ درکار ہے..."

"ایک روپیہ؟" میں نے حیرت سے نسبتاً بلند آواز میں پوچھا۔

اس نے پھر میری طرف اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ شاید وہ میرے چہرے پہ اپنی بات کا ردِ عمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔

اس نے دھیمی آواز میں کہا "شاید آپ کو یاد ہوگا۔ آپ نے مجھ سے ایک دفعہ ایک روپیہ لیا تھا۔ یہ تین ساڑھے تین مہینہ پہلے کی بات ہے....."

ایک روپیہ؟ —— وہ کب؟ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ میرے چہرے پہ غور و خوض کے آثار دیکھ کر اس نے پھر کہا۔ "اس دن بنک کا چپڑاسی آیا تھا۔ آپ کے پاس دس سے کم کا نوٹ نہیں تھا۔ آپ نے مجھ سے ایک روپیہ لیا۔ آپ نے یہ بھی ہدایت کی تھی کہ اگر آپ کو یاد نہ رہے تو میں آپ کو یاد دلا کر روپیہ واپس لے لوں"۔ وہ پھیکی ہنسی ہنسا۔ اور میں نے جواب میں کہا تھا کہ ایک روپیہ بھی کوئی بڑی رقم تھی جو میں یاد دلاتا پھروں..... سچ پوچھئے تو میں بھول چکا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں۔ میرا حافظہ کمزور ہو چکا ہے..... لیکن کل شام مجھ کو نہ معلوم کس طرح یہ بات یاد آگئی۔ مجھ کو امید ہے کہ آپ بھولے نہیں ہونگے۔"

www.taemeernews.com

ہاں مجھ کو یاد آگیا۔ رگھوناتھ پر مجھ کو بے اعتمادی نہ تھی۔ لیکن افسوس اس امر کا تھا کہ میں روپیہ واپس کرنا بھولا کیوں؟ وہ روپیہ..... لیکن میرا خیال ہے میں نے روپیہ واپس کر دیا تھا اسی دن شام کو یقیناً میں نے واپس کر دیا تھا۔ رگھوناتھ اس جرأت کے لئے معذرت طلب کرتا رہا۔ میں نے چپکے سے اپنی نوٹ بک نکالی۔ اکتوبر کی سات تاریخ کو رگھوناتھ سے ایک روپیہ لیا گیا تھا۔ میں نے یادداشت کے لئے نوٹ بک پر لکھ لیا تھا۔ اور اسی شام کو روپیہ واپس کرنے کے بعد میں نے اس کے آگے انگریزی میں (Paid) لکھ دیا تھا۔

رگھوناتھ کو میں یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں ایسا غیر ذمہ دار اور بے اصول شخص نہیں کہ اس کا روپیہ لیکر بھول جاتا۔ "رگھوناتھ جی میں نے وہ روپیہ....."

"میں پھر دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں۔ باور فرمائیے۔ شرم کے مارے میری نظر نہیں اٹھتی..... ضرورت ہی کچھ ایسی آن پڑی..... ورنہ میں ایک روپیہ کے لئے تقاضا نہ کرتا۔"

میں خاموش ہو گیا۔ رگھوناتھ پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ اس کی نظریں فرش پر گڑی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ مارے ندامت کے زمین میں سما جانا چاہتا ہو۔

"نہیں نہیں رگھوناتھ جی معمولی بات ہے۔" یہ کہہ کر میں مسکرایا اور کرسی پیچھے کی طرف جھک گیا۔ "شرمندہ تو میں ہوں۔ معافی کا طلبگار تو مجھ کو ہونا چاہیئے۔"

شکر گذاری کے آنسو اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگے۔ "آپ سے کیا چھپانا..... کل سے گھر پہ روٹی نہیں پکی..... آٹا ختم ہے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی میری عادت نہیں..... بس یہ تھی اصل بات..... ورنہ ایک روپیہ کی حیثیت ہی کیا۔

www.taemeernews.com

میں ہرگز آپ کو اس کی یاد نہ دلاتا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ کو کتنے روپوں کی ضرورت ہے..... میرا مطلب ہے تنخواہ ملنے پر مجھ کو واپس دے دیجئے گا۔"

اس کے چہرے پر اذیت کے آثار پیدا ہوئے۔ "میں نے آپ کو گھر کی حالت اس لئے بتائی تھی۔ کہ آپ ایک روپیہ کے لئے تقاضہ کرنے پر مجھ کو اوچھا اور نیچ نہ سمجھنے لگیں۔" یہ کہہ کر اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جو میں عمر بھر نہ بھلا سکونگا۔ "میں ایک با اصول اور با عزت شخص ہوں۔ اگرچہ یہ گستاخی ہے کہ آپ مجھ پر عنایت فرمانا چاہیں اور میں انکار کر دوں۔ لیکن چونکہ میں نے آج تک نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا نہ کبھی ایک کوڑی کا قرضدار بننا منظور کیا۔ اس لئے آخری عمر میں اپنے اصول سے گرنا نہیں چاہتا....."

میں نے چپکے سے ایک روپیہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اسے اٹھا کر اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔ پشیمانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے پردہ ہٹا کر لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

---

www.taemeernews.com

کمپوزیشن ٹیچر

پرشوتم نے ایک مرتبہ پھر چونک کر آنکھیں کھول دیں چلچلاتی دھوپ پر نظر نہ ٹھہرتی تھی گھڑی کی ٹک ٹک، جیسے اس کے سر پر ہتھوڑے کی ضربیں لگائی جا رہی ہوں ..... کتنی دیر سے ایسا ہو رہا تھا۔ پہلے تو اس کو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے دماغ میں ان گنت ڈورے یکے بعد دیگرے ٹوٹ رہے ہوں۔ پھر جیسے یکلخت کسی مضبوط کمان کی تانت ٹوٹ جائے۔ اور کمان کے دو سرے سرے پوری قوت کے ساتھ اس کے دماغ کے اندر سیدھے ہو جائیں۔ اس کا دماغ بھنا جاتا۔ کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگتیں۔ نہ جانے کتنی مرتبہ اسی طرح ہوا۔ ابھی ابھی وہ بخار سے اٹھا تھا کھچڑی کھاتا تھا اور روٹی سے پرہیز۔ دماغ میں کونین کی خشکی تھی ..... اس نے کروٹ بدلی۔ اور پیٹ سے لپیٹ کر وہ پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ اس کا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا جی چاہتا تھا کہ کوئی سارے جسم پر مرہم مل کر، روئی لپیٹ دے۔ اس کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ اگر اس کی نیند سورج نکلنے سے پہلے کھل جاتی تو وہ فرحت محسوس کرتا۔ لیکن دھوپ نکل آنے کے سبب اس کے دل کو کس قدر کوفت ہو رہی تھی۔ دن کی روشنی سے آنکھ ملانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اب نیند کیا تھی بس ایک غنودگی

www.taemeernews.com

سی تھی۔ دماغ کمزور، دل میں دھڑکن، جسم تکان زدہ ..... اس نے پھر گنتی شروع کر دی۔ ہزاروں لاکھوں اربوں کھربوں تک ..... اور پھر بوجھ ہی بوجھ، بادل ہی بادل کالے بھدے بے کنار بے شمار ٹھوس سیاہ پہاڑوں کی طرح، بڑھتے ہوئے اچکتے ہوئے، وہ آنکھ کھولنا چاہتا تھا لیکن آنکھ نہیں کھلتی۔ وہ بولنا چاہتا تھا۔ لیکن آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ کروٹ بدلنا چاہتا تھا۔ لیکن جنبش نہ کر سکتا تھا پھر دماغ میں ڈورے ٹوٹتے ہیں آخر کمان کی تانت تڑاق سے ٹوٹ جاتی ہے آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی اڑنے لگتی ہیں۔ وہ پپوٹوں کو جھپکنے لگتا ہے اس نے آنکھیں کھولے رکھیں۔ اگرچہ بستر میں سے نکلنا تکلیف دہ تھا لیکن اس قسم کی نیند اور بھی اذیت رساں تھی وہ اٹھ بیٹھا اور پھر پاؤں لٹکا کر چارپائی پہ بیٹھ گیا۔ اور اپنی لرزتی ہوئی انگلیوں سے، الجھے ہوئے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

آج سے دس ماہ پیشتر تک اس کا بڑا بھائی اس کا کفیل تھا۔ ہر چند وہ اس بات کے اپنے بھائی کا شکر گذار تھا کہ اس نے اسے بی اے تک تعلیم دلوائی۔ لیکن اس کے ساتھ اس کے دل میں یہ بات ہمیشہ کھٹکتی رہی کہ اس کے بھائی نے اپنا احسان جتلانے میں کبھی سنجیدگی سے کام نہیں لیا۔ جب کبھی کتابوں، یا فیس وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو اس کا بھائی فوراً کہتا۔ آجکل تو مٹھیاں بھر بھر روپے دے رہے ہیں۔ دیکھیں اب ہمارے بھیا مٹھیاں بھر کر واپس کب لاتے ہیں۔ امتحان کے قریب وہ بیمار پڑ گیا تھا۔ پرچے اچھے نہ ہوئے تھے۔ اسے خوف تھا کہ وہ فیل نہ ہو جائے۔ لیکن پرماتما کا ہزار ہزار شکر کہ بچارا پاس ہو گیا ورنہ بقول شخصے "بی۔ اے۔ پلکڈ" ہو کر رہ جاتا۔ اور پھر عمر بھر بی۔ اے پاس کرنے کی نوبت ہی آتی بی۔ اے کا نتیجہ نکلنے پر اس کا ان پڑھ بھائی حقہ

www.taemeernews.com

تازہ کرکے، گلی والے دروازے میں اسٹول پر بیٹھ گیا۔ آتے جاتے لوگ مبارک دیتے تو وہ ان کو چارپائی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کرتا۔ اور پھر ان مشکلات کا ذکر کرتا جو عام طور پر بی۔ اے تک پڑھانے میں پیش آسکتی ہیں۔ پھر وہ اپنے نجی حالات کا نقشہ کھینچنا شروع کرتا۔ "پرماتما کا دیا سب کچھ ہے۔ لیکن چودھری! سوچو نا! میں بال بچے دار آدمی۔ اور یہ لڑکیاں ابھی بچیاں ہیں، لیکن تم جانو ان کو بڑھتے کیا دیر لگتی ہے، اور پھر بھائی! برادری میں ملنا جلنا دکھ سکھ۔ بھئی ایشور جانتا ہے۔ ہم سے جو بن پڑا کیا۔ پرشوتم نے ایک کارڈ لکھ دیا شہر سے۔ اتنا روپیہ بھجوا دو، بھیجو۔ منی آرڈر کردو —— چودھری جی! یہاں بھائی موجود تھا نا!...... اب لاکھ لاکھ شکر پرماتما کا ...... پاس ہو گیا بی۔ اے۔ ہم تو سرخرو ہو گئے۔ دیکھیں اب ہمیں یاد بھی رکھتا ہے یا نہیں۔"

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد اس کا گھر میں رہنا دو بھر ہو گیا۔ نوکری کا مطالبہ ہونے لگا چنانچہ وہ پریشانی میں گھر سے نکل آیا۔ لیکن گاؤں سے خط پر خط چلے آتے تھے کہ نوکری ملی یا نہیں۔ اگر ملی تو کیا تنخواہ مقرر ہوئی...... اور ہاں بچوں کا بھی خیال رکھنا۔ پہلے تو وہ ایک ٹھیکیدار کے پاس کلرک ہوا۔ لیکن وہاں اس قدر پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کہ آخر اس کو استعفے دینا پڑا۔ پھر ایک فرم میں نوکری ملی۔ صبح سات بجے سات غروب آفتاب تک کام کرنا۔ تنخواہ چالیس روپے۔ لیکن عمر عزیز کو اس طرح گنوانے کی بجائے اس نے نوکری چھوڑ دی۔ پھر اپنے پرانے دوست کے ہاں دن کاٹنے لگا۔ وہ دوست اس کی قابلیت کا معترف تھا۔ وہ دولتمند تھا۔ اور ایم۔ اے کا طالب علم —— موسم خراب تھا۔ وہ ملیریا میں مبتلا ہو گیا۔ سات آٹھ دن

چار پائی پر پڑے پڑے گذار دیئے۔ بخار اترا ہی تھا کہ اس نے اخبار میں اشتہار دیکھا۔ مقامی ہائی اسکول میں کمپوزیشن ٹیچروں کی ضرورت تھی۔ وہ کمزوری کی وجہ سے جا نہ سکا۔ لیکن اس نے عرضی بھیجدی۔ آج اس کا خیال تھا کہ وہ ہیڈ ماسٹر کو ملے۔

وہ دبلا پتلا، تندوروں کی روٹیوں پہ پلا ہوا زرد رو نوجوان تھا۔ بخار نے رہی سہی صحت بھی برباد کر دی تھی۔ خیر اس نے منہ ہاتھ دھو کر۔ پہلے کا سلا ہوا ایک سوٹ نکالا۔ ٹائی لگائی۔ ہیڈ ماسٹر کے ہاں پہنچ کر اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ ہیڈ ماسٹر نے اندر بلوایا۔ اس نے بتایا کہ بیماری کے سبب حاضر خدمت نہیں ہو سکا۔ اس ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہیڈ ماسٹر نے اسے دوسرے دن اسکول میں بلوایا۔ وہ خوش تھا۔ واپس آیا۔ کپڑے اتار کر آرام سے بستر پہ لیٹ گیا۔ اب اس کو اطمینان تھا۔ وہ دوست کے ہاں بیکار پڑے روٹیاں کھاتے۔ اس کو شرم محسوس ہو رہی تھی۔ کم از کم کچھ تو سہارا ملا۔

دوسرے دن جب وہ دس بجے کے قریب ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں پہنچا۔ تو ہیڈ ماسٹر نے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ہم آپ کو پچاس روپے دے سکیں گے اگر آپ ٹرینڈ ہوتے تو کچھ زیادہ مل سکتا تھا ـــــ یہ دیکھئے ان صاحب کو بھی ہم آپ کے برابر تنخواہ دے رہے ہیں۔ یہ بھی گریجویٹ ہیں"۔ پرشوتم نے تنخواہ منظور کر لی۔ اب چپڑاسی نے کمپوزیشن سٹاف کا کمرہ بتا دیا۔ ہیڈ کلرک کے کمرے کے اوپر یہ کمرہ تھا۔ جب وہ اوپر پہنچا۔ تو شیروانی پہنے سر پہ بڑا سا پگڑ باندھے ایک حضرت کھڑے تھے اس نے قریب جا کر پوچھا "کیوں جناب! آپ ہی مسٹر رام سہائے گوئل ہیں؟"

"جی ہاں"۔ پرشوتم نے کوٹ کی شکن درست کرتے ہوئے کہا "میں آپ کے

www.taemeernews.com

سٹاف میں ابھی ابھی شامل ہوا ہوں۔" کمپوزیشن اسٹاف کے ہیڈ نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بڑی خوشی ہوئی۔ آپ سے مل کر۔" قدرے توقف کے بعد بولے "اچھا آپ تشریف رکھئے۔ میرا ایک پریڈ (Period) ہے۔"

مسٹر گوپال کی صورت دیکھ کر پرشوتم کے دل کو ایک گونا تسکین سی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا۔ کم از کم یہاں سب لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ اگر تنخواہ زیادہ نہیں تو کام بھی زیادہ نہیں ہوگا پھر سب لوگ مہذب طریقے سے گفتگو کرتے ہیں۔ یہاں کام کرنے پر انسان بے عزتی محسوس نہیں کرتا۔ پھر وہ کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ خوب بڑا سا کمرہ تھا۔ ایک بھاری اور لمبی میز کمرے کے درمیان میں رکھی گئی تھی۔ یہ میز پنگ پانگ کھیلنے کی میز کی مانند تھی۔ میز کے چاروں طرف دیوار کے ساتھ لکڑی کی بڑی الماری تھی۔ اس میں کئی خانے تھے۔ جن میں غالباً لڑکوں کی کاپیاں رکھی جاتی تھیں۔ خانوں کے اوپر جماعت اور سیکشن درج تھے۔ کمرہ خوب ہوادار تھا۔ ایک تو دوسری منزل پر تھا۔ اور دوسرے کئی دروازے اور کھڑکیاں بھی تھیں۔ اتنے میں باہر میدان میں سکول کے لڑکوں کی پرارتھنا شروع ہوئی:۔

ہم بالکوں کی اور بھی بھگوان تیرا دھیان ہو۔

چار لڑکے گیت کے بول مترنم آواز میں بولتے۔ ان کے پیچھے سب لڑکے گاتے۔ پرشوتم کو اپنے اسکول کے دن یاد آگئے۔ اور بڑی پرلطف بات یہ تھی کہ وہ اس اسکول میں بھی کچھ عرصہ پڑھ چکا تھا۔ اس کو یہاں کی ہر شے اچھی طرح سے یاد تھی۔ ان دنوں بھی وہ اسی قسم کے گیت گایا کرتے تھے۔ آج وہ اسی اسکول میں ٹیچر بن کر آیا تھا۔ اب لڑکے اس کو نمستے کیا کریں گے۔ اس کو معلوم تھا کہ کمپوزیشن سٹاف

www.taemeernews.com

کو لڑکوں سے براہِ راست واسطہ نہیں پڑتا سوائے ہیڈ کے۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ ایسا ہو۔ کیونکہ اس نے لڑکوں کی نفسیات پر کتابیں پڑھی تھیں اور اس کا خیال تھا کہ وہ لڑکوں کو قابو میں رکھنے ہوئے۔ ان کا بہترین استاد ثابت ہو سکتا تھا۔

پرارتھنا گانے والے پہلے چار لڑکوں کی مجموعی آواز بہت صاف اور دلکش تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اتنے میں اسے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ سبز رنگ کا چار خانوں والا کوٹ پہنے ہوئے، پتلون کی جیب میں ہاتھ ٹھونسے، آنکھوں پر چشمہ لگائے ایک حضرت اندر آئے اور بڑی میز کا سہارا لیکر کھڑے ہو گئے۔ ذرا سے سکوت کے بعد سنجیدہ لہجہ میں بولے "کیوں جناب آپ کمپوزیشن سٹاف میں شامل ہوئے ہیں؟ ـــــــ "جی ہاں"۔ وہ خفیف طور پر مسکرائے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے "خوشی ہوئی آپ سے مل کر"۔ پھر اِدھر اُدھر کے سوالات پوچھتے رہے۔ "میں بھی کمپوزیشن اسٹاف میں ہوں۔ میرا نام گوبند کمار چوپڑا ہے...... دیکھئے نا! مسٹر پرشوتم! اس جگہ کام مشکل نہیں۔ کام نہ صرف تھوڑا ہے بلکہ آسان بھی۔ اس لئے ایک نوجوان کو اپنی ساری قوتیں اس جگہ خرچ نہ کر دینی چاہئیں۔ آپ سمجھے نا! میرا جو مطلب ہے۔ یعنی کہ یہ کام کسی محنتی نوجوان کی شان کے شایاں نہیں۔ یہ عارضی کام ہونا چاہیئے۔ ہمارے سٹاف کے ہیڈ ـــــــ مسٹر گوہل! آپ ملے نہیں ان سے؟ ـــــ جی ہاں بڑے شریف آدمی ہیں یعنی انہیں کی شرافت کی وجہ سے ہم لوگ یہاں پڑے ہوئے ہیں......"

اتنے میں ایک کالا شخص اندر داخل ہوا۔ یوں تو سارے ہندوستانی کالے آدمی ہیں لیکن وہ کالے آدمیوں میں بھی کالا آدمی تھا۔ اس کے دانت ذرا آگے کو نکلے ہوئے

www.taemeernews.com

اور ٹیڑھے میڑھے سے۔ داڑھی مونچھ صفا۔ اس کے باوجود چہرہ اس کے دلی جذبات چھپائے رکھنے میں سو فیصدی کامیاب تھا" یہ ہیں ہمارے ۔۔۔ کیا کہوں میں کو مدکر" کیا میں درست ہوں؟ ...... دیوان جسونت لعل ...... دیوان صاحب! ان سے ملئے۔ یہ ہیں مسٹر پرشوتم داس ...... نو گرفتار ...... میری بے تکلفی معاف فرمائیے گا۔ ہم ...... آخر ہم لوگ اب ساتھی ہیں ......"

کمپوزیشن شاف روم (کمرے) کی فضا کالج کے ہوسٹل کی سی تھی یعنی مکمل آزادی۔ مسٹر گوپل کی موجودگی سے بھی فضا ویسی ہی رہتی لیکن ان کی غیر حاضری میں تو سبھی لڑکوں کی طرح کھل کھیلتے۔ ان میں زیادہ تعداد بھی انہیں لوگوں کی تھی جو ابھی ابھی کالجوں سے نکلے تھے۔ صرف ایک صاحب عمر رسیدہ تھے مسٹر نندہ! ان کو سب ہیڈ ماسٹر صاحب کہتے تھے۔ ان کو کئی طریقوں سے بنایا جاتا۔ سادہ لوح شخص تھے۔ فوراً چھانسے میں آجاتے کبھی کسی مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے بس اب ان کو ہیڈ ماسٹر کا لقب عطا کر دیا گیا۔

مسٹر گوپل کے علاوہ شاف میں چھ اشخاص اور تھے۔ گوبند کمار دیوان صاحب، ہیڈ ماسٹر صاحب، بال کرشن سریواستوا، مسٹر بھاٹیہ اور چھٹا وہ خود۔ سریواستوا ابھی کالج میں پڑھتا تھا۔ ہر وقت لڑکوں کی صحبت میں رہتا تھا۔ چنانچہ اگرچہ وہ شادی شدہ لیکن بڑا چونچال اور کھلنڈرا تھا۔ مسٹر بھاٹیہ ایک عجیب شے تھے۔ آم کی گٹھلی کی طرح ان کا سر تھا۔ بالوں کی حالت بھی عجیب تھی۔ آگے کو گرے ہوئے۔ چھوٹے چھوٹے وہ کئی فنون میں تاک تھے۔ ادب سے بھی لگاؤ تھا۔ علم موسیقی سے بھی کچھ دلچسپی تھی فلسفہ سے بھی

www.taemeernews.com

شغف تھا۔ روحانیت میں بھی دخل تھا۔ یوگ آسن بھی کر لیتے تھے اور فرماتے تھے۔ کہ وہ ایک وقت میں دس سیر پانی پی کر فوراً منہ کے رستہ خارج کر سکتے ہیں۔

دن بھر میں تقریباً تیس چالیس کاپیاں درست کرنی پڑتی تھیں۔ ہر شخص کو علٰحدہ علٰحدہ سیکشن ملے ہوئے تھے۔ کام اگرچہ خشک تھا۔ لیکن اس قدر سخت نہ تھا۔ دوسرے ہنسی مذاق اس قدر زیادہ ہوتی تھی کہ کام کا پتہ نہ چلتا تھا۔ نشست و برخاست کی بھی کچھ پابندی نہ تھی جب چاہو اٹھ کر چل دو۔ لائبریری تک گھوم آؤ یا ٹک شاپ (Tuck Shop) میں جا کر کچھ کھا پی آؤ۔ پوری، گلاب جامن، قلاقند، لسی، چاؤ وغیرہ مل سکتی تھی۔ یوں ٹک شاپ بڑے اہتمام سے تیار کی گئی تھی۔ دروازوں پہ جالی، کھڑکیوں اور روشندانوں پر بھی لوہے کی جالی منڈھی ہوئی لیکن اندر بھنبھناتی مکھیاں بھنکتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے جالی اس لئے نہیں لگائی گئی تھی کہ باہر کی مکھیاں اندر نہ آئیں بلکہ اس لئے کہ اندر کی مکھیاں باہر نہ جاسکیں۔

کبھی کبھی جب مسٹر گوہل کی کلاس ہوتی تو ان کی غیر موجودگی میں کھانے پینے کا سامان کمرے میں ہی منگوا لیا جاتا۔ درحقیقت اک ہنگامے پہ موقوف تھی گھر کی رونق......
ہنسی مذاق میں سب سے بڑھ کر گوبند کمار حصہ لیتے تھے۔ بلکہ انہیں کے دم سے ساری چہل پہل تھی۔ وہ دیل بازی خوب کر لیتے تھے۔ ٹھٹھول بھی ملغانہ ہوتے تھے۔ سب لوگ اس بات کو بخوبی محسوس کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود دیکھے جاتے تھے گوبند کمار کے ساتھ دیوان صاحب کا جوڑ تھا۔ دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک دوسرے پر آوازے بھی کستے تھے۔ وہ دونوں ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی اپنے مذاق کا نشانہ بناتے تھے ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی مسٹر گوبند کمار ہنس کر بولے بھئی ہم تو ہیڈ ماسٹر صاحب

www.taemeernews.com

کی بہت عزت کرتے ہیں۔ دیوان صاحب بولے۔ ارے بھائی تمہارے ہاتھوں کسی کی پگڑی محفوظ نہیں۔ اس بات پر تکرار ہوئی۔ لیکن کم از کم ہیڈ ماسٹر صاحب کو ہم بزرگ سمجھتے ہیں، اور تہ دل سے ان کی عزت کرتے ہیں۔ دیوان صاحب بولے مثلاً کہو نا، کس قسم کا ادب؟ مسٹر گووند کمار بولے مثلاً آپ کچھ ہی سمجھیں۔

دیوان صاحب نے کہا سمجھے کیسے نہیں۔ تم منہ سے کہو۔ دراصل دیوان صاحب اس کے منہ سے کچھ کہلوانا چاہتے تھے۔ چنانچہ گووند کمار نے سب کی طرف شرارت اور شوخی سے دیکھتے ہوئے کہا مثلاً گرڈ بھگوان یعنی میرا مطلب ہے جیسے ہم ہندو گرڈ بھگوان کی عزت کرتے ہیں...... اس بات پر سب لوگ ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔ دراصل ہیڈ ماسٹر صاحب کی صورت بھی اس پرندے سے ملتی جلتی تھی۔ ان کی پتلی سی مڑی ہوئی ناک گرڈ کی چونچ سے مشابہت رکھتی تھی...... ان کی سنجیدگی اور گرڈ کی خاموشی ایک سی چیزیں تھیں...... چنانچہ باوجودیکہ ہیڈ ماسٹر صاحب زود رنج شخص نہ تھے اس بات پر بگڑ گئے۔ گووند کمار کو نصیحت فرمانے لگے کہ بزرگوں کی عزت کا کچھ پاس تو ہونا چاہیئے ——— اس کے بعد دوسرے دن سے یار لوگوں نے مشہور کر دیا کہ مسٹر گووند کمار اپنے کئے پر اس قدر پشیمان ہیں کہ انہوں نے مہاتما گاندھی کی طرح فاقہ کرنا شروع کر دیا ہے...... ان دنوں مسٹر گووند کمار کی صورت بھی کچھ اتری ہوئی سی تھی۔ اب بیچارے ہیڈ ماسٹر صاحب ان کی خوشامد کرنے لگے کہ آپ برت توڑ دیجئے۔ اس وقت خصوصاً بہت لطف آتا جب وہ چپکے سے گلاب جامن منہ میں رکھ کر کہتے...... "نہیں ہیڈ ماسٹر صاحب! جب تک آپ مجھے سچے دل سے معاف نہ کر دیں گے۔ میں برت نہیں توڑوں گا" ——— دیوان صاحب کہتے بھی

www.taemeernews.com

اب توڑ ڈالو برت ..... ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے الفاظ واپس لینے پر تیار ہیں۔ غلطی ہو گئی ان سے ..... انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے کیوں ہیڈ ماسٹر؟" بالآخر ہیڈ ماسٹر نے تسلیم کر لیا کہ غلطی دراصل انہی کی تھی۔ دیوان صاحب نے لقمہ دیا "بھئی گوبند کمار! کیوں اپنا خون خشک کر رہے ہو ..... اب تو ہیڈ ماسٹر صاحب ٹک شاپ میں تم کو کچھ کھلانے کو بھی تیار ہیں" ہیڈ ماسٹر اس بات پر بھی آمادہ ہو گئے اس دوران میں سب آستینوں میں منہ چھپا چھپا کر ہنستے۔ ان کی سادگی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی جیب خالی کرنے کی کوشش نہیں کی گئی

پرشوتم کے پہلے چند دن اچھے گذر گئے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس ہنسی مذاق کے پس پردہ جو بے بسی تھی اس کا احساس ہونے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسکول کے دوسرے ٹیچر کمپوزیشن ٹیچروں سے بات کرنا اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ کبھی کسی کمپوزیشن ٹیچر سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرتے۔ خالی گھنٹوں میں بڑی رعونت سے لان میں کرسیوں پر بیٹھے آپس میں گپ ہانکتے۔ یونہی چلتے پھرتے کبھی مل جائیں تو اس بات کی توقع رکھتے کہ کمپوزیشن ٹیچر ان کو سلام کریں گے۔ ایک دن پرشوتم کے پندار کو سخت دھکا لگا۔ جب اس نے ایک لڑکے کی کاپی پر لکھا "بہت عمدہ۔ اس پر ہیڈ کلاس ٹیچر نے ایک اور لڑکے کے ہاتھ وہ کاپی واپس بھیجدی۔ اور کہلا بھیجا کہ یہ بتائیں کہ اس لڑکے کے مضمون میں کیا خوبی ہے جو اس کے نیچے "بہت عمدہ" لکھ گیا ہے۔ اس پر اسے بہت طیش آیا۔ خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

یہی نہیں بلکہ اسکول والے کمپوزیشن سٹاف کو یونہی سا سمجھتے تھے۔ انہیں طویل

www.taemeernews.com

چھٹیوں کی تنخواہ نہیں دی جاتی تھی۔ اپنے کام کے علاوہ بھی اسکول کا کوئی فالتو کام ہوتا تو وہ کمپوزیشن ٹیچروں کو کرنا پڑتا۔ اگر کسی جماعت کا امتحان ہوتا تو کمپوزیشن ٹیچر کی ڈیوٹی لگادی جاتی کہ وہ لڑکوں کی دیکھ بھال کرے۔ یا شہر کے کسی برانچ اسکول میں اگر کوئی ٹیچر کسی دن غیر حاضر ہوتا تو کمپوزیشن سٹاف میں سے کسی کو بھیج دیا جاتا۔ بچارے کمپوزیشن ٹیچر جوتیاں چٹخاتے جاتے۔ سارا دن ان سے بیگار لی جاتی۔

کمپوزیشن ٹیچروں کی لڑکوں کے دلوں میں بھی کچھ عزت نہ تھی۔ کلاس ٹیچر اپنی جماعت کے لڑکوں کے سامنے کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہہ دیتے جس سے ان لڑکوں کو اپنے کلاس ٹیچروں کی برتری کا احساس ہو اور کمپوزیشن ٹیچر ان کی نظروں سے گر جائیں۔ کمپوزیشن ٹیچر کو کسی دن کی چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ اگر وہ ایک آدھ چھٹی لینے پر مجبور بھی ہو تو اس کی عرضی ہیڈ ماسٹر کے پاس پہنچانا لازمی تھی اس کے باوجود چھٹیوں کے دنوں کی تنخواہ کاٹ لی جاتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد ایک نیا آرڈر جاری کیا گیا۔ اس کی رُو سے کوئی کمپوزیشن ٹیچر اسکول کے وقت میں، اسکول کی حدود سے باہر نہ جاسکتا تھا۔ اس کے محرک بھی کلاس ٹیچر تھے۔ کیونکہ ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ وہ اسکول ٹائم میں اسکول سے باہر نہ جاسکتے تھے اس لئے انہوں نے دباؤ ڈالا کہ کمپوزیشن اسٹاف کی یہ رعایت جبراً روک دی جائے جس دن یہ آرڈر نکلا۔ کمپوزیشن سٹاف میں کافی بے دلی ہوئی۔ لیکن یہ کھچڑی اندر ہی اندر پک کر رہ گئی۔

کلاس ٹیچر کمپوزیشن ٹیچروں کو ذلیل کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ بلکہ اگر کوئی سبب نہ بھی ہو تو وہ پیدا کر لیتے۔ سینکڑوں کاپیوں میں سے ایک

www.taemeernews.com

اُدھر غلطی درست ہونے سے رہ جاتی تو فوراً اتنی سی بات کا پراپیگنڈا شروع کر دیتے اگر زیادہ غلطیاں نکالی جائیں تو اعتراض کرتے کہ اتنی غلطیاں نکالنے سے کیا فائدہ؟ لڑکے نہ اتنی غلطیوں پر غور کرتے ہیں نہ ان کو اس قسم کی درستی سے کچھ فیض ہی پہنچتا ہے اور اگر غلطیاں کم نکالی جائیں تو پھر کہتے صاحب! بڑے سست ہیں۔ یہ کمپوزیشن ٹیچر مفت کی کھاتے ہیں غلطیاں نظر انداز کر جاتے ہیں۔ آخر کاپیاں دیکھنے سے فائدہ ہی کیا۔ اگر غلطیاں جوں کی توں موجود رہنے دی جائیں۔

پرشوتم نے ضرورت کے اشتہار از سرِ نو دیکھنے شروع کر دیئے۔ اس کا دل اس جگہ سے اچاٹ ہو رہا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ ان تعلیم یافتہ لوگوں میں رہ کر وہ خوشی کے دن بسر کرے گا۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ نام نہاد تعلیم یافتہ ان پڑھوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ ان کے ہتھیار زیادہ اوچھے ہیں۔

ایک مرتبہ اس نے ایک کاپی میں بے شمار غلطیاں دیکھیں۔ اس نے مسٹر گوپال سے کہا۔ جناب اس کاپی میں بہت زیادہ غلطیاں ہیں۔ اس کو درست کرنے کے معنی تو یہ ہیں۔ کہ از سرِ نو ایک مضمون لکھ دیا جائے۔ گوپال صاحب بظاہر تو یوں دکھائی دیتے تھے۔ جیسے ان کے منہ میں دانت ہی نہیں ہیں لیکن جب ہنستے تو یہ بڑے بڑے دانت نمایاں ہو جاتے۔ چنانچہ آپ ہنس پڑے۔ "ارے صاحب! کئے جائیے۔ اگر ایسے لڑکے نہ ہوں تو ہم آپ کو کون رہنے دے یہاں پہ۔ انہیں کی تو کمائی کھاتے ہیں" دوسروں نے اور ہاں میں ہاں ملائی۔ پرشوتم کے دل میں یہ بات تراز و ہو کر رہ گئی پیٹ بھرنے کا مسئلہ جس قدر سیدھا سادا تھا ان اشرف المخلوقات کے بچوں نے اسی قدر زیادہ دشوار اور پیچیدہ بنا دیا تھا۔ اس دن وہ دیر تک دل ہی دل میں

www.taemeernews.com

کرتا رہا۔

دسویں جماعت کے سالانہ امتحان قریب آ رہے تھے۔ لڑکوں کے فارم وغیرہ بھیجنے کا کام تھا۔ اس کے لیے سوائے کمپوزیشن ٹیچروں کے اور کون موزوں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انہیں کے سپرد کیا گیا۔ سارا کام معمول کے کام کے علاوہ یہ بیگار بھی انہیں کے حصہ آئی۔ ہیڈ کلرک بھی آن بیٹھتا کچھ باتیں بنا تا کچھ جلی کٹی سناتا۔ اس کی صورت نحوس اور بات چیت ہمیشہ گستاخانہ ہوتی تھی بھائیہ مسٹر گوہل اور پرشوتم ساتھ ساتھ کام کر رہے تھے فارموں کے اندراجات رجسٹر میں نقل کئے جا رہے تھے۔ ہیڈ کلرک باتوں باتوں میں کہنے لگا: "ارے صاحب! اب تو کمپوزیشن ٹیچر مزا کرتے ہیں مزا۔ جب دیکھو ادھر ادھر سیر گشت کرتے پھرتے ہیں۔ جب جی چاہا اسکول آگئے۔ جب دل چاہا گھر کو چل دیئے۔ پہلے ان سے بہت سختی سے کام لیا جاتا تھا۔ ہر کلاس سے خود کاپیاں لاتے تھے۔ اور درستی کے بعد خود کلاسوں میں جا جا کر کاپیاں بانٹتے تھے۔ اور اگر ذرا سی غلطی ہو جاتی تو فوراً جواب طلبی ہوتی۔ ..... اور صاحب اب؟ ......"

جب ہیڈ کلرک اس طرح بک بک رہا تھا پرشوتم کا خون کھولنے لگا۔

ایک دن کمپوزیشن اسٹاف کے ٹیچر اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ اتنے میں چپراسی کاغذ کا پرزہ لے کر آیا۔ مسٹر گوہل چند لمحوں تک اسے دیکھتے رہے پھر چپراسی کے چلے جانے کے بعد آپ نے یکایک دانت نکال دیئے

"کیوں جناب کیا بات تھی؟" نیا آرڈر تھا۔

"ہاں نیا آرڈر ——— آپ کو معلوم ہے کہ دسویں جماعت کے لڑکوں کے امتحانات

www.taemeernews.com

نزدیک آرہے ہیں۔ اس لئے کمزور طلبا کی جماعت شام کو ہوا کرے گی۔ اب چھٹی پانچ کے بجائے ساڑھے چھ بجے ہوا کرے گی۔ آپ لوگوں میں سے ہر ایک کی ڈیوٹی لگا دی جائے گی نوٹ کرلیں۔"

کیوں جناب یہ زائد کام کس سلسلے میں لیا جائیگا۔ کیا ہم کو تنخواہ بھی زیادہ ملے گی۔

نہیں صاحب! تنخواہ وہی پرانی ہو گی۔

تو یہ زائد کام کیوں؟

یہ ہیڈ ماسٹر سے پوچھئے۔

اس پر ہنگامہ پیدا ہوا۔ خوب بحث ہوئی۔ زور شور سے احتجاج کیا گیا لیکن صرف کمرے کے اندر اور اس لہجے میں کہ آواز باہر نہ جائے۔

---

www.taemeernews.com

جنگل میں منگل

موسم سرما کی صبح سویرج طلوع ہو چکا تھا لیکن ابھی کہرے میں چھپا ہوا تھا
وہ کس قدر خوش تھی۔ زندگی میں ایسے مواقع کم ہی آتے ہیں۔ یوں تو ہفتہ بھر سے
گھر میں مہمانوں کا جمگھٹا تھا۔ خوب چہل پہل تھی۔ لیکن کل شام کیپٹن جاوید کی آمد تو گویا سونے
پر سہاگے کا کام کر گئی۔

پہلے پہل جب اس نے سنا کہ اس کے چچا زاد بھائی سے اس کی بات پکی
ہو رہی ہے اس وقت نہ تو وہ خوش تھی اور نہ مایوس۔ آخر شادی تو کسی نہ کسی سے ہونی
ہی تھی۔ جاوید کے ساتھ وہ بچپن میں کھیلتی رہی تھی۔ کیا بلحاظ صورت کیا بلحاظ عادات وہ
ایک معمولی لڑکا تھا۔ لیکن اب کمیشن لیکر وہ لفٹننٹ بنا تو اس نے اپنا فوٹو بھیجا۔ اف!
چار برس کے قلیل عرصہ میں وہ کس قدر بدل گیا تھا۔ اب تو وہ اچھا خاصہ حسین نظر آتا تھا۔
جسم بھی بھر گیا تھا۔ کاندھے چوڑے۔ سینہ ابھرا ہوا۔ گردن خوب اکڑی ہوئی۔ فوٹو میں وہ
سنجیدہ اور متین شخص نظر نہ آتا تھا بلکہ اچھا خاصہ اکڑ کر کھڑا ہوا تھا۔ یہ خواہ مخواہ کی اینٹھ
ذوقِ سلیم پر گراں ضرور گذرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود فوٹو دیکھتے ہی وہ اس کی تسبیح
پڑھنے لگی۔ کل شام جب جاوید کیپٹن بن کر چھٹیوں کے چند دن گذارنے کے لئے ان کے

www.taemeernews.com

یہاں پہنچا تو وہ اس کو ڈرائنگ ہال کی کھڑکی میں سے دیکھتی رہی تھی۔ موٹر پورچ میں آکر رکا۔ اندر سے کیپٹن جاوید ہاتھ میں بید لئے برآمد ہوئے۔ آنکھوں پر ہلکے سیاہ رنگ کا چشمہ بغل میں ٹوپی۔ پاؤں میں چرمر چرمر بولنے والے بوٹ۔ ٹھاٹھ سا ٹھاٹھ تھا...... آتے ہی "شمی!"
— سب دم بخود۔ کیپٹن صاحب کے سامنے کون دم مار سکتا تھا۔

بعد میں ماں نے ہدایت کر دی بیٹی! زیادہ نخرے کرنے کی ضرورت نہیں۔ انگریز لوگوں میں رہتا ہے یوں چھوٹی موٹی سی بنی رہو گی تو برا مان جائے گا... اور بھی! بڑا آدمی ہے اب موم کی ناک کی طرح جدھر گھماؤ گھوم جاؤ۔ قیاس سے معلوم ہوتا ہے تمہاری ہی جانچ پڑتال کرنے آیا ہے۔

بی کے دماغ کی جھینکا ٹوٹا..... کیپٹن جاوید بات بات میں "بھئی شمی" کا استعمال فرماتے ہیں اور "بی شمی" بے چون و چرا حکم بجا لاتی ہے۔ باتوں کا مسکرا کر جواب دیتی ہے تولیہ بڑھاتی ہے سو نہ سکے تو رستے تک چھوڑ آتی ہے۔ اپنے ہابی (مشغلے) بتاتی ہے اوہ وہ کس قدر خوش تھی!!

وہ باورچی خانے میں کھڑی گھر والوں کی باتوں کی آوازیں سن رہی تھی۔
آج بھی جلدی سے اٹھ بیٹھے تھے پکنک پر جانے کا پروگرام تھا۔ تین چار میل پر گندھک کے پانی کا چشمہ تھا۔ بڑی پرفضا جگہ تھی ایک اونچا آبشار قریب ہی ایک شوریدہ سر نالہ۔ وہاں کئی لوگ جایا کرتے تھے بعض تفریح کے لئے بعض علاج کی غرض سے رستہ بھی پہاڑی تھا۔ ایک پتلی سی پگڈنڈی تھی پہاڑی نالوں ڈھلوانوں کھڈوں اور کھیتوں میں سے ہو کر جاتی تھی۔ تو یہ سب بھاگے..... بعد میں کیپٹن جاوید کے ساتھ پکنک کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔

www.taemeernews.com

شمی کے لبوں سے مسکراہٹ پھوٹی پڑتی تھی۔ اس نے توے پر گھی ڈال کر پراٹھا الٹا دیا۔ ابھی نوکر سو کر بھی نہ اٹھے تھے۔ بیچارا پہاڑی لڑکا برآمدے میں پڑا تھا اس کو جگایا۔ دونوں نے مل کر سب مہمانوں کو چائے پلا دی۔ رات بھی دیر تک باتیں ہوتی رہی تھیں۔ صبح مرغ نے بانگ بھی نہ دی تھی کہ چچا رفیع یونہی باہر نکلے، شمی کی ماں کے کھانسنے کی آوازیں سن کر ادھر چلے آئے۔ اماں نے شمی کو بھی جگا دیا۔ اس کے بعد اس کی بوا، دادی اماں، پھوپھا ڈاکٹر منظور، ایک دور کے رشتہ دار حامد ریٹائرڈ ڈپٹی سی۔ ایس۔۔۔ ۔۔۔۔ غرض بچوں سمیت سبھی جاگ اٹھے۔ البتہ کیپٹن عابد اپنے کمرے میں پڑے سوتے رہے۔۔۔۔ بجلی کی روشنی میں سب لوگ رضائیاں لپیٹے، بستروں میں ہی گھس کر بیٹھ گئے بات شروع ہوتی تھی، شمی کے مرحوم ابا کے اوصاف سے۔۔۔۔ پھر بات جو چلی، تو کچھ بے پر کی اڑنے لگی۔ لطیفے، یہ لطیفہ، قہقہے پہ قہقہہ۔ چچا رفیع تو بڑی بے تکلفی سے ہنسی ہنستے تھے انکی عام بات چیت بھی بلند آواز میں ہوتی تھی۔ پولیس انسپکٹر رہ چکے تھے۔ رعب جم گیا بل نہ گئے۔ آواز میں رعب اور رعونت سے دبدبہ ٹپکتا تھا۔ ویسی روانی مونچھوں سے مردانہ بھاری ٹھوڑی، ایک دوسرے سے جڑے ہوئے مضبوط اور خوبصورت دانت۔ چھپی چھپی بھنویں، باتیں کرتے تو دور سے سننے والے کو یوں معلوم ہوتا جیسے جھگڑ رہے ہوں قہقہہ لگاتے تو اس زور سے کہ کھڑکیوں کے شیشے لرز اٹھیں۔ اس کے برعکس ڈاکٹر گویا ان کی ضد تھے۔ بولیں نہ بولیں تو ان کی بلا سے، کچھ دب سے جاتے۔ کسی قسم کا رعب داب خاک بھی نہ تھا۔ ان کو کبھی کوئی لطیفہ نہ سوجھتا تھا۔ دوسروں کے چٹکلے ہوئے فقرے یا بذلوں کو بالکل نہ سمجھتے تھے۔ سب کو ہنستے دیکھ کر ہنس پڑتے تھے۔ لیکن اس انداز سے جیسے معذرت کر رہے ہوں۔ دھیمے دھیمے رک رک کر جیسے کہہ رہے ہوں کیوں ہنسانے

www.taemeernews.com

ہو تجھ کو۔ مجھے ہنسی آتی تو ہے نہیں۔ ہنسنے کی بات ہی کیا ہے آخر۔ لیکن حامد صاحب بڑا اشستہ مذاق رکھتے تھے۔ کم گو تھے۔ لیکن نکتہ رس اور رمز شناس۔

پراٹھے پر پراٹھا پک رہا تھا۔ سب ایک ایک پیالہ چا۔ پی چکے تھے۔ بچارے جاوید رہ گئے۔ وہ پڑے سوئے رہے ورنہ ان کو بھی چا مل جاتی۔ اب تو شاید جاگ اٹھے ہوں۔ باتوں کی آواز سن کر ممکن ہے اماں کے کمرے میں جائیں اور اس کو وہاں نہ پاکر......

"بھئی شمی!"

شمی نے آنچل سنبھالا۔

"آپ یہاں ہیں؟ کب سے ڈھونڈھ رہا ہوں --- کیا ہو رہا ہے یہ؟"

"جی پراٹھے ہیں قیمے والے....." وہ زمین کی طرف دیکھنے لگی۔

"پراٹھے؟ او--پکنک کی تیاریاں ہیں..... نوکر کیا ہوئے۔ آپ کیوں پکا رہی ہیں۔ میں کچھ مدد کر سکتا ہوں آپ کی؟"

"شمی کے سر سے آنچل کھسکا جا رہا تھا... بمشکل بولی "پک جانے دیجئے۔ پھر ضرورت ہوگی آپ کی۔" گال سرخ ہو گئے۔

"ہو ہو ہو" جاوید نے قہقہہ لگایا۔ اس کے کانوں کے اوٹی پھندنے ملنے لگے "ہمیں ایک پیالہ چا دیجئے تا!"

چا کا پیالہ ہاتھ میں لیکر وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹوں میں اسے پینے لگا۔ "تو بھئی کیا پراٹھے ہی رہیں گے یا کچھ اور نہ ہوگا کھانے کو لئے؟"

"فہرست تو کافی بڑی تھی......"

www.taemeernews.com

"مثلاً؟"

"پھل، مربے، پیسٹری، مٹھائی، مچھلی ......"

"مچھلی!..... کیوں نہ وہاں مچھلیاں پکڑنے کا شغل ہے۔"

"بڑی نہیں بہت چھوٹی چھوٹی ہیں ....."

"تو انہی کو پکڑیں گے۔"

شمی خاموش رہی۔

"فہرست مکمل نہیں ہوئی۔"

"نوکر جاگ نہیں تو کسی کو بازار بھیجا جائے رات پروگرام بہت دیر سے بنا اب اگر نوکر سائیکل پر جائے تو بھی ڈھائی میل جانا ڈھائی میل آنا۔ بازار نزدیک تو ہے نہیں۔"

"تو پھر میں سرونٹ کوارٹر میں جا کر کسی نوکر کو بلا لاتا ہوں۔ آخر دیر کیوں کی جائے؟"

جاوید خالی پیالہ میز پر رکھ کر شمی کے قریب کھڑے رہے۔

شمی نے پھیکی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"شمی!" وہ آگے کو جھک گئے شمی کا دل دھڑکنے لگا۔

"آپ کے لئے ایک چیز لایا ہوں۔" جاوید نے گاؤن کی جیب میں سے دمکتے ہوئے موتیوں کا ایک ہار نکالا "اجازت دیجئے میں یہ ہار آپ کے گلے میں پہنا دوں۔"

—— اور پھر بلا اجازت جاوید نے آگے بڑھ کر ہار پہنا دیا۔ "پلنگ پر ایک کو جھن کر چلنے لگا" بیشتر اس کے کہ اس کا گداز سینہ موتیوں کی ٹھنڈک کو محسوس کر سکے جاوید کمرے سے باہر نکل گیا۔

شمی امیر گھر کی بیٹی تھی۔ وہ ان موتیوں کی قیمت کا اندازہ لگا سکتی تھی ..... ادھ

www.taemeernews.com

اس نے موتیوں کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور ان پہ اپنا رخسار رکھ دیا۔۔۔۔

کوٹھی کے باہر ایک بڑا چوکور چبوترا تھا۔ گرمیوں میں شام کے وقت بڑے پھاٹک والا اس پہ پانی ڈالنے کا کام دیتا اور کوٹھی کے اس جانب چبوترے پہ عورتیں جمع ہو جاتیں۔ اگر گھر کے سب لوگ مل بیٹھنا چاہتے تو یہی موزوں جگہ ہو سکتی تھی۔

چونکہ اب دھوپ بھی خاصی نکل آئی تھی۔ اس لئے گھر کے لوگ بے ترتیب کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ سوائے شمی کے سب لوگ ایسے بے فکر تھے جیسے کہیں جانے کا خیال ہی نہ ہو۔ ادھر ادھر کی ہانک رہے تھے۔ لیکن جب نوکر بازار سے لدا پھندا لوٹا تو پھر ہر کوئی اچک اچک کر چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ پھلوں کی ٹوکریاں، مچھلی کے ڈبے، پیسٹریاں، اچار، مربے، ڈبل روٹیاں، گرم گرم سموسے، رس گلے اور بنگالی مٹھائی سے لبریز آبخورے۔۔۔
دادی نے اور ضروری چیزیں منگوائیں ----- اسنو، تھرماس، چھوٹا پان کا ڈبہ، شکر، پلیٹیں وغیرہ۔۔۔۔۔۔ اتنے میں ان کے پڑوسی پارسی میاں بیوی آن پہنچے۔ وہ بھی مدعو کیے گئے تھے۔ مسٹر نوروجی کو لوگ مذاق سے گزنجبر بھی کہا کرتے تھے۔ شگفتہ سے ادھیڑ عمر کے شخص تھے۔ شہر میں ان کے دو سینما ہاؤس تھے۔ ایک سکیٹنگ رنک، ایک موسیقی کے سازوں کی دوکان ----- صحت مند، چست و چالاک۔ نوجوانوں کو مات کرتے تھے۔ بات کرتے وقت ان کی بھنویں خوب حرکت کرتیں۔ ان کی بیوی شیریں بلا کی حسین عورت تھی اونچی ایڑی کی گرگابی پہن کر وہ قد سے بلند قامت نظر آتی تھی۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود خوبرو اور طرحدار ----- بات کرتی تو منہ سے پھول جھڑتے، خوش ادا، نفاست پسند اور ہنس مکھ -----
ان کی اولاد بھی خوبصورت اور سمجھدار تھی۔ سب سے چھوٹے دو بچے ان کے ساتھ تھے۔

www.taemeernews.com

آتے ہی محبوب کو ڈھونڈنے لگے۔ محبوب جس کو پیار سے بولی کہہ کر پکارا جاتا تھا ہاشمی کا پانچ سالہ بھائی تھا۔ وہ طوطے کی طرح بات کئے جاتا تھا اور ہاشمی اس کی ہر بات کا جواب آج بہت ہی پیار سے دے رہی تھی۔ کتنا پیارا بچہ تھا ہاشمی نے اس کو گلے سے لگا کر بھینچا۔

ناشتہ کا سامان پہلے کھانے کے کمرے میں لگا دیا گیا پھر تجویز یہ ٹھہری کہ باہر چبوترہ پر ہی ناشتہ کیا جائے۔ سب انسپکٹر صاحب خوب زور سے ہاتھ ملتے ہوئے کرسی کھسکا کر آگے بڑھے انہوں نے ساقی کا کام سنبھالا۔ اور پیش دانی بطخ سی چائے دانی کا ڈھکنا اٹھا کر ——————— الحمد اللہ جانچتے ہوئے بولے "صاحب شرنگ سے نئی کچھ"

بڑی اماں لاکھ بوڑھی سہی لیکن ان کا دل جوان تھا۔ جوان کیا بلکہ بچہ تھا۔ کیا مجال جو سیر و تماشے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے دیں۔ ادھر بچوں کے لئے دو موٹر سج دھج کر آئے تو ادھر بڑی اماں کے لئے ڈانڈی بھی آن پہنچی۔ بچے راستہ بھر ٹینس کورٹ میں دوڑ لگاتے رہے جو پارٹ کے گرد اگرد تھی پارک کے نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھولوں اور زرد زرد داؤدی کے پھولوں کی کلیاں بنا کر ٹوپیوں پر ٹانکے اپنے بزعم خود بادشاہ اور نواب بنے ہوئے آئے۔ ان کو دیکھ کر پیشانی پر بیسیوں گھنٹیاں بجانی شروع کر دی۔

خدا خدا کر کے یہ قافلہ روانہ ہوا

ڈانڈی پر بیٹھی ہوئی دادی اماں سب سے بلند گویا راستہ قافلہ کی تھیں ان کے چہرے پر باوجود بڑھاپے کے بہترین صحت کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بار بار اپنے پوپلے

www.taemeernews.com

پر ہاتھ پھیرتیں اور کہتا انہیں۔ ان کا دم بھی غنیمت تھا۔ ایسی ہی پکنکوں میں حصہ لے چکی تھیں۔ اس لئے کل انتظامات کرنے میں بڑی ماہر تھیں۔ کیا مجال جو کوئی بھی ضروری شے ان کی نظر سے بچ جائے یا کوئی شے منزلِ مقصود پہ پہنچ کر یاد آئے کہ چھوٹ گئی پیچھے اور جہاں تک ان کا سلیقہ تھا نہ بھولتی تھیں۔

مسز گذدر ہیڈ انسپکٹر صاحب کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ مسٹر گذدر ہاتھ میں ہاتھ چھڑی لئے حامد کے ساتھ گپ اڑا رہے تھے۔ اماں، پھوپھیاں اور رشمی کی علیحدہ ٹولی تھی۔ کیپٹن جاوید رشمی کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ ادھر ڈاکٹر منظور ایک نوکر سے کرید کرید سوالات پوچھ رہے تھے۔ کیوں بے تیری شادی ہوگئی کیا؟ پھر کہاں گئی بیوی؟ ایسا تو نے اسے چھوڑ دیا اس نے دولات ....." اور بچے ٹٹوؤں پر سوار ٹھک ٹھک کرتے چلے جا رہے تھے۔ بوبی چھوٹی بہن کو ساتھ بٹھا کے ایک ذمہ دار شخص نظر آتا تھا۔ مسٹر گذدر کے دونوں بچے بھی اپنے ٹٹو پر سوار تھے۔ بچوں میں بحث ہو رہی تھی موضوع یہ تھا کہ ان میں کونسا ٹٹو اصلی پہاڑی تھا۔

گذدر صاحب کی نیوفونڈلینڈ نسل کی کتیا بھی زمین سونگھتی چلی جا رہی تھی۔

پہلے وہ اکیلی وکیلی کوٹھیوں کے قریب سے ہوتے ہوئے تھوڑی دور تک چھوٹی نہر کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ اس نہر کا پانی نہایت صاف تھا۔ چھوٹے چھوٹے مختلف ڈیل ڈول کے رنگ برنگے پتھر پانی میں سے جھلک رہے تھے پانی کے کنارے لمبی ہری ہری گھاس لہلہا رہی تھی۔ بیچ بیچ میں پیپرمنٹ کی سی خوشبودار بوٹی اگی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں گول گول پتوں والی ریشمی بوٹی بھی نظر آ جاتی تھی۔ سب سے بلند کتا گھاس تھی۔ اگر کسی کا کپڑا اس سے چھو جاتا تو اس کے دانے کپڑے سے چپک کر رہ جاتے۔ نہر چھوڑ

www.taemeernews.com

کردہ پگڈنڈی پر ہو لیے جو ڈھلوانوں پر سے ہوتی ہوئی چنار کے باغ میں غائب ہو جاتی تھی۔

ابھی دھند صاف نہ ہوئی تھی۔ جوں جوں سورج بلند ہو رہا تھا دھند میں غائب ہوتی جا رہی تھی۔

قہقہوں پر قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ باتوں میں چچا۔ بیچ سے کون بازی لے جا سکتا تھا۔

دادی اماں نے گلزار صاحب کو پکار کر کہا۔ کیا اچھا ہوتا اگر آپ بڑے لڑکے کو بھی ساتھ لے آتے کیا نام ...... بھلا سا نام ہے اس کا۔

گلزار صاحب ہنسے ان کے مضبوط دانت اور سرخ مسوڑھے نمایاں ہو گئے "سعید؟ آپ کو معلوم نہیں سعید نے موٹر سائیکل خریدی ہے۔ آجکل اسی دھن میں ہے جب سے میں نے لائسنس لے دیا ہے تب سے دن رات موٹر سائیکل کا بھوت سر پر سوار رہتا ہے۔ اگر موٹر سائیکل اس رستہ سے جا سکتی تو وہ ہمارے ہمراہ ضرور آتا۔"

اماں بولیں: "موٹر سائیکل کس خوشی میں خرید دی آپ نے؟"

"میں کاہے کو خرید کر دیتا۔ یہ تو ایسی بدبخت سواری ہے کہ میں عمر بھر اس کو خرید کر نہ دیتا۔ خود چار پانچ ماہ کا جیب خرچ جمع کر کے خرید لی شریر نے۔"

شیریں نے دادی ماں سے پوچھا "آپ اب نئی کار کب خرید رہے ہیں؟"

"نئی! نئی کا کیا ہوگا؟ پہلے بھی ایک موجود ہے۔"

"رہنے دیجئے اب اس میں کیا رکھا ہے۔ پرانا ماڈل ہو اور پھر فورڈ۔"

"تو فورڈ کچھ بری تو نہیں۔"

www.taemeernews.com

"آپ کو تو رولز رائیس رکھنی چاہیئے"
شمی کی اماں بولیں "رولز رائیس خریدنے کا دم تو حامد صاحب میں ہے۔ دیکھو تو کیسے دم سادھے جا رہے ہیں۔ بنکوں کے مالک ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

شیریں کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ پیدا ہوئی "کیوں مسٹر حامد کچھ فرمائیے نا! آپ کار لیجئے تو ہم بھی فخر سے گھومتے پھرا کریں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کونسے بنک کے مالک ہیں آپ۔ ہم کو تو آج تک پتہ ہی نہ چلا"

"بانو آپ تو مجھ کو بنا رہی ہیں۔ آپ بھی ان کی باتوں میں آگئیں"

اماں بولیں "لیجئے اور سنئے۔ کہئے نا وہ کار ز موپالیٹن بنک"

"واہ صاحب واہ! آپ نے مجھ کو مالک کب سے بنا دیا میرا نام حصّہ داروں میں لیجئے نا!"

اب پارٹی چائے کے باغ میں داخل ہوگئی۔

دادی اماں نے کاشمیری چادر کندھوں پر ڈالتے ہوئے پکار کر کہا "ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ چائے کی سبز پتیاں ہماری چوڑ چائے میں کیونکر تبدیل ہو جاتی ہیں کیوں نہ پتیاں توڑ کر لے چلیں اور سکھا کر چائے بنائیں اور دیکھیں کیا لطف آتا ہے"

رفیع صاحب آگے بڑھ کر بولے "لیجئے میں سمجھاتا ہوں آپ کو۔ اس پودے کی ساری پتیاں کام میں نہیں لائی جاتیں۔ صرف کونپلوں کی تین یا ڈھائی پتیوں کی چائے بنتی ہے"

سب لوگ کھڑے رفیع صاحب کی باتیں سن رہے تھے۔ شمی اماں کے پاس

www.taemeernews.com

گھسی کھڑی تھی۔ جاوید نے پیچھے سے برقعے کا دامن کھینچ دیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ بڑی دیر بعد شرارت کو بھانپ سکی۔ رفیع صاحب کا لکچر ختم ہوا اور سب لوگ آگے چل کھڑے ہوئے۔

چائے کا باغ ختم ہونے پر تھوڑی سی ہموار جگہ آئی۔ آگے برسات کا پانی کھڑا تھا۔ کنارے پر ہری بھری لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ سرسبز جھاڑیاں۔ قریب ہی ایک گھراٹ اس کے بعد جنگل۔ چھوٹی چھوٹی حسین پہاڑیاں۔

تھوڑی دیر تک قافلہ گھراٹ کے قریب رکا۔ پانی تیزی کے ساتھ نیچے گر رہا تھا جگہ تنگ تھی۔ پانی کا بہاؤ بڑا شور مچاتا، جھاگ اڑاتا بہہ رہا تھا۔

ثمی کی اماں نے پھر بات چھیڑی "بانو! آج آپ کی ساڑھی غضب ڈھا رہی ہے۔ کتنے کی ہے؟"

شیریں مسکرائیں "سستی ہے۔ ڈیڑھ سو کی لی تھی۔"

"اللہ میرے" دادی اماں پکاریں "مسز گنڈور! یہ کیا ظلم ہے۔ اب آپ کنجوس ہوتے جا رہے ہیں"

"جی نہیں" شیریں بولیں "ساری کنجوسی میرے لئے ہے۔ ورنہ بیٹے کا جیب خرچ ملاحظہ ہو۔ چار مہینے میں موٹر سائیکل خرید لی۔ خود پرسوں کا رنیوال میں پانسو سے اوپر کھڑے کھڑے ہار گئے۔"

گنڈور صاحب اپنی پوزیشن صاف کرتے ہوئے بولے "دیکھو بانو! اگر آپ نے ہمارے بھید کھولے تو ہم آپ کے راز بھی افشا کر دیں گے...... کہو بتا دوں؟"

شیریں بانو لجا گئیں۔ نیچی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں "کہہ

www.taemeernews.com

ڈال لیے نا! چھپانے کیوں ہیں؟"

ایسی مسکراہٹ کے بعد بچارے گزدر صاحب!

"کس قدر خوبصورت جگہ ہے ونڈرفل!!" جاوید ایک جگہ اسکول کے چھوکرے کی مانند اکڑ کر ٹھٹک گئے۔

انسپکٹر رفیع بولے "تو کپتان صاحب! یہاں ایک کوٹھی بنوا ڈالیے نا!"

"درحقیقت میرا دل تو یہی چاہتا ہے اگر..... اگر......" انہوں نے ثمی کی طرف چھپی نظروں سے دیکھا..... سب لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

رستہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ سب لوگ اس جگہ ٹھہر گئے۔ ایک طرف ایک دوکان تھی۔ جسے جنرل مرچنٹ کہنا چاہیے۔ دودھ، دہی، مٹھائی، پکوڑوں کے علاوہ آٹا دال، موم بتی، سگریٹ، ماچس، پان، صابن، انڈے، بلیڈ، آئینے، غرض ہر قسم کا سامان اس جگہ سے مل سکتا تھا۔

انسپکٹر رفیع پکار کر بولے "بھئی اس جگہ پان کھائے جائیں گے۔"

حامد صاحب کہنے لگے "لیکن پانوں کے خرچ کا بار کون اٹھائے گا؟"

"ڈاکٹر منظور!" سب لوگ بول پڑے۔ سب کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"ڈاکٹر منظور ہماری پارٹی کو پان کھلائیں گے۔ وہی سب سے موٹی اسامی ہیں۔"

ڈاکٹر منظور حسب معمول بڑی مشکل سے ہنسے جیسے ہنسنے سے معذور ہوں۔ وہ تھے صاحب ثروت۔ لیکن کنجوس بھی پرلے درجے کے۔ باریک آواز میں بولے "پان کھلانا تو بسر و چشم قبول..... لیکن صاحب میں موٹی اسامی کیوں کر ہوا؟"

"بھئی وہ سٹے میں جو تم نے لاکھوں روپے پیدا کیے ہیں۔ اور یہ جو گھوڑ دوڑ

www.taemeernews.com

کے لیے بمبئی بھاگے جاتے ہو ....." رفیع نے آوازہ کسا۔

منظور کچھ جھینپے۔

"پولیس انسپکٹر ہوں انہی چیزیں پہچانتا ہوں۔"

لاکھوں روپے کا نام سن کر دو ہٹے کٹے گورکھے جو دوکان پر کھڑے ہوئے پان رہے تھے ڈاکٹر منظور کی طرف دیکھنے لگے۔

پان کھانے کے بعد پارٹی روانہ ہوئی۔

ایک جگہ بڑی بے ڈھب اترائی تھی بعض لوگ بھاگے بعض بیٹھے۔ بعض چاروں شانے چت۔

راستے میں کمہاروں کے چند گدھے بجری سے لدے ہوئے اوپر آ رہے تھے ان بیچارے کھیلتے ملتے چلے آتے اشخاص سے جو مڈبھیڑ ہوئی تو بدک کر بھاگے۔ یہ طرفہ تماشہ ہوا۔ غرض اترائی اترتے وقت سارا قافلہ منتشر ہو گیا۔ نیچے پہنچ کر سب لوگ ماتے پسینوں کے دوہرے ہو گئے۔ عورتوں کے سروں سے برقعے کھسک کھسک گئے۔

آگے بلند پہاڑیوں کے دامن میں بھدی بھدی جھونپڑیاں نظر آنے لگیں۔

چند پہاڑی کاٹھ کے مرتبان نما برتنوں میں دودھ بھر کے شہر کی طرف لیے جا رہے تھے۔ ان سے دو مرتبان دہی خرید لیا گیا۔

اب وہ بڑی ندی کے کنارے کنارے چل کھڑے ہوئے۔ جنگلوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے بیچ میں سے بہتی ہوئی آ رہی تھی۔

ایک طرف پہاڑی کے اوپر پانی کا چشمہ تھا۔ گاؤں کی عورتیں گھڑے کولہوں پر رکھے سست قدموں سے پہاڑی پر چڑھ رہی تھیں۔

www.taemeernews.com

میل بھر چلنے کے بعد آبشار کا شور سنائی دینے لگا۔

سب کے دل اچھلنے لگے۔ ذرا آگے بڑھے تو آبشار دکھائی دینے لگا۔ سب لوگ ٹھٹک کر رک گئے۔

پانی بڑی بلندی سے ندی میں گر رہا تھا۔ رستہ میں جہاں کہیں بھی ٹکراتا، وہاں متواتر چھینٹے اڑنے سے بادل سے اٹھتے دکھائی دے رہے تھے۔ گہرے سبز رنگ کی جھاڑیوں کے بیچ میں پانی کی سفید سی لکیر کھنچی ہوئی جیسے بالوں کے درمیان مانگ۔

مسٹر حامد کو آرٹ سے دلچسپی تھی۔ "قدرت کے نظارے بھی کس قدر پر عظمت ہوتے ہیں۔"

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے وہ آگے بڑھے۔ ایک پرانا مندر بھی نظر آنے لگا۔ وہ کھنڈر بھی دکھائی دینے لگی۔ جہاں سرد فت پہاڑ میں۔ سے بوندیں ٹپکتی رہتی تھیں۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا مسافر خانہ تھا۔ جو مریض زیادہ دن ٹھہرنا چاہتے وہ اسی میں قیام کرتے۔

سب سے پہلے گندھک کا چشمہ دیکھا گیا۔ ایک چٹان کی دراڑ میں سے گندھک کا پانی ابل رہا تھا۔ صاف و شفاف۔ جن پتھروں کو چھو کر پانی گذرتا تھا۔ ان پر سفید رنگ کی ایک موٹی سی لجلجی تہ چڑھ گئی تھی۔ گندھک کی بو دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

چشمے سے ذرا ہٹ کر لوگوں کی نظروں سے دور، چٹائیاں بچھادی گئیں۔ گراموفون ایک ہموار پتھر پر رکھ دیا گیا۔ بے ترتیب سامان کے درمیان عورتوں نے برقعے اتار پھینکے مردوں نے پیٹیاں ڈھیلی کر دیں۔

دم لینے کے بعد مرد کپڑے اتار ندی میں کود پڑے۔ دادی اماں کے دوپٹے

www.taemeernews.com

نے مچھلیاں پکڑی گئیں۔ ایک دوسرے پر پانی اچھالا گیا۔ ریکارڈ بجائے گئے، تاش کھیلی گئی، لطیفے سنائے گئے۔ کیپٹن جاوید نے گٹار بجائی۔ اس قدر ہنگامہ مچا کہ توبہ ہی بھلی۔ آخر تھک ہار کر شام کے وقت سب لوگ ایک ایک پیڑ کے نیچے رکھ کر لیٹ گئے۔ اب صلاح یہ ٹھہری کہ چاندنی رات کی جائے۔ اور چاند نکلنے کے بعد واپسی کا بگل بجے۔ اس بات کی فکر نہ تھی کہ رات ہو جائے گی۔ چاندنی راتیں تھیں، سفر کا لطف دوبالا ہو جائیگا۔

اسٹو پر پانی کا پتیلا رکھ دیا گیا۔ نوکر آئے ہوئے انڈے چھیلنے لگا۔ شمی کو پیاس محسوس ہوئی۔ دن بھر سب لوگ گندھک کا پانی پیتے رہے تھے۔ لیکن اس کو بو بری معلوم ہوتی تھی۔ جاوید نے اس کی بات سن پائی۔ بولا "چلو میرے ساتھ پانی پلا لاؤں قریب ہی تو چشمہ ہے۔ دس منٹ کا رستہ۔"

وہ آزاد گھرانا تھا لیکن اس حد تک آزادی مناسب تھی یا نہیں شمی کی ماں فیصلہ نہ کرسکی لیکن کیپٹن جاوید کی بات کو رد کیوں کر کیا جائے۔ دادی اماں نے بگڑی بات بنائی۔ "جاؤ شمی! پی آؤ نا پانی۔"

شمی نے برقعہ سر پر ڈال لیا۔ اور تھی تھمائی پہلے جاوید کے پیچھے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ ہو لی۔ اس نے چہرے کے آگے کا نقاب الٹ رکھا تھا۔ دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ تنہائی میں کیپٹن جاوید کا حلق بھی خشک ہو رہا تھا۔ پہاڑی کے موڑ پر وہ سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ تکاہے شمی دانتوں تلے ہونٹ دبا لیتی۔ سیاہ برقعے میں سے اس کا دمکتا ہوا نکھرا!

چشمے کے قریب پہنچکر جاوید نے پانی کا پیالہ بھرا اور شمی کی طرف بڑھا دیا۔ پانی پینے کے بعد جب وہ لوٹنے لگے تو جاوید رک گیا۔

www.taemeernews.com

سورج غروب ہو رہا تھا اور اس کی الوداعی کرنوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں کو سنہری رنگ سے رنگ دیا تھا اونچے اونچے پُر وقار درخت جیسے آسمان کے سینہ میں گھس گئے ہوں۔ درختوں کے بیچ میں سے نکل کر آنے والی دھوپ جیسے آری سے چیرے ہوئے لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑے۔ یا جیسے دریا کا بند ٹوٹ جانے سے برساتی پانی کی مٹیالی چادر سی بہہ نکلی ہو۔ ہر چہار جانب پُراسرار خاموشی تھی۔ ان بلند قامت درختوں کے قدموں میں کھڑے ہوئے جاوید نے کہا "کس قدر حسین منظر ہے شمی!"

شمی زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ چند لمحوں کے لئے پھر خاموشی طاری ہو گئی۔

"تم.... تمہیں وہ ہاپسٹ بھی آیا؟" — کس قدر بھیچپسا سوال تھا۔ اس نے شمی کا ہاتھ تھام لیا شمی تیز تیز سانس لینے لگی۔ اس کی چھاتیوں میں سمندر کی لہروں کے مدوجزر کی سی کیفیت نظر آنے لگی۔

"بھئی یہ برقعہ بھی کیا" جاوید نے آناً فاناً برقعہ جھپٹ کر اچھال دیا اور وہ ایک شاخ سے الجھ کر لٹکنے لگا۔ شمی نے اس کو روکنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھائے۔ جاوید کو اس کی کمر بانہوں میں جکڑ لینے میں آسانی ہو گئی۔ اس نے اس کے ہونٹوں پہ ہونٹ رکھ دیئے۔

اس نے سہمی ہوئی کبوتری کی متجسس نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا "... ہائے اللہ! کوئی دیکھ نہ لے.... کوئی دیکھ نہ لے....!"

کون؟ ——؟

کوئی نہیں۔ کوئی بھی تو نہیں۔

www.taemeernews.com

گھاس کا گٹھا سر پر اٹھائے ایک لڑکی تیز تیز قدم بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ پاؤں میں چاندی کے پازیب کہنیوں پر میل...... شہر کی گھاس منڈی ابھی بہت دُور تھی۔ اس کا سر گھاس کے گٹھے میں اس قدر دھنسا ہوا تھا کہ وہ چار قدم سے آگے کچھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس کا چہرہ تک چھپا ہوا تھا۔ صرف اس کی سرخی رنگت کی گول چکنی ٹھڈی دکھائی دے رہی تھی۔ جس جگہ اس کے لہنگے کا ازار بند بندھا ہوا تھا اس جگہ اس کے جسم کی جلد کی تنی ہوئی تکون سی نظر آ رہی تھی...... عظیم الشان آبشار کی عظمت سے بے خبر...... رواں دواں......

اس سے پرے گھاس کا گٹھا اٹھائے ایک اور لڑکی...... اس سے پرے اک اور...... پرے اک اور...... اک اور...... اور...... اور......

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

اُس کی بیوی

سب کی آنکھ بچا کر وہ کھسکا..... آخر وہ تھک گیا تھا۔ شادی کے موقعہ پر جو شور و غل ہوتا ہے۔ اس سے کون واقف نہیں اور پھر دلہا بیچارے کی وہ مٹی پلید ہوتی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ موسم گرم، سالیوں کی چھیڑ چھاڑ گرم تر۔ آخر وہ دلہن سے بھاگا۔ اب ایک مرحلہ رہ گیا تھا۔ وہی روایتی پہلی سہری رات ہنی مون..... لیکن اس سے پہلے وہ چاہتا تھا کہ اس کے حواس درست ہو جائیں۔ اسلئے وہ دوستوں اور عزیزوں کے جھرمٹ میں سے جو بھاگا تو پرانی کتابوں کی دوکان پر جا کر دم لیا..... اور "خونی کتا" دیکھنے لگا۔ بوسیدہ سی کتاب کانن ڈائل کے جاسوسی ناول ہاؤنڈ آف بیسکر وائلز کا ترجمہ تھی ——— دوکان دار نے سفید پوش گاہک کو تاڑ کر آٹھ دس ناول اس کی طرف دھکیل دیئے ..... ڈاکٹر نکولا، سنہری بچھو، بہرام کا قتل، خون آشام محبوبہ، ہائے میری جان! زندہ مردہ کفن پوش، بےگناہ قیدی، سلطانہ ڈاکو عرف شیر بجنور.....، اب وہ جاسوسی ناولوں سے کس قدر نفرت کرتا تھا۔ لڑکپن میں اس کو جاسوسی ناول پڑھنے کا اس قدر شوق تھا کہ اس نے "چندر کانتا" کے کل حصے چار مرتبہ پڑھ ڈالے۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ اس کو ہر نیا ناول پرانے کی نقل معلوم ہوتا تھا..... تو پھر وہ وقت گذارنے کے لیے کیا خریدے: "بھئی کوئی نئی چیز!"

www.taemeernews.com

"نئی چیز!" ـــــ دکان دار نے ڈوما کا "بھری سکیپرز" بڑھایا۔ اس "نئی چیز" کی بجائے کیوں نہ وہ مین اونلی (Men Only) خرید لے۔ ہر اشاعت میں دو عریاں عورتوں کی تصویریں، ہر تصویر کے نیچے عنوان، جو نیم شاعرانہ طبیعتوں پہ وجدانی کیفیت طاری کر دیتا ہے..... خوب یاد آیا۔ شاید وہ مرکری کے پرچے موجود ہوں خالص ادبی رسالہ وہ اس کونے کی طرف بڑھا تھا ایک بہت ہی فربہ اور دیو پیکر کتاب نظر آئی۔ اس پر لکھا تھا گھوسٹ سٹوریز (Ghost Stories) یعنی بھوت کہانیاں۔ لفظ بھوت تو خوب بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا اور اس کے نیچے لفظ Stories بہت چھوٹے حروف میں جیسے وہ لفظ بھوت کی ٹانگیں ہوں نیچے ریچ میچ کے بھوت کی تصویر..... اس کا جی متلانے لگا۔ آخران حرکتوں سے کیا حاصل؟ وہ کچھ پڑھنے کے موڈ میں کہاں تھا؟ غیر شعوری طور وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھا۔ لیکن بھوت کہانیاں دیکھتے ہی اس کی قوتِ ارادی مضبوط ہو گئی۔ وہ الٹے پاؤں دکان سے نکل آیا۔

اب وہ بیئر پینا چاہتا تھا۔

چار بجے کے قریب گاہکوں کے آنے کا وقت نہیں لیکن گاہک اور موت کے وقت کا تعین نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ دوکان دار دوکان پہ موجود تھا۔ وہ بھنبھناتی مکھیوں کے درمیان کچھ بھنایا سا بیٹھا تھا۔ اس کے استقبال کے لئے دوکاندار کی مونچھیں متحرک ہوئیں اور وہ پانی میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف گھورتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ گاہک اس کی دوکان میں داخل ہو چکا ہے۔ تو اس نے منہ پھیلا کر نوکر کو آواز دی۔ "ابے چل سوڈر کے نیچے۔ تیری..... " نوکر بھی دبو نہ تھا معمولی زق زق بک بک

www.taemeernews.com

کے بعد وہ گاہک کے پاس پہنچا۔

جاسوسی ناولوں میں کسی مڑے ہوئے ہونٹ والے مجرم کا سراغ لگانے کے لئے جب کوئی جاسوس کسی ہوٹل میں جاتا ہے تو اس ہوٹل کا حلیہ بالکل اس سے ملتا جلتا بیان کیا جاتا تھا۔ تاریک کمرہ۔ بڑے بڑے پردوں والے چھت کے پنکھے، مدھم روشنی شراب اور گوشت کی ملی جلی بو، مختلف میزوں پر مجسّس صورتیں، بلیٹیں چاٹتے ہوئے کتوں کی چپڑ چپڑ کی آوازیں۔۔ ۔۔۔۔ یہ احساس اس وقت اور بھی تیز ہو جاتا جب اس کے سامنے جوجو بیٹھا ہوتا۔ اسے سب جوجو کہتے تھے۔ جوجو ایک بے معنی نام تھا۔ لیکن جس کسی نے اس کو دیکھا ہے اس کی شخصیت محسوس کیا ہے وہ جوجو کے معنی بخوبی سمجھ سکتا تھا یعنی یہ بے معنی لفظ بامعنی معلوم ہونے لگتا۔ جوجو کی پیشانی تنگ، چہرہ سرسمیت ایک تنے ہوئے گھونسے کی طرح، اس کے چہرے پر بال بہت تھے۔ پیشانی پر، گالوں پر، کانوں پر حتیٰ کہ ناک پر بھی بال تھے جس جگہ بال نہ ہونے چاہیئے۔ وہاں بھی استرا پھیر بنا شیو کے بعد معلوم ہوتا جیسے کسی نے اس کے چہرے پر کالک مل دی ہو۔ پھر اس کی گھنی بھنوؤں تلے اس کی اندر کو دھنسی ہوئی چمکدار تیزی سے گھومنے والی متجسس آنکھیں۔۔۔۔۔۔ لیکن وہ اس کے ساتھ کبھی خوش نہ ہوا تھا۔ اب اور کوئی نہ ملے تو لاچاری کی بات دوسری ہے۔ اگر کہیں جوجو سے ملاقات ہو جاتی تو جوجو اپنے مخصوص انداز سے پوچھتا۔ ”ہو سکتا ہے؟“

”ہاں ہو سکتا ہے۔“

”تو ہو جاتے“۔۔۔۔۔ اور باتیں تو غنیمت تھیں لیکن اس کے لئے سب سے نفرت انگیز بات یہ تھی کہ جب وہ پینے کی تیاری کرتا تو حلوائی کے ہاں سے تلی ہوئی

www.taemeernews.com

واپس ٹھکرا دیتا۔ نہ گوشت نہ کباب۔

اگر شراب پینا حرام ہے تو تنہا پینا حرام تر۔ بعض لوگوں کی صحبت اس قدر اچھی ہوتی ہے کہ پلے سے پلا کر بھی دل خوش رہتا ہے۔ بعض منحوس ایسے ہوتے ہیں کہ انکی موجودگی میں انہیں کی گرہ سے پی کر بھی دل کو فرحت حاصل نہیں ہوتی۔ جگندر پال کو ہی لیجئے آخر تک کتنی متانت سے بیٹھا رہتا ہے۔ سنتا ہے تو سنبھل کر۔ بات کرتا ہے تو تول کر۔ ممکن ہے اس کے بھاری بھر کم جسم پر پانچ پیگ کا اثر ہی نہ ہوتا ہو۔ بیچارا کھیل کھیلے بھی کیوں کر۔ کہاں وہ پیارے لعل۔ یک مشت بال و پر۔ گلہری کی طرح چونچال اور چلبلا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو شراب کا نام ہی سن کر سرور میں آنے لگتے ہیں۔ اور بوتل سے کاک اترتا دیکھ کر بہکنے لگتے ہیں۔ جہاں ایک پیگ پیا لگے کلبلانے۔ لہک لہک کر لگے ٹھمری کے بول سنانے اور پھر قہقہہ جو لگایا تو چھت صاف اڑ گئی۔

سب سے افضل بات تو یہ ہے کہ کوئی محشر خرام پری چہرہ ساقی ہو۔ پھر اللہ دے بندہ لے۔۔۔۔ مگر ساقی دستیاب ہی کہاں ہوتے ہیں۔ یہاں اگر ساقی ملنے کی امید ہو سکتی ہے تو شادی ہونے پر۔ وہ بھی اگر بیوی منظور کر لے اور پھر سوسائٹی کے دوسرے افراد کو بھی پتہ نہ چلے۔۔۔۔ بیوی!۔۔۔۔ کتنی ناقابلِ یقین بات تھی۔ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک عورت کا شوہر تھا، واقعی!

وہ ان اشخاص میں سے تھا جو شادی کے معاملہ میں از حد محتاط ہوتے ہیں کس کس طرح سے اس کو پریشان کیا گیا۔ اس پر کیسے کیسے دباؤ ڈالے گئے۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ شادی اس نے تبھی کی جب اس نے دیکھا۔ کہ وہ گھریلو اخراجات برداشت کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ اس کی طرف سے سب انتظامات ہو جانے پر بھی شادی اس

www.taemeernews.com

کے لیئے لاٹری بی ربی۔ بیوی صاحبہ اس کی ماں کا انتخاب تھیں۔۔۔۔

اس نے جنسیات پر بیسیوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ کل رموز حفظ کر لئے۔ وہ کم از کم بدصورت نہ تھا، صحت بھی اچھی تھی اور "پیدا کرنا" بھی تھی۔ وہ ہر طرح سے مکمل شوہر تھا۔ اس قدر صبر آزما طویل کنوارپن کے بعد اگر بیوی بیکار ثابت ہوئی۔۔۔۔۔؟

کڑوی کسیلی بیئر کے دو گھونٹ پی کر اس نے منہ بگاڑا۔ پلیٹ میں سے کوفتہ اٹھایا۔۔۔۔ پتھر کی طرح سخت۔ اس نے کوفتہ کو انگلیوں میں دباتے ہوئے نوکر کو ڈانٹا۔ "کیوں بے یہ کوفتہ ہے۔ اسی کو تم لوگ کوفتہ کہتے ہو؟"

رات۔

وہ آرام کرسی پہ آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ اس کی تکان زدہ پھیلی ہوئی ٹانگیں تپائی پہ ٹکی تھیں۔ پاؤں دکھ رہے تھے اور تلووں میں جلن ہو رہی تھی۔ دل دھڑک رہا تھا اور بیوی کا انتظار۔۔۔ دماغ میں خیالات خلط ملط ہو رہے تھے۔ ایک بڑا حادثہ پیش آیا ہوا تھا۔ بیوی!۔۔۔ میری اچھوتی چھاتیاں! میری فاختہ! میری کبوتری!۔۔۔ یہ الفاظ نامعلوم اس نے کہاں پڑھے تھے یا سنے تھے کس قدر دلکش!

"رو افیمیوں کی مانند پڑے ہیں پینک میں۔۔۔ جاؤ دلہن تمہارے فراق میں گھل گھل کے ہاتھی ہو رہے ہیں بچارے"

وہ چونکا۔ لڑکیوں کے قہقہے بلند ہوئے۔ دلہن کمرے کے اندر تھی سہیلیاں باہر دروازہ بند۔۔۔۔۔ "اندر سے چٹخنی چڑھا نہ بھول جانا" پھر قہقہہ پہ قہقہہ۔۔۔۔ رفتہ رفتہ قہقہے مدھم پڑ گئے۔

www.taemeernews.com

تیس برس گذر گئے ..... ماضی مبہم غیر اہم حقیر بے معنی ... دھندلا دھندلا

بعض عورتیں پہلے دن ہی پھول کی طرح کھل جاتی ہیں ..... بعض پہلے تو بند کلی کی طرح سمٹی رہتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ ان کے جوہر کھلنے لگتے ہیں۔ لیکن اس کی بیوی ان دونوں میں سے ایک بھی نہ تھی۔ وہ محض ایک عورت تھی۔ اس کی حیثیت ایسی تھی جیسے میونسپلٹی کی لالٹین ..... وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی تیتری کی طرح اڑتی پھرے اگر وہ میکے جانے پر اصرار کرے، چونچال ہو، اٹکھیلیاں کرے کبھی ادھر کو نکل جائے اور کبھی بادِ بہاری کی طرح ادھر کو۔ تو وہ کہیں رومانٹک دکھائی دے۔ کبھی وہ ناز سے بل کھا کر کہے "یہ تو آپ کہیں قدر کمزور معلوم ہوتے ہیں۔" اگر وہ گھر دیر سے پہنچے تو کہے "کوئی جان سے جا سکتا آپ کی بلا سے" وہ خیال و شاداں پھولوں کی مہک کی طرح سبک رفتاری سے ادھر ادھر چلتی پھرتی نظر آئے۔ برعکس اس کے وہ صدودجہ کی غیر رومانٹک تھی۔

ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس نے کس قدر استقلال سے کام لیا تھا۔ شادی کے فوراً بعد وہ اس کو تنہا اپنے ہمراہ لے کر چلا آیا تھا۔ علیحدہ مکان، متوسط گھر کی ہر ممکن آسائش۔ اس کے باوجود اس کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے تھے۔

وہ کہتا "تم کھانا اپنے ہاتھ سے مت پکایا کرو۔ اس کے لئے نوکر رکھ لیتے ہیں۔" لیکن اس نے یہ بات کبھی قبول نہ کی۔ ایک عورت اکثر برتن صاف کر جاتی تھی وہ وقت اس سے زیادہ وہ کسی مرد کی ضرورت ہی نہ سمجھتی تھی۔ اس کو ہمیشہ اس بات کا ڈر لگا رہتا تھا کہ نوکر مزیدار کھانا نہ پکا سکے گا۔ وہ یہ سمجھ نہ سکتی تھی کہ اس کے خاوند کو اگر نوکر کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ہی کھانا پڑا تو پھر اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ آٹا، دالیں، چاول گھی وغیرہ سب نپے تلے طریقے سے خرچ ہوں۔ یونہی بے کار نہ جائیں۔ وہ ماتھے پر ہاتھ

www.taemeernews.com

مار کر کہتا۔ "لیکن کما کر میں لاتا ہوں محنت مجھ کو کرنی پڑتی ہے جب مجھ کو اس بات پہ کوئی اعتراض نہیں تو پھر تو کیوں اس فکر میں مری جاتی ہے۔" کمل منطق سے واقف نہ تھی۔ بحث تو نہ کرتی۔ لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں کبھی نہ آئی کہ آخر شوہر نے یہ کیسی مصلحت ہے۔ کمل کا خیال تھا کہ دھوبی کو سب کے سب کپڑے دینے کی ضرورت نہیں۔ جو کپڑے گھر پہ دھل سکتے ہوں وہ دھوبی کو کیوں دیئے جائیں۔ شوہر یہ بات اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی ہر وقت مہندی رچا کے گدیلوں پہ ایرانی بلی کی طرح بیٹھی رہا کرے۔ اس کو اس کے جسم کی مضبوط اور کھردری جلد ہرگز پسند نہ تھی۔ وہ نازک اور زردی مائل رنگ کی عورتوں کو پسند کرتا تھا۔

یہی نہیں زن و شوہر کے تعلقات وغیرہ پر بھی ان میں اختلاف تھا۔ اس کا سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ ہندوستانی عورت مرد کی محبت کا جواب دینا نہیں جانتی۔ اس معاملے میں وہ اس قدر جاہل اور نا تربیت یافتہ ہوتی ہے کہ پاکیزہ ذوق رکھنے والے خاوند کے حسین تصورات خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ اس کی یہ دلی خواہش تھی کہ ازدواجی زندگی کا ایک خاص پروگرام مرتب ہو۔ ایک ایسی رومانٹک فضا پیدا ہو جائے جس میں نون تیل لکڑی ــــــ جیسے حقائق کا ذکر نہ ہو۔ بس سرمستی ہو، سکون ہو اور رنگ و بو۔ محبت کی امنگیں، دھیمی چنگ و رباب کی تانوں کی پابند ہوں۔ زندگی ایک ورق رنگین بن جائے ــــــ اس نے کتنی مرتبہ سمجھایا۔ "دیکھو! تو محبت بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن تم محبت کے لفظ سے ناآشنا ہو۔ تمہاری نظر تمہارے پاؤں سے آگے نہیں بڑھتی۔ تم نے چیزوں کی غلط اقدار قائم کر رکھی ہیں۔ تمہارا زاویہ ..." پھر سوچنے لگا کہ وہ اتنی گہری باتیں نہ سمجھ سکے گی وہ کہتا "دیکھو جب بھی گھر سے باہر جانے لگوں تو تم سب کام چھوڑ کر باہر

www.taemeernews.com

قریب آجایا کرو۔ تاکہ جانے سے پہلے میں تم کو پیار کر سکوں۔ اور جب میرے آنے کا وقت ہو۔ تو تمہارا پہلا فرض یہ ہے کہ اس وقت منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو۔ اور دروازے پر میرا انتظار کرو تا کہ . . . . . ." اگر وہ یہ باتیں بڑے پیار سے سمجھاتا تو وہ "اچھا جی" کہہ کر نہ دل سے اس بات کا ارادہ کر لیتی اور اگر وہ خفگی سے بات کرتا تو وہ جھنجھلا کر خاموش ہو جاتی لیکن ہوتا یہ کہ وہ بہت کم اس کے حکم کی تعمیل کرنے میں کامیاب رہتی۔ جب شوہر کے آنے کا وقت ہوتا تو ظاہر ہے پیار کرنے کو کس کا دل نہیں چاہتا۔ لیکن اس کو اس بات کی فکر لاحق ہوتی کہ انہیں بھوک لگی ہوگی۔ وہ چائے بنانے لگتی۔ توس سینکتی۔ وقت کا خیال نہ رہتا۔ اتنے میں اس کے شوہر کے پاؤں کی چاپ سنائی دیتی۔ خاوند اپنی بیوی کی محبوب مٹھائی بنگالی رسگلے آبخورے میں لیے اندر داخل ہوتا۔ وہ بھاگی بھاگی جاتی کچھ محجوب سی ہو کر کہتی "جی بھول گئی" یا "جی۔ دیر ہوگئی"۔ پہلے پہل تو اس نے نظر انداز کیا۔ لیکن بعد میں وہ آپے سے باہر ہو جاتا ـــــ کبھی وہ پراٹھے پکانے کے لیے آٹا گوندھتی ہوتی تو وہ پہنچ جاتا۔ وہ آٹے سے بھرے ہوئے ہاتھ لٹکائے ہوئے آتی۔ یہ پوچھتا "ابھی آٹا گوندھا جا رہا ہے۔" کمل شوہر کے لہجہ میں سختی محسوس کرتے ہوئے شرم سے سر جھکا لیتی "جی بھول گئی۔" یہ کہہ کر وہ منہ آگے بڑھا دیتی اور وہ جلدی سے ایک بوسہ جھپٹ کر اندر چلا جاتا۔

اس قسم کی سینکڑوں چھوٹی موٹی باتیں تھیں جو بیچاری کمل کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ ہزار سمجھانے پر بھی وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ شوہر کی آمد پر اس کے ہاتھ پاؤں دھونے کے لیے پانی، کھانے کے لیے توس یا پراٹھے، پینے کیلئے چائے تیار کرنا ضروری ہے یا سج دھج کر آنے والے کو لاڈ دکھانا لازمی ہے۔ وہ اس طرح سوچتی تھی۔ بحث نہ وہ کر سکتی تھی اور

www.taemeernews.com

نہ کرتی تھی۔ کبھی جب وہ چائے کا ٹرے اٹھانے جاتی تو شوہر منہ پھلائے بیٹھا ہوتا۔ وہ غرّا کر کہتا "میں چائے نہیں پیوں گا۔"

وہ سبب پوچھتی۔ وہ کہتا "میں پی آیا ہوں۔"

پہلے پہل اس کا خیال تھا کہ اس کی بیوی اس کی خوشامد کرے گی۔ کہے گی "ناشتا کیجیے۔" واسی سے بھول ہو گئی۔ لیکن وہ ٹرے اٹھا کر لیجاتی۔ اور سب کچھ چپٹ کر جاتی۔ پھر رات کا کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو جاتی۔

اس نے بیوی کو سینما بھی دکھایا تاکہ وہ رومان کا مطلب سمجھ سکے۔ اور اس موقعہ پر جب کہ ہیروئن چھوئی موئی کی طرح سمٹی جاتی اور ہیرو پریم رس میں ڈوبے ہوئے الفاظ کہتا ہوا اس پر جھکا جاتا کمل کو دفعتاً اس چھوٹے کمرے کا خیال آتا۔ جس میں نقدی اور گہنے پڑے تھے "جی میں پوچھتی ہوں چھوٹے کمرے کو تالا لگا دیا تھا آپ نے؟"

اس پر وہ بپھر جاتا۔ بھاڑ میں گیا وہ کمرہ اور اس کے گہنے کپڑے۔ وہ سینما کیوں نہیں دیکھتی۔ کمل بچاری کی عقل بھی کام نہ کرتی۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر تماشہ دیکھتے وقت اپنے گھر کا خیال کیوں نہ آئے۔ تماشہ آخر تماشہ ہے۔

رفتہ رفتہ اس کو اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ اس کی ازدواجی زندگی بہتر نہیں ہو سکتی۔ پہلے پہل اسے نہایت نرمی اور محبت سے کام لینے کی کوشش کی۔ پھر کچھ درشتی سے پیش آنے لگا۔ کبھی وہ ایک ماہر نفسیات کی طرح اپنی بیوی کے خیالات سمجھنے کی کوشش کرتا۔ لیکن سب بے سود۔ خانہ جنگی چھڑی تو وہ گالی گلوچ اور بعض

www.taemeernews.com

اوقات ہاتھ اٹھانے سے بھی باز نہ آتا لیکن بہتری کی صورت نظر نہ آئی۔ آخر کار وہ قطعاً ناامید ہو بیٹھا۔ وہ بیوی اور اپنے گھر سے لاپرواہی برتنے لگا۔ صبح کھانا کھا کر وہ دفتر کو چل دیتا۔ شام کو چائے پینے کے بعد بیڈمنٹن کھیلنے کے لیے کلب کی راہ لیتا۔ راتیں رنگ رلیوں میں گذرنے لگیں۔ ادھر اس کی بیوی نے بھی کسی قسم کی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہتی۔ کبھی کبھی گیت گنگناتی کبھی اڑوسیوں پڑوسیوں کے ہاں بیاہ شادی کے موقعہ پر ڈھولک بجا بجا کر گاتی۔ کبھی منڈیر پر بیٹھی مداری کا تماشہ دیکھا کرتی۔

شوہر زندگی سے بیزار ہو گیا۔ اس کی صورت سے وحشت ٹپکنے لگی۔ وہ اپنی دانست میں دیوداس بن گیا۔ دکھ کے اب دن بیتت ناہیں ... شراب پیتا، رقص و سرود کی محفلوں میں شامل ہوتا۔ بازار حسن میں کوٹھوں پر راتیں بسر ہونے لگیں۔ لباس سے بے پرواہ، مستقبل سے ناامید، نفس کی آمد و رفت سے متنفر ..... جیسے اس کو بہت بڑا حادثہ پیش آیا ہو۔

بیوی گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں مگن رہتی اگر وہ اس کو زیادہ دق کرتا تو رو دیتی، اس کے بعد اپنا منہ سے سے نہا دھو کر پھر نئی نویلی بن بیٹھتی۔ گھر کی چیزیں بنائے جا رہی تھی۔ بستروں کی چادریں تیار کی جا رہی ہیں۔ غلافوں پر پھول کاڑھے جا رہے ہیں۔ میز پوش میں جالی بنی جا رہی ہے۔ شوہر کی پگڑیاں رنگی جا رہی ہیں۔ بڑے اہتمام سے لیمو اور آم کا اچار ڈالا جا رہا ہے۔ محلے کی عورتوں سے اچھے بہانے پر لڑائی جھگڑے مول لے کر پھر چکائے جا رہے ہیں۔ وہ زندگی کے دن اس طرح بسر کر رہی تھی جیسے کوئی خاص بات پیش نہ آئی ہو جیسے جو کچھ ہو رہا تھا۔ بالکل اس کی امیداں

www.taemeernews.com

کے مطابق......

ایک مرتبہ جب وہ آدھی رات کے وقت گھر لوٹا تو اس کی بیوی جاگ رہی تھی وہ حسبِ معمول اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ جب بیوی نے کھانے کے لئے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ کھانا باہر سے ہی کھا کر آیا تھا۔ اس پہ بیوی نے نرم لہجہ میں احتجاج کیا۔ بات معمولی تھی۔ لیکن وہ طیش میں آ گیا۔ منہ سے کف اڑنے لگی۔ "تو میرے پچھلے جنم کی دشمن ہے۔ میرے نصیب پھوٹ گئے۔ اب میرا کوئی نہیں۔ میرے لئے گھر اور ویرانہ ایک برابر ہے یہ میرے کرموں کا پھل ہے کہ تو مجھ کو ملی۔ میں تیری صورت سے بیزار ہوں۔ اور تو اس قدر ڈھیٹ ہے کہ نہ تو مرتی اور نہ اس گھر سے منہ کالا کرتی ہے۔ تاکہ میری جان تو چھوٹے عذاب سے۔"

کملا زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ اس وقت میں پڑوسیوں کے کانوں تک شور پہنچنا بھی مناسب نہ تھا۔ اس لیے وہ معاملے کو رفع دفع کرنے کے لئے زبان بند کئے خاموش رہی۔ لیکن شوہر پہ تو بھوت سوار تھا۔ "کمبخت تو جانتی ہے کہ تیرے پھوہڑ پن نے میری زندگی پہ کیا اثر ڈالا ہے۔ اب میں شراب پیتا ہوں۔ ناچ گانا سنتا ہوں۔ اور...... اور...... اب میں زنا بھی کرتا ہوں۔ سمجھی؟ آج تجھکو بتائے دیتا ہوں۔ تو نے میری تمناؤں کا خون کیا۔ میرا گھر برباد کیا۔ تو نے مجھ کو شراب کی پناہ لینے پر مجبور کیا۔ تو نے مجھ کو بازاری عورتوں کے گھر کا رستہ دکھایا۔"

اس کا خیال تھا کہ یہ باتیں سن کر اس کی بیوی کے پاؤں تلے سے زمین نکل جائے گی اور وہ شدتِ غم سے بیہوش ہو کر گر پڑے گی...... لیکن اس کی بیوی نے

www.taemeernews.com

سب باتوں کے جواب میں تھالی اٹھائی اور چلی گئی۔

وہ ذہنی اذیت میں مبتلا کمرے میں وحشی درندے کی طرح ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ باہر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ گلی میں بتی کے نیچے کھیل رہے تھے۔ کبھی ایک دوسرے پر لپکتے ہوئے چاندنی میں نظر آنے لگتے اور کبھی دیوار کے سائے تلے چھپ جاتے۔ وہ یونہی دبے پاؤں باورچی خانے کی طرف گیا۔ چپکے سے جھانک کر دیکھا کہ اس کی بیوی خلاف امید روٹی کھا رہی ہے۔ اس کو اطمینان سے روٹی کھاتے دیکھ کر وہ اور بھی جل بھن گیا۔ اس کو کچھ نہ سوجھتا تھا۔ وہ جھلایا ہوا واپس کمرے میں آیا اور اپنا سر دونوں ہاتھ میں تھام کر کرسی پر گر پڑا۔

دن گزرتے گئے۔

گرمیوں کا موسم دوپہر کے وقت وہ اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ معاً شور وغل سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ عورتوں کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کی بیوی کا پڑوسیوں سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ عین اس وقت جب کہ جنگ زوروں پر تھی۔ وہ جاگ اٹھا۔

"ادھر سے آواز آئی" ..... اور وہ جو تمہارے بابوجی گانا سننے جاتے ہیں۔ بازاری عورتوں سے پریم بڑھاتے ہیں..... کیا یہ شرافت ہے؟"

اس کی بیوی چمک کر بولی" تو اس میں بدمعاشی کی بات کیا ہے۔ سبھی مرد ایسا کرتے ہیں..... لیکن تم کو آگ کیوں لگی۔ کیا تمہاری لڑکی کو اٹھا لائے تھے۔ یا جن کے پاس وہ جاتے ہیں تم ان کی سوکن ہو؟ آخر کیوں جلی مرتی ہو تم؟"

"مر جاؤ نہ شرم سے ...... لے دے کے یہ رہ گئی شرافت!"

اب لڑائی اور تیز ہو گئی۔ اس کی بیوی چیخ کر چلائی: "جب تم ہی شرم کے مارے نہ مریں تو میں کیوں مروں؟ کیا تیرے باپ کا دیا کھاتی ہوں!"

عورتوں کی لڑائی میں بھی خاص گُر برتے جاتے ہیں جو عورت دوسری کے زیادہ سے زیادہ عیب جانتی ہو وہی بازی لے جاتی ہے۔

پڑوسن نے ٹھہرا ٹھہرا کر آواز میں کہا: "ہائے کیا شرم ... ہم نے کیا بدمعاشی کی؟"

"بدمعاشی؟ ...... وہ لمبے لمبے پٹوں والا جو تمہاری زندگی میں سب سے بات ... آتا ہے کون ہے؟ ہم کو بھی تو معلوم ہو۔ اور وہ جو تمہاری چندا بھاگ گئی تھی موٹر ڈرائیور کے ساتھ ...... اور جناب دو رات کلچھرے اڑانے کے بعد آئی واپس ......"

پڑوسن کی یہ سب سے زیادہ دکھتی رگ تھی۔ اس بات پر تو وہ رونی ہو گئی۔

"تو جو ہے نا بدمعاش ...... سب کو دیتی کچھ سمجھو گی ...."

معلوم ہوتا ہے اس وقت پڑوسن کے شوہر باہر نکل آئے۔ وہ ناک میں بولتے تھے نہ معلوم انہوں نے ناک میں گنگنا کر کیا کہا۔ اس کی بیوی نے بھی کچھ جواب دیا۔ تب بابو ذرا بلند آواز میں بولا: "گوں نارش ہے نہیں کہ آخر آپ ...."

اس پر اس کی بیوی کو اور طیش آیا: "خبردار! جو تو نے عورتوں کی لڑائی میں دخل دیا۔ یہ گوں نارش اپنی میا سے کیجیو جاکر وہ اندر سوتے پڑے ہیں۔ ابھی جگا دوں تو سر پہ وہ جوتے پڑیں کہ ایک بال نظر نہ آئے چندیا پہ ......"

اس پر پڑوسی نسبتاً دھیمی آواز میں بڑبڑ کرتے اندر گھس گئے۔ اور اس کی بیوی پہلے تو زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی آئی۔ لیکن اس کے کمرے میں سے ...

www.taemeernews.com

پاؤں گذر گئی تاکہ اس کی نیند خراب نہ ہو۔ تھوڑی دیر بعد کپڑا سینے کی مشین چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔

وہ آنکھیں موندے لیٹا رہا۔ گھڑی پر نظر پڑی۔ ساڑھے پانچ ہو چکے تھے۔ سات بجے گرانڈ ہوٹل میں پارٹی تھی۔ پروگرام یہ تھا کہ شراب کے دور کے بعد کھانا بھی ہوٹل میں کھایا جائے۔ اور پھر گانا بیگم کا گانا سنا جائے۔ اچھا ہوا جو اس کی آنکھ کھل گئی۔ ورنہ نامعلوم وہ کب تک پڑا سویا رہتا۔

نہا دھو کر وہ بڑے آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بالوں پر برش پھیرنے لگا۔ قریب اس کی بیوی چٹائی پر بیٹھی کپڑے سی رہی تھی۔ وہ حسب معمول خاموش تھا۔ لاتعلقی سے اپنے بال سنوار رہا تھا۔ معاً اس کو کپڑے دیکھ کر تعجب ہوا...... بچے کے کپڑے؟ کتنے عرصے سے اس نے اپنی بیوی کی طرف نظر بھر کر بھی نہ دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ اس کے کام چھوٹا نوکر کرتا۔ وہ اپنے گھر سے بے خبر دن گذار رہا تھا۔ نہ اس نے کبھی بیوی کی طرف توجہ دی۔ نہ اس کو بات چیت کا موقعہ دیا۔ اس کی بیوی دراصل بچے کی ماں ہونے والی تھی۔ آج تک وہ اس بات سے بے خبر تھا۔

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پہلے وہ درمیانی دروازے کے پردے کو احتیاط سے پھیلا دیا کرتا تھا۔ لیکن اب کے وہ پردہ پھیلانا بھول گیا۔ موزے پہننے کے بعد اس نے بوٹوں کے تسمے باندھے۔ جب ٹائی کو گرہ دینے لگا۔ تو آئینے میں اپنے لبوں پر موہوم سی مسکراہٹ دکھائی دی۔ وہ پھرتی سے قدم اٹھاتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور سائیکل پر سوار ہو کر بازار کی طرف چل دیا۔

ہوٹل کے باہر وہ ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ وہ کچھ شش و پنج میں تھا۔ اگر صرف

www.taemeernews.com

آج کے دن وہ پارٹی میں شامل نہ ہو تو اس میں حرج ہی کیا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ایک مرتبہ ہوٹل میں داخل ہو گیا تو دوست اس کو ہرگز نہ آنے دیں گے۔

اتنے میں پیارے لعل آتا دکھائی دیا۔ قریب پہنچکر وہ دونوں حسب معمول بغل گیر ہو گئے "میرے یار! اس جگہ کیوں کھڑے ہو چلو نا اندر"

اس نے معذرت چاہی کسی بہانے گھڑے۔ بڑی مشکل سے جان چھوٹی۔ اس نے پیارے لعل کو سمجھا دیا کہ وہ اس کی طرف سے دوستوں سے معافی مانگ لے۔ پیارے لعل اس سے دوسرے دن کا وعدہ لیکر چلا گیا۔

اس کام سے فرصت پانے کے بعد وہ ایک معزز اور ذمہ دار شخص کی طرح ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔

رات ہو گئی۔ اس نے گھر کو واپس جانے کی ٹھانی۔ ہاتھ میں رس گلوں کا آبخورہ لئے جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کی بیوی اس وقت چھت پر خشک کپڑے جمع کر رہی تھی۔ وہ اندر چلا گیا۔ آبخورہ ریڈیو کے پاس تپائی پر رکھ دیا۔ مشین کے قریب دو سلے کپڑے پڑے تھے۔ وہ ان کو اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ دفعتاً اس کی بیوی اندر داخل ہوئی۔ اس نے فوراً کپڑے پھینک دیئے۔ اس کا ایک ہاتھ مشین کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور دوسرا آبخورے کی طرف۔ وہ ہکلا رہا تھا۔ بیوی کی اچانک آمد سے وہ اس قدر گھبرا گیا کہ کچھ کہہ نہ سکا۔

اس کی بیوی نے اتنے دنوں کے بعد اس کے پھیلے ہوئے بازو دیکھے تو اسکے چہرے پر خون کی سرخی جھلکنے لگی محجوب ہو کر بولی "جی میں بھول گئی ۔ ۔ ۔ ۔"

اس نے صابن دانی اٹھائی اور تولیہ جھپٹ کر سیٹی بجاتا غسل خانے کی طرف لپکا۔

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

بیمار

محض بارش ہوتی تو خیر مشکل تو یہ تھی کہ ہوا بھی چل رہی تھی۔ اس قدر تیز و تند کہ انسان کے پاؤں زمین سے اکھڑ جائیں۔ ہوا کی تیزی کی وجہ سے پانی کی بوندیں بھی ترچھی ہو کر بھالوں کی طرح گر رہی تھیں۔ جلدی جلدی کھانا کھانے کے بعد وہ کپڑے پہن چکا تھا۔ اور اب بے صبری سے کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا کہ بارش تھمے تو وہ دفتر کو چلے۔ لیکن بادل تھے کہ گھر گھر کر چلے آتے تھے۔ چھاجوں پانی برس چکا تھا اور ابھی ایسے برسے جا رہا تھا جیسے آج برس کر پھر کبھی نہ برسے گا۔

وہ جانتا تھا کہ آج وہ بروقت گھر سے چلے تاکہ دفتر میں پہنچ کر منیجر کی کٹی جلی باتیں نہ سننی پڑیں۔ دو دن سے اسے دیر ہو رہی تھی۔ ایک دن کھانا بروقت نہ پک سکا۔ دوسرے دن اس کی قمیص میں بٹن ہی نہ ٹنکے تھے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا قصور دراصل اس کے چڑچڑے بچے کا تھا لیکن اس نے غصہ میں آکر بیوی کی پیٹھ پر ایک دھول جما دی۔ اور آج بارش نے آن لیا۔ بوندوں کے شور اور ہوا کی سنسناہٹ میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ گلی میں پانی کی چھوٹی موٹی لہریں سانپ کی سی تیزی کے ساتھ اِدھر اُدھر لپکی جا رہی تھیں اس پر طرہ یہ کہ محلہ بھر کے مکان نے پرنالوں سے پانی کے گرنے کا شور۔ بارش میں شرابور کتے دم دبائے گوشوں میں دبکتے پھرتے تھے۔

آخر کھڑے کھڑے گھر پہ ہی دس بج گئے۔ وہ چھتری لیکر نیچے اترا۔ سائیکل ڈیوڑھی

www.taemeernews.com

سے نکال کر گلی میں کھڑی کی اور پھرتی سے چھتری کھول کر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ ہوا کے ایک ہی تند جھونکے سے چھتری کی کمانیاں اُلٹ گئیں۔ اس مضحکہ خیز صورت میں چھتری ادھ کھلے پھول کی طرح نظر آنے لگی۔ وہ سائیکل سے اترا۔ چھتری کو پھر سے درست کر کے سائیکل پر بیٹھا۔ پیڈل پر زور ڈالا ہی تھا کہ چھتری کی کمانیاں پھر الٹ گئیں۔ وہ ڈیوڑھی کے اندر چلا آیا۔ چھتری بیوی کے ہاتھ میں تھما دی اور بلا چھتری کے جانے کی ٹھانی۔ سب سے نیچے اس کے بدن پر ایک بنیائن تھی۔ اس کے اُوپر ایک پرانا سویٹر۔ اس پر قمیص۔ اور قمیص پر اس نے بند گلے کا سویٹر پہن لیا۔ گرم کوٹ کے کالر دہرے کر کے پن لگا دی تاکہ سینہ سرد ہوا سے محفوظ رہے۔ ٹوپی پر رومال باندھ لیا۔ سائیکل پر سوار ہو کر یا علی! کہہ کر اس نے زور لگایا۔ پہیے چرخ چوں کر کے گھومے۔ اور جب تک وہ گلی کے موڑ پر نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ اس کی بیوی کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں دروازے کی دراڑ میں سے جھانکتی رہیں اور اس کے دوپٹے کا میلا آنچل دروازے میں سے باہر نکل نکل کر لہراتا رہا۔

بادل جھکے پڑتے تھے۔ بوندوں کی تاریں سی بندھ گئی تھیں۔ بارش کی بوچھاڑ اور جھڑی میں انسان دو ترک دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ کڑاکے کی سردی جگر تک اُترتی چلی جاتی تھی۔ بارے بنک کی بلند عمارت کی دیواریں نظر آنے لگیں۔ سرمئی رنگ کے بڑے بڑے چکنے پتھر پانی میں بھیگے ہوئے ایسے دکھائی دیتے تھے۔ جیسے عظیم الجثہ کچھوے قطار اندر قطار اُوپر تلے دھرے ہوں۔ وہ سائیکل اٹھا کر جلدی سے بڑے دروازے کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ پانی میں تر بتر ہو گیا تھا۔ ٹوپی بھیگ کر سکڑ گئی۔ مونچھیں گیلی ہو کر نیچے بیٹھ گئیں۔ کپڑے تر ہو کر کالے سے نظر آنے لگے تھے۔ بوٹ علیحدہ پھٹ پھٹا رہے تھے۔ سردی

www.taemeernews.com

کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ناک سے پتلی رطوبت بہ رہی تھی۔ انگلیاں بالکل بے جان۔ کان سرخ اور ناخن ہلکے نیلے رنگ کے ہو گئے تھے۔

دفتر دوسری منزل پر تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ ایک کلرک اوپر سے نیچے آ رہا تھا۔ "ہلو عارف! آج منیجر صاحب بھرے بیٹھے ہیں۔"

یہ سن کر عارف کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ٹوپی کو ہاتھ پر پے درپے ٹھنیاں دیں۔ رومال نچوڑ کر کوٹ پر پھرایا اور پھر دبے پاؤں دفتر میں داخل ہوا۔ دعا مانگ رہا تھا خدایا! منیجر اپنے کمرے ہی میں ہو لیکن اس کی دعا قبول نہ ہوئی۔ منیجر دفتر کے بڑے کمرے میں کھڑا تھا۔ وہ چپکے سے لپک کر اپنی اونچی کرسی پر جا بیٹھا۔ رجسٹر اٹھا کر ادھر ادھر رکھنے لگا۔ اپنے گیلے کپڑوں اور بھیگے ہوئے جوتوں کے سبب وہ عجیب بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ —بنک کے کلرکوں کے لئے کوئلوں کی انگیٹھیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ منیجر ٹلے تو وہ دہکتے کوئلوں کی انگیٹھی ٹانگوں کے درمیان رکھ لے۔

دفعتاً منیجر مڑا۔ وہ کچھ لمبا اور اکہرے بدن کا شخص تھا۔ ادھیڑ عمر، سڑیل مزاج۔ اس کے چہرے سے خشونت کے آثار ہویدا تھے۔ "تم آج پھر پون گھنٹہ لیٹ ہو۔"

وہ خاموش رہا۔ "کل اور پرسوں بھی تم دیر سے آئے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے۔ ماشاء اللہ جوان ہو۔ کماتے کھاتے ہو۔ پڑھے لکھے ہوشمند ہو۔ آخر تم کو اپنی ذمہ داری کا احساس کیوں نہیں؟"

وہ ذمہ داری کے احساس سے معرا تو نہ تھا— اس نے دبی زبان میں بارش کا عذر پیش کیا۔

اس پر منیجر آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے بہت لعنت ملامت کی۔ پھر اس نے دیر سے آنے کی وجہ کا تحریری جواب مانگا۔ اس پر عارف کو بہت خوشامد کرنی پڑی اور ہاتھ جوڑنے

www.taemeernews.com

پڑے۔ وہ تحریری بیان دینے سے کتراتا تھا کیونکہ اس طرح اس کا ریکارڈ خراب ہو جاتا۔ بڑی مشکل سے مینجر نے اس کو معاف کیا اور وہ مینجر کے کمرے سے نکلا تو اسکی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں طبیعت مضمحل تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سب لوگ اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ چپ چاپ اپنی کرسی پہ بیٹھ گیا اور بلا کسی سے آنکھ ملائے اس نے دیکھتے ہوئے گوشواروں کی انگیٹھی اپنے قریب گھسیٹ لی۔

پندرہ بیس منٹ بعد اس کے حواس درست ہوئے۔ اس نے چپکے سے چپڑاسی کو بازار بھیج کر چائے کا پیالہ منگوایا۔ اور جب طبیعت قدرے بحال ہوئی تو رجسٹروں کی ورق گردانی کرنے لگا۔ دراصل آج کام کرنے کا دن نہ تھا۔ ہندوستان میں بادل کی آمد خوشی اور کھیل تماشے کی تمہید سمجھی جاتی ہے۔ یا پھر سردیوں کی برسات میں انسان لحاف میں گھسا مال پوے کھائے۔ اور کہاں یہ چالیس پچاس روپے کے لئے کڑاکے کی سردیوں میں بجلی کی روشنی میں آنکھیں پھوڑو۔ دن کے وقت بجلی کی روشنی میں کام کرنا سب سے بڑھ کر آفت تھی۔ اس پہ اس کا بہت ہی برا ردعمل ہوتا تھا۔ پیشانی بھاری محسوس ہونے لگتی اور آنکھوں میں تکان آمیز درد۔ جب تک تیزی سے بارش ہوتی رہی۔ بنک میں کوئی متنفس نظر نہیں آیا۔ ادھر بارش تھمی اور آدھمرے گاہکوں کی آمد شروع ہوئی۔ اور پہلا ریلا ہی جو آیا تو ان کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ دوسرے روز بنک میں چھٹی تھی اس لئے بھیڑ اور بھی زیادہ ہو گئی۔

وہ سیونگ فنڈ کی کھڑکی پہ مقرر تھا۔ چیک پر چیک چلے آتے تھے۔ اور اس پہ ہر ایک کا یہی تقاضا تھا کہ صاحب جلدی سے پاس کروا کر خزانچی تک پہنچوا دیجئے۔ ہر ایک کو یہی شکوہ تھا کہ بنک میں کام درست نہیں ہوتا۔ خدا خدا کر کے اس کی کھڑکی کے آگے سے بھیڑ کم ہوئی اتنے

www.taemeernews.com

میں ایک کالجیٹ آگے بڑھا۔ "کیوں صاحب! آپ نے میرا چیک آگے بھیجدیا؟"

"جی ہاں! بھیجدیا۔"

اتنے میں ایک اور نوجوان چیک لئے ہوئے آیا۔ اور اخاہ کا نعرہ لگا کر بیٹ سے بغلگیر ہوگیا۔ علیک سلیک کے بعد پہلے نے پوچھا۔ "یار ڈیوڈ! پچھلے دنوں کی چھٹیوں میں کہاں غائب ہوگئے تھے۔۔۔ تم تو چھٹیوں کے علاوہ پندرہ دن اور روپوش رہے۔"

ڈیوڈ نے کھڑکی میں سے چیک بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بھئی کچھ نہ پوچھو۔ بتا دوں تو ہنسو گے۔"

دونوں خوش پوش، بے فکرے اور کھاتے پیتے نوجوان دکھائی دیتے تھے۔ عارف نے ٹوکن کا نمبر لکھ کر ٹوکن کھڑکی میں رکھ دیا۔ ڈیوڈ نے اپنی ہنستی ہوئی آنکھوں سے اسکی طرف دیکھا۔ "تھینک یو۔"

ڈیوڈ کا دوست اصرار کر رہا تھا۔ "قسم خدا کی مذاق نہیں اڑاؤں گا۔"

"تو سنو یار! مسوری گیا تھا میں۔"

"مسوری؟ اس قدر شدت کی سردی میں کیا دھرا تھا اس جگہ۔"

"ارے کمبخت! تم کیا جانو ان باتوں کو۔"

اس کے بعد ڈیوڈ نے بتایا کہ وہ مسوری میں برف گرنے کا تماشہ دیکھنے گیا تھا۔ اس کو اس بات کا بڑا اشتیاق تھا۔ دراصل وہ ایک برات میں دہرہ دون گیا تھا۔ اس نے پہاڑوں کے سلسلے برف سے ڈھکے ہوئے دیکھے تو۔۔۔۔ "برات والوں سے رخصت لیکر میں نے بازار سے چند ضروری اشیا خریدیں۔ مچھلی کے بند ڈبے، مکھن، ڈبل روٹیاں، بسکٹ، خشک میوے، منجمد دودھ کے دو بڑے ڈبے۔ اور آخر میں وہ "نونگی"۔۔۔۔ دوسرے دن

www.taemeernews.com

علی الصبح بستر اور کپڑوں کا سوٹ کیس تانگہ پر رکھ کر موٹروں کے اڈے پر پہنچا۔
تو ایک گھوڑے کا انتظام کیا۔ راجپورہ عین دامن کوہ میں واقع ہے
اسی جگہ سے مسوری کی چڑھائی شروع ہوتی ہے جس دکان سے چائے پی اس نے بتایا کہ
مسوری سے دو میل ادھر یعنی بارلوگنج سے برف پڑنی شروع ہو جاتی ہے! اسلئے گرم
کپڑے پہن کر چلنا چاہیئے۔ گرم کپڑے تو خیر میں نے پہن ہی رکھے تھے۔ مزید احتیاط کے
طور پر دستانے، اوورکوٹ اور ایک شیشی میں "نورنگی" بھر لی۔۔۔ "نورنگی" سمجھے نا؟ پاؤ
ڈیڑھ پاؤ خشک میوہ جات از قسم کشمش، خوبانی، مغز اخروٹ وغیرہ اوورکوٹ کی جیب میں
بھر لئے۔ مجھے یہ بھی اطلاع ملی کہ وہاں ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہیں۔ تم جانتے ہی ہو میں گرمیوں
میں مسوری جایا کرتا ہوں۔ سوچا کوئی نہ کوئی ٹھکانہ ڈھونڈھ نکالوں گا۔

ڈیوڈ کا دوست ہمہ تن گوش تھا۔ ڈیوڈ اپنا قصہ اس قدر مزے لے کر بیان کر رہا
تھا کہ عارف خود اسی کی طرف کان لگائے تھا۔

"شاید تم کو معلوم ہو، راجپورہ اور مسوری کے درمیان ایک مقام جھڑی پانی ہے
اس جگہ میں نے ایک دکان سے جو اتفاق سے کھلی تھی چائے تیار کروا کر پی اور دم لے کر
آگے بڑھا۔ اور بھئی جب بارلوگنج پہنچا تو قسم سے جی خوش ہو گیا۔ اب تم سے کیا بیان
کروں۔ گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ شاہ درخت خاموش کھڑے تھے۔ ایک طرف
پہاڑی دوسری جانب سڑک کے کنارے کنارے پتھروں کی بنی ہوئی ڈھائی تین فٹ کی دیوار
دیوار کے ادھر انواع و اقسام کے پودے اور جنگلی جڑی بوٹیاں اور گہری کھائیاں اور
کھڈ۔ پھر تا حدِ نگاہ پہاڑوں کے خوشنما سلسلے۔۔۔۔۔۔ اس جگہ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ
برف گرتی دیکھی۔ بس یوں سمجھ لو جیسے روئی کے گالے۔ سپید، پاکیزہ، ہلکے پھلکے دودھیا رنگ

www.taemeernews.com

کے پھول سے جیسے فردوس کی حوریں ٹوکریاں بھر بھر کر یہ پھول دنیا والوں پر پھینک رہی ہوں ..... میں گھوڑے پر سوار تھا۔ گھوڑے نے بھی کنوتیاں ہلائیں۔ اور مڑ مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے بعد پرسکون فضا میں جہاں اس وقت ایک چڑیا تک نہ بولتی تھی، میں نے گھوڑے کو کچھ دیر تک روکے رکھا اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

جب مسوری ایک میل رہ گیا تو میں نے بجائے لنڈور کی طرف جانے کے کلڈی بازار کی طرف گھوڑے کی باگ پھیر دی اور بالکل میجسٹک سینما کے پاس جا نکلا۔ اب تم سے کیا کہوں؟ جدھر نگاہ اٹھاؤ برف ہی برف۔ عمارتیں برف سے اس قدر ڈھکی ہوئی تھیں کہ چھتیں تک دکھائی نہ دیتی تھیں۔ کہاں وہ چہل پہل اور گہما گہمی اور کہاں یہ پراسرار خاموشی۔ ـــــ رکشاؤں اور پہاڑی ٹٹوؤں کے اڈے، بازار، سینما، دکانیں غرض ہر جگہ سنسان۔ جیسا کہ ہم لوگ قصوں میں پڑھا کرتے تھے کہ جب آدم خور دیو کی آمد آمد ہوتی تو لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ میں روائتی ہیرو شہزادے کی طرح گھوڑے پر سوار تن تنہا بازار میں سے گذرنے لگا۔ دل میں کرید پیدا ہوئی کہ آخر ٹھکانہ کس جگہ ہوگا۔ کوئی دکان یا ہوٹل کھلا نظر نہ آتا تھا۔ میں الفا ہوٹل کی نیت سے وہاں گیا تھا۔ قلیوں کو بھی اسی جگہ پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ لیکن جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ہوٹل کا بڑا پھاٹک بند ہے۔ بلند آواز میں پکارا۔ لیکن جواب ندارد۔ ہوٹل کا پھاٹک بڑی سڑک پر واقع تھا۔ پھاٹک سے ہوٹل کی عمارت تک ایک ہموار سڑک چلی گئی تھی۔ ہوٹل کی عمارت پچاس ساٹھ قدم پرے بلندی پر پُرشکوہ انداز میں کھڑی تھی۔ اسی ادھیڑبن میں تھا کہ بڑی سڑک پر سایہ دکھائی دیا۔ برف کے گرتے ہوئے تودوں میں سے کسی آدمی کو پہچاننا بھی دشوار تھا۔ سمجھا قلی آن پہنچے۔ لیکن جب وہ شخص قریب آیا تو معلوم ہوا کہ قلی نہیں بوری اوڑھے کوئی اور ہی شخص تھا۔ اس نے آتے

www.taemeernews.com

ہی پھاٹک میں لگے ہوئے تالے کو کھولا اور اندر جانے لگا تو میں نے بات چیت شروع کر دی۔ معلوم ہوا کہ ہوٹل بند ہے۔ میں نے اس کی منت بھی کی بھائی کوئی ٹھکانہ بتا دو۔ لیکن اس نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ آگے بڑھ کر پانچ روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے کہا مجبوری ہے ہم رشوت نہیں لیتے مالک کے حکم سے ہوٹل کھولنے کی اجازت نہیں۔ سب کمرے بند ہیں۔ نکڑ والے کمرے کی چابی میرے پاس ہے۔ میں نے مزید رعب جمانے کے لئے کہا بھائی! ہم تو ہمیشہ اسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ چنانچہ اب بھی اسی بھروسے پر چلے آئے ــــ

میرے خیال میں مالک نے بھولے بھٹکے مسافر سے روپیہ وصول کرنے کے لئے اسے ایک کمرے کی چابی دے رکھی ہوگی اور نوکر اپنے ٹکے کھرے کرنے کے لئے اسی شخص کو جگہ دیتا ہوگا جو اسے رشوت دے ــــ کمرا خوب سجا ہوا اور آرام دہ تھا۔ دراصل دو کمرے تھے۔ ایک بہت بڑا کمرا اس کے پیچھے ایک چھوٹا کمرہ۔ باتھ روم وغیرہ۔ اس کے علاوہ کمرے کے آگے برآمدہ۔ اس جگہ سے پہاڑوں کا نظارہ خوب تھا۔ اس لحاظ سے دو روپے یومیہ کرایا بہت کم تھا۔ . . . ."

یہ کہہ کر ڈیوڈ خاموش ہو گیا۔ اور اس کے ساتھی نے اندر جھانک کر پوچھا "کیوں صاحب چیک پاس ہو گیا کیا؟"

عارف کچھ پریشان سا ہو کر بولا "جناب! میں اپنا فرض پورا کر چکا ہوں۔ اکاؤنٹنٹ صاحب کے دستخط ہو جائیں تو چیک آگے بھیجا جائے۔"

اس پر اسے بہت طیش آیا۔ ہندوستانیوں کی نا اہلیت پر لکچر دے ڈالا۔ پھر ڈیوڈ کی طرف مخاطب ہو کر بولا "یار تمہارے دن اچھے کٹ گئے۔ کے روز ٹھہرے وہاں۔"

www.taemeernews.com

ڈیوڈ نے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ارادہ تو یہی تھا کہ چار پانچ روز کے بعد واپسی کا بگل بجے لیکن بائیس دن تک بجتا رہا۔"

"کیوں کیا کوئی خاص بات پیش آئی؟"

"ہاں یار بڑے مزے کی بات تھی۔"

"بھئی ہم بھی تو سنیں۔"

ڈیوڈ نے اپنے ساتھی پر فاتحانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "غالباً تیسرے روز کا ذکر ہے۔ بعد از دوپہر چار بجے کے قریب میں برآمدے میں آرام کرسی بچھائے بیٹھا تھا قریب ہی ایک چھوٹی تپائی دھری تھی۔ میں "نورنگی" کا ایک پیگ پینے کے بعد بیٹھا انڈوں کے ٹکڑے کھا رہا تھا۔ برف کے تودے حسب معمول گر رہے تھے ـــــ گرمیوں کے دن ہیں زیادہ رونق کتاب گھر پر ہوتی یا کلڑی بازار میں عورتوں کے جھرمٹ دکھائی دیتے تھے۔ ایک طرف طرحدار عورتیں آرائش جمال کے بعد بازاروں میں ہما ہما کر نکلتیں ـــــ دوسری جانب تماشائیوں کا ہجوم بظاہر اپنے کاموں میں مصروف ـــــ اس طرف جوہریوں کی دکانیں اُدھر فوٹو گرافروں کی۔ ادھر سجی سجائی دکانوں میں خرید و فروخت ہو رہی تو اُس طرف ہوٹلوں میں کاک ٹیل پارٹیوں کے ہنگامے ـــــ یورپین ہندوستانی پہاڑی سبھی لوگ نظر آتے تھے۔ رکشاؤں کی بھی خوب ریل پیل ہوتی۔ اور پھر گھوڑوں اور ٹٹوؤں کی بھرمار ـــــ کبھی گرجے کے دلکش گھنٹے بج اُٹھتے یہی وہ مقام تھا جہاں سے سامنے پھیلی ہوئی وادی میں شہر دہرہ دون کی عمارتیں حقیر کنکر پتھروں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ اور پھر رات کو سونے پر سہاگہ ہو جاتا۔ سوری دلہن کی طرح آہستہ آہستہ نظر آنے لگتی یہی تو اسے "پہاڑیوں کی ملکہ" کہا جاتا ہے ـــــ کہاں وہ نظارے اور کہاں

www.taemeernews.com

یہ منظر کہ ہر طرف ہُو کا عالم ہے۔ روئی کے گالے گر رہے ہیں۔ کوئی دکان کھلی ہوئی نہیں کوئی روشنی دکھائی نہیں دیتی، کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہر طرف زندگی کے آثار مفقود ہیں۔ گرجے کی باوقار عمارت برف تلے دبی جاتی ہے۔ ہر شے پر سفید روغن سا پھر گیا ہے سنسان بازار اور عمارتیں بہت پراسرار نظر آتی ہیں۔ یہ ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ ہلکے سرور میں میں ان نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کہ اتنے میں دور سے چند متحرک سائے نظر آئے۔ تعجب ہوا۔ سائے بڑھتے ہوئے جب بالکل قریب پہنچے۔ تو میں نے جھک کر دیکھا کہ کوئی پورا خاندان کا خاندان چلا آ رہا تھا۔ سوچا کوئی ہمارے ہی ساتھی ہیں برف دیکھنے کے شیدائی ـــــ میری نگاہیں ان کا تعاقب کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ پھاٹک میں سے گذر کر ہوٹل کی طرف بڑھے۔

وہ لوگ تھکے ماندے قدم اٹھاتے میرے قریب پہنچے۔ مجھ سے پوچھنے لگے یہاں کوئی کمرا خالی ہے۔ میں نے آگے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ نوکر سے دریافت کر لیجئے وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔ صورت سے عیسائی معلوم ہوتے تھے۔ کچھ مبہم سا خیال تھا کہ جو صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے تھے ان کو پہلے بھی کسی جگہ دیکھا تھا۔

جب وہ لوگ برآمدے کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔ تو نوکر باورچی خانے میں سے باہر نکل آیا۔ اور وہ بات چیت کرتے ہوئے لوٹ آئے۔

نوکر نے قطعی انکار کر دیا۔ ہر چند انہوں نے بہت اصرار کیا۔ لیکن دراصل نوکر لاچار تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کے بعد وہ صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر بولے "جناب آپ ہی اس کو سمجھائیے"۔ میں نے جواب دیا "لیکن صاحب! درحقیقت نوکر بے بس ہے"۔ اب وہ صاحب انگریزی زبان میں کہنے لگے "ذرا غور فرمائیے۔ میرے ہمراہ چار بچے

www.taemeernews.com

ہیں۔ آخر ان کو لیکر کہاں جاؤں۔ سچ عرض کرتا ہوں سارا بازار بند ہے۔ نہ کوئی دوکان کھلی ہوئی ہے اور نہ کوئی ہوٹل۔ اتنا وقت بھی نہیں کہ واپس چلا جاؤں۔ آپ اس شخص کو کہیئے کوئی نہ کوئی کمرا ضرور ملنا چاہیئے۔"

میں نے اچٹتی ہوئی نگاہ ان کے خاندان پر ڈالی۔ ان کی بیوی کی عمر چالیس برس کے قریب ہوگی۔ لیکن صحتور عورت تھی۔ گود میں بچہ تھا۔ غالباً لڑکا۔ باقی تین لڑکیاں تھیں دو کمسن ایک جوان۔ جب میں نے بڑی لڑکی کو دیکھا تو کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔۔۔۔"

ڈیوڈ کے ساتھی کا منہ ذرا سا کھل گیا۔

"۔۔۔۔ اب تو مجھے پورا یقین ہو گیا کہ میں نے اس لڑکی کو کبھی پہلے کسی جگہ دیکھا ہے" میں کھڑا ہو گیا۔ اس شخص کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا "جناب میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو نیز آپ کی فیملی کو پہلے بھی کسی جگہ دیکھا ہے"۔ وہ بولے "مجھے بھی یہی شک گذرتا ہے" چندے سکوت کے بعد کہنے لگے "اگر میں غلطی نہیں کرتا تو تقریباً چار برس پہلے میں نے آپ کو لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر مہتہ کے ہمراہ دیکھا تھا" اب مجھے بھی یاد آیا ایک ہی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔ ہم دونوں میں بحث بھی ہوئی تھی۔ اور وہ میری گفتگو سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ پوچھنے لگے "آپ ہی کا نام ڈیوڈ ہے۔۔۔۔۔ ہم آپ کے مضامین "مسیحی دنیا" میں پڑھا کرتے ہیں" ہم ایک دوسرے کو پہچان گئے۔ پھر تو بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا گیا۔ خیریت دریافت کی گئی۔ بچوں کے سر پہ ہاتھ پھیرا گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر انہیں کچھ اعتراض نہ ہو تو میرے کمرے میں گذارہ کر لیں۔ وہ بہت شکر گذار ہوئے اندر جا کر انہوں نے کمرا دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ سارا سامان اندر منگوا لیا گیا ——— میرے سنسان کمرے میں چہل پہل ہو گئی۔ ایک گھنٹہ بعد ہم دونوں برآمدے میں اطمینان

www.taemeernews.com

سے کرسیوں پہ بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ ان کی بیوی نے چاء بھیجی۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ سبھی باہر آجاؤ۔ آخر شرمانے کی بھی کیا بات ہے؟ ڈیوڈ اپنا لڑکا ہی تو ہے۔ اس پر ان کی بیوی باہر آئیں۔ معذرت کرتے ہوئے بولیں۔ بیٹا دل میلا نہ کرنا۔ سب چیزیں ٹھکانے لگا لوں ذرا پھر تم اکٹھے ہی کھایا پیا کریں گے۔ اس وقت برتن کم ہیں۔ بوری میں سے برتن نکال کر صاف کر لئے جائیں گے تو پھر کوئی دقت نہ ہوگی۔" اس کے بعد یہ سمجھ لو کہ مجھے کچھ بھی تردد نہ کرنا پڑتا تھا۔ یوں تو ان کی آمد سے پہلے بھی نوکر روٹی پکا دیا کرتا تھا۔ لیکن وہ مزا کہاں۔ اس رات بڑی رغبت سے کھانا کھایا۔ ہم لوگ جلد ہی آپس میں گھل مل گئے۔ ایک تو میری وجہ سے ان لوگوں کی پریشانی دور ہوئی۔ دوسرے میں ان کا پرانا شناسا نکلا۔ تیسرے وہ میرے مذہبی مضامین پڑھتے رہے تھے۔ غرض ہر طرح سے وہ مجھ سے مرعوب ہو چکے تھے ....."

ڈیوڈ کے دوست نے بے چینی سے کہا "بھئی وہ لڑکی کون تھی۔ پہلے اس سے تعارف کیسے ہوا تھا؟"

"سنو وہ بات بھی بتلاتا ہوں ـــــ تقریباً چار برس پہلے کا ذکر ہے میں اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ ان دنوں چند لڑکے اور دو پروفیسر تفریحی دورے کے لئے جنوبی ہندوستان کی طرف گئے۔ جن دنوں ہم جبلپور میں مقیم تھے۔ تو ایک دن اور سب لوگ وہاں کا ایک آبشار اور سنگ مرمر کی چٹانیں دیکھنے چلے گئے۔ چونکہ میں اور پروفیسر مہتہ ان چٹانوں کو پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ اس لئے ہم لوگ نہ گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد پروفیسر مہتہ کہنے لگے بھئی کہو تمہارا کیا پروگرام ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جناب شہر سے واقف نہیں۔ ایک مرتبہ کسی تقریب پر آیا تھا۔ اس لئے چٹانیں ہی دیکھ پایا۔ اور

www.taemeernews.com

کسی شخص سے واقفیت نہیں ۔۔۔ مہتہ کہنے لگے میں ایک دوست کے ہاں جا رہا ہوں اگر چاہو تو میرے ساتھ چلو سیر ہو جائے گی ۔۔۔ میں چل دیا۔ تو بھئی انہیں صاحب کے ہاں پہنچے انہوں نے ہماری خوب آؤ بھگت کی اس وقت میں نے ان کی لڑکی کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ تیرہ چودہ کا سن۔ رنگ اگرچہ گندمی تھا۔ لیکن جسم تھا کہ نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا۔ اور پھر ہر لڑکی کی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ اس کی سب سے دلکش چیز اس کے ہونٹ اور اس کی مسکراہٹ تھی۔ ہونٹوں میں نہ جانے پارہ بھرا تھا۔ یوں لفظوں میں جو زندگی ان کے اندر کروٹ لے رہی تھی اس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ اور پھر وہ مسکراہٹ ۔۔۔ یوں تو ایک سے ایک حسین لڑکی نظر سے گذری ہے لیکن ایسی دلفریب توبہ شکن مسکراہٹ دیکھنے میں نہیں آئی۔ نہ معلوم قتالہ کی مسکراہٹ میں کیا کشش تھی۔ ایک مرتبہ بھولے سے مسکرا دے تو انسان بندۂ بے دام ہو جائے ۔۔۔۔ انہی دنوں بارات کے وقت انہوں نے ہماری دعوت بھی کی۔ اس وقت معلوم ہوا اس کا بیاہ ہو رہا تھا۔ کمسن لڑکی تھی۔ مسکراہٹ ہر دم لبوں پر کھیلتی رہتی تھی۔ لیکن طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ اس وقت میری عمر بھی یہی اٹھارہ بیس برس کی ہوگی۔ میں نے اس سے ۔۔۔ تو سب کچھ حل کر اپنے کہیں۔ جب ہاتھ سے چلا آیا۔ بس کچھ نہ پوچھو دنوں تک ذہن پر سرور طاری رہا۔ اور دل کی تھنش تھی کہ مٹائے نہ مٹتی تھی۔ لیکن حوادث زمانہ نے سارے تصورات ملیامیٹ کر دیئے وہ برق ریز مسکراہٹ دھندلی پڑ گئی۔ اب جو وہ معشوقہ نظر آئی تو کلیجہ اچھل کر حلق میں آن رہا۔ ہائے دل سنبھلا ۔۔۔"

ڈیوڈ کے ساتھی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "بابا اب تو وہ بھی بوڑھی ہو گئی ہو گی؟"

"ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے اب تو وہ جوبن نکلا تھا کہ نگاہ نہ ٹکتی تھی۔

www.taemeernews.com

کیا بناوٹ تھی جسم کی۔ کیا لچک تھی عضو عضو میں۔ کیا لباس کی پھبن تھی.... اور اس بھولی بسری مسکراہٹ کا اب کیا ٹھکانہ تھا۔ اگر کبھی بہکی نظر سے دیکھ لے تو بڑے سے بڑا پرہیزگار بستی بھول جائے۔ سچ پوچھو تو میری ہستی بھی کیا تھی اس کے سامنے....."

دوسرے نوجوان نے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے پوچھا "یار کچھ گٹھ جوڑ بھی ہوا یا بس یونہی دور ہی دور سے مرا کیئے"

"کچھ نہ پوچھو.... بھئی ان دنوں کو میری زندگی کا ماحصل سمجھو — وہ لوگ بڑے ملنسار تھے۔ کھانے پینے کا وافر سامان اپنے ہمراہ لائے تھے۔ پہلے روز ہی ہم لوگ ایسے گھی شکر ہو گئے جیسے مدت سے اکٹھے ہی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ یار میرا دل تو ایسا الجھا کہ وہاں سے آنے کو جی ہی نہ چاہتا تھا۔ لیکن تھوڑا بہت تکلف بھی لازمی تھا۔ چوتھے روز میں نے کہا کہ اب میں چلا جاؤنگا۔ پہلے تو سبھی نے ہنسی میں ٹال دیا لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ میں اس معاملے میں بالکل سنجیدہ ہوں تو سب لوگ اصرار کرنے لگے۔ اس وقت ہم رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ ان کی اماں بولیں "بھئی رائے شماری کی جائے" چنانچہ جب یہ کہا گیا کہ جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسٹر ڈیوڈ اسی جگہ رہیں وہ ہاتھ اٹھا دیں تو سبھی نے ہاتھ اٹھا دیئے سوائے موتی کے۔ پاپا نے عینک کے نیچے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش کرتے ہوئے ہاتھ اٹھانے کا اشارہ کیا۔ لیکن موتی بولی۔ دیکھئے پاپا! یہ ڈما کریسی ہے ڈکٹیٹر شپ نہیں..... میری آزاد رائے تو یہ ہے کہ اگر مسٹر ڈیوڈ جانا چاہتے ہیں تو ان کو نہ روکا جائے —— یہ کہہ کر اس نے میری طرف ایسی برق پاش نظروں سے دیکھا کہ نہ رہا جانے کی کوشش کرتا نہ جا سکتا۔ میں کچھ خفیف سا ہو کر بولا "اچھا بھئی اس معاملے میں "بیبی" کی رائے لے لی جائے" ان کے

www.taemeernews.com

چار پانچ ماہ کے بچے کو ہم بیبی کہا کرتے تھے۔ تین لڑکیوں کے بعد یہی ایک لڑکا تھا۔ والدین کی آنکھوں کا تارا، تینوں بہنوں کا دلارا۔ خوب موٹا تازہ پیارا بچہ تھا۔ اس وقت ہمک ہمک کر ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ امی نے کہا۔ کیوں بیبی! تم رائے دو گے۔ نہیں بھئی ابھی میں تو چھوٹا سا ہوں۔ ابھی میں بول بھی نہیں سکتا۔۔۔۔ میں نے کہا کہ آپ بیبی کی بغلوں میں ہاتھ دے کر میز پہ کھڑا کئے رکھیں۔ اگر وہ داہنا پاؤں اٹھائے تو میں رک جاؤنگا۔ اور اگر وہ بایاں اٹھائے تو میں چلا جاؤنگا۔ اس بات پہ خوب لے دے ہوئی۔ سبھی اس بات کے خلاف تھے۔ بالآخر بیبی کو میز پہ کھڑا کیا گیا۔ وہ اس وقت بہت خوش تھا۔ خوشی کے مارے کلکاریاں مار رہا تھا ــــ اس کے دونوں پاؤں میز پہ ٹکے ہوئے تھے ــــ پہلے اس کا دایاں پاؤں اوپر اٹھ گیا۔ اس پر خوب ہلڑ مچا۔ قہقہے لگائے گئے۔۔۔۔۔ چنانچہ مجھ کو رکنا پڑا۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد مجلس برخاست ہو گئی۔ آج ممی بڑی بیباک نظروں سے گھورتی رہی تھی۔ آنکھوں میں شرارت کروٹیں لیتی رہی اور ہونٹ دعوت دیتے رہے۔ موقع پاکر میں نے اس کی لچکتی ہوئی کمر میں چٹکی لے لی۔ تو تڑپ کر بل کھا گئی۔۔۔۔۔۔"

ڈیوڈ رکا۔ اس کے ساتھی نے بے چینی سے پہلو بدل کر کہا۔ "برا ہاتھ مارا استاد"

"ابھی کیا۔۔۔۔ ایک دن شام کے وقت ہم دونوں دیر تک باہر گھومتے رہے۔۔۔"

"تو وہ تم دونوں کو اجازت دے دیتے تھے؟"

"ارے بھائی! وہ بھی کوئی مسلمنچی تھی کہ برقع میں لپٹی ٹہلا کرتی۔۔۔۔۔ تو بھئی اسی طرح گھومتے گھومتے شام خوب گہری ہو گئی۔ تاریکیاں چھانے لگیں۔ وہاں بس برف کا تماشا خوب تھا۔ روئی کے پھوئے سے جھڑ رہے تھے۔ ہم گرجے کے پچھواڑے جا کھڑے

www.taemeernews.com

ہوئے۔ سامنے دور تک نگاہ نہ جاتی تھی۔ درختوں کی گھنی شاخیں برف کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھیں۔ جب برف زیادہ ہو جاتی تو پھسل کر نیچے گر پڑتی ——— میں نے سگرٹ کیس میں سے سگرٹ نکال کر سلگایا اور یونہی ازراہِ مذاق سگرٹ کیس اس کی طرف بڑھا دیا۔۔۔
وہ بولی "کوئی دیکھ نہ لے" ——— یہ کہہ کر اس نے ایک سگرٹ اٹھا لیا۔ میں نے دیا سلائی بڑھائی اور ایک بازو اس کے شانوں پر رکھ دیا۔ وہ چپ چاپ سگرٹ پیتی رہی۔ میں اس کے ساتھ سٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ بلکہ میری طرف اپنی کٹاری سی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر بجلیاں گرانے لگی۔ اس خاموش گوشے میں کس قدر دلکش نظر آ رہی تھی۔ اس کی توبہ شکن مسکراہٹ کو برداشت کرنا میری قوت سے باہر ہو رہا تھا۔ میں نے پہلے اس کے نرم پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کو چوما اور پھر پاگلوں کی طرح لپٹا لپٹا کر اس کے ہونٹ، ابرو، رخسار، آنکھیں، گردن سبھی کچھ چوم ڈالا۔ یہاں تک کہ وہ نڈھال سی ہو کر مجھ سے لپٹ گئی۔ بولی "بس اب تو رک جائیے۔۔۔۔۔۔" پھر ہم ہانپتے کانپتے واپس آئے ——— اس کے بعد وہ مجھ سے اس بے باکی سے آنکھیں نہ ملاتی تھی۔ نہ وہ قہقہے ہی لگاتی۔ لیکن میری دلجوئی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھی۔"

ڈیوڈ کے ساتھی کی آنکھیں باہر کو ابلی پڑتی تھیں "یار ڈیوڈ تم تو بڑے گھاگ نکلے۔۔۔۔ اچھا تو پھر۔۔۔ کبھی۔۔۔۔!"

ڈیوڈ نے پھر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ان کو ہموار کیا "۔۔۔۔ ایک مرتبہ شام کو میں اسے گھمانے کے لیے لے گیا۔ طبیعت کچھ خراب تھی۔ اماں سے کہنے لگی ہم ذرا ہوا کھانے جا رہی ہوں۔۔۔ مسوری میں ایک سڑک ہے کیمپٹی بیک روڈ۔۔۔۔ یہ عموماً سنسان رہتی ہے۔ گرمیوں میں بھی اس سڑک پر زیادہ آمد و رفت نہیں ہوتی۔ بعض جگہ سڑک

www.taemeernews.com

کے کنارے پر حجرے سے بنے ہوئے ہیں۔ اوپر چھت ہوتی ہے۔ چاروں طرف محض جنگلہ لگا ہوتا ہے۔ اندر سیمنٹ کے بنچ بنے ہوتے ہیں..... ہم لوگ تھک کر اسی قسم کے ایک حجرے میں بیٹھ گئے..... یار! شاید تم بار بار برف کا ذکر سن کر پریشان ہو رہے ہو گے لیکن سچ کہتا ہوں برف کی وجہ سے مسوری جادو نگری بنی ہوئی تھی۔ برگ و بار، ٹیلے، کھڈیں، پہاڑ، سڑک ہر چیز برف سے اٹی ہوئی کس قدر خاموشی، سکون، تنہائی، ہوا کے سرد جھونکے اور اس قدر طرحدار معشوقہ میرے ساتھ تھی ——— کہنے لگی سر میں ہلکا سا درد ہے۔ اتفاق سے میری جیب میں "نورنگی" کی چھوٹی سی شیشی تھی۔ میں نے وہ اس کو دو گھونٹ پلا دی۔ اسے بنچ پر لٹا کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس کے ہونٹوں کو چوم کر پوچھا، اب سر میں درد ہے کیا؟..... اس کے بعد میں نے پھر وہی حرکت کی۔ اسے بھی ہلکا سا سرور آ گیا۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے جوابی کارروائی کی..... یا پھر دونوں تو ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ وہ مجھ سے بُری طرح لپٹ گئی۔ اور پیار و محبت کے کلمے کہنے لگی۔ بس پھر کیا تھا..... میں نے.....

اس کے بعد ڈیوڈ آگے کو جھک کر کچھ کہنے کو تھا۔ کہ خزانچی نے ہانک لگائی۔

"ہاں صاحب! ٹوکن نمبر بتیس ۳۲ اور تینتیس ۳۳"

خدا خدا کر کے چیک وصول ہوا۔ روپیہ لیکر جانے سے پہلے وہ پھر عارف کی کھڑکی کی طرف آئے بظاہر وہ رجسٹروں کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ لیکن باطن میں اس کی تمام تر توجہ ان کی باتوں کی طرف لگی ہوئی تھی۔ ڈیوڈ نے کھڑکی کے آگے آ کر کہا۔ "لائیے صاحب! مجھے ایک نئی چیک بک عنایت کر دیجئے" اس کے ساتھی نے

www.taemeernews.com

پوچھا۔" تو پھر تم بلاناغہ اس حجرے میں جایا کرتے تھے؟"

"بس میاں! پھر پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ ہمیں فکر کاہے کی تھی ــــ میں نے اس کے فوٹو بھی لیئے...... کسی سے ذکر نہ کرنا۔ میں دکھاؤنگا تمہیں۔ وہاں ایک جگہ ہے گن ہل۔ ہم اس پہاڑی پر چڑھ گئے۔ اس جگہ میں نے اس کے کئی فوٹو لیئے۔"

چیک بک لیکر وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ چل دیئے۔ ڈیوڈ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔" اس دن دھوپ شاندار تھی۔ میں نے اس کے کچھ پوز لیئے پھر میں نے اس سے کہا بھئی اس طرح لطف نہیں آتا.... وہ بولی۔" اس طرح مجھے شرم آتی ہے...... میں نے محبت کا واسطہ دیا۔ گلے سے لپٹا کر پیار کیا...... اور بھئی بڑی مشکل سے وہ جھینپ جھینپ کر بدن کے کپڑے......"

وہ دونوں سیڑھیوں سے اُتر گئے۔

آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ لوگ آتے چیک دیتے وہ ٹوکن پھینک کر کام میں مصروف ہو جاتا۔ اتنے میں ایک صاحب منشی کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ آتے ہی چیک لکھنے لگے۔ پھر یکا یک ہاتھ رُک گیا۔ منشی سے مخاطب ہو کر بولے۔" منشی جی! چار ہزار کافی ہوگا؟ کہو تو بڑھا دوں۔ پانچ ہزار سے کام چل جائے گا۔"

"جناب دو ہزار کی تو اگلے بدھ کو بھی ضرورت ہوگی۔"

www.taemeernews.com

"اجی چلو پھر منگوالیں گے۔ ممکن ہے ہیریسن کمپنی والوں سے بل وصول ہو جائے۔ کتنا تھا وہ، تین یا ساڑھے تین ہزار....."

عارف نے بے جان ہاتھوں سے چیک پر کچھ لکھا۔ اور رجسٹر کھولا۔ منشی جی بولے۔ "بابو جی! ذرا ہمارا حساب بھی بتا دیجئے۔"

عارف نے ورق الٹتے ہوئے جواب دیا۔ "چورانوے ہزار سات سو اڑتیس روپے گیارہ آنے....."

منشی جی نے عینک صاف کرتے ہوئے کہا۔ "سیٹھ جی! اس بنک میں آپ نے بہت تھوڑا سا روپیہ رکھا ہے۔"

عارف نے چیک رجسٹر میں رکھ کر چپڑاسی کو دیا ہی تھا کہ اس کو اپنے چچا دکھائی پڑے۔ اس کو تعجب ہوا کہ چچا اس جگہ کیسے آن ٹپکے۔ خیر! وہ باہر نکلا۔

اس کے تو ندیل چچا ہنسے۔ ادھر ان کا پیٹ نیچے اوپر ہوا اور ان کی ٹوپی کا پھندنا لرزنے لگا۔ وہ بلاوجہ ہنستے ہوئے بولے۔ "کہو برخوردار! اچھے تو ہو۔ میں ادھر سے جا رہا تھا سوچا برخوردار کو دیکھ لوں۔"

عارف کے چچا پہلے کسی شہر میں خوانچہ لگایا کرتے تھے۔ اب اپنے شہر میں ان کی پھلوں کی دوکان تھی۔ خوب روپیہ کماتے تھے۔ بلا کے چلتے پرزے..... عارف سوچنے لگا کہ چچا ایسے متوالے کہاں کہ یونہی دیکھنے چلے آئیں۔ پچھلے دنوں روپے کی انتہائی تنگی کی وجہ سے اسے کپڑا بیننے کی مشین بیچ ڈالنے کا خیال آیا۔ چونکہ بزنس کے معاملے میں وہ نرا بدھو ہی تھا۔ اس لئے چچا کے پاس گیا۔ بولا چچا! یہ مشین بیچکر نئی لینے کا خیال ہے۔ اس کا سودا کروا دیجئے کسی سے۔ چچا آمادہ ہو گئے۔ عارف نے دبی زبان

www.taemeernews.com

میں کچھ روپے مانگے۔ چچا نے چالیس روپے دیئے اور پھر تیسرے روز کہا لو برخوردار تمہاری مشین پچاس روپے میں بک رہی ہے۔ دس روپے اور تھامو اور رسید لکھ دو عارف بچارا حیران۔ بولا چچا! یہ تو لوٹ ہے لوٹ۔ چچا بھی اس کی رگ سے واقف تھے بولے۔ بیٹا! تو چالیس روپے لاؤ اور مشین اٹھا لو۔ وہ بڑا گھبرایا۔ روپیہ خرچ ہو چکا تھا۔ اس نے کہا "چچا میں اخبار میں اشتہار دے رہا ہوں ممکن ہے کوئی اچھا گاہک مل جائے۔"

دو تین دن گذرے تھے کہ چچا بنک میں آن دھمکے۔ ادھر ادھر کی رسمی باتوں کے بعد بولے "بیٹا! تمہاری مشین کے دوکاندار اپنے چالیس روپے واپس مانگتا ہے۔"

عارف جانتا تھا کہ چچا اس کی مشین ہضم کرنا چاہتے تھے۔ اس نے چچا کی بھاری بھرکم توند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "چچا کل اشتہار نکل آئے گا۔ ذرا صبر کیجئے نا!"

چچا نے مسکین صورت بنا کر کہا "برخوردار تم جانتے ہو۔ میں بال بچے دار معمولی دوکاندار ہوں۔ وہ شخص صبح شام دوکان پہ آن کر تقاضہ کرتا ہے۔ اگر تم مشین نہیں بیچتے تو اس کے روپے دے ڈالو۔"

"چچا روپیہ تو ایک ضرورت کے لئے آپ سے مانگے تھے میں نے۔"

چچا نے باچھوں سے پان کا لاکھ صاف کرتے ہوئے جواب دیا "عارف بیٹا! وہ روپیہ میرا نہیں تھا۔ تم میرے بیٹے ہو سوچو اگر روپیہ میرا ہوتا تو میں تم سے طلب ہی کیوں کرتا۔ وہ میرا دوست تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ بھئی مشین والا چالیس روپے مانگتا ہے روپیہ دے دو اور کسی کو دکھا لو۔ باقی بعد میں دے دینا۔ اس نے میری بات پہ اعتبار کیا اور روپیہ دے دیا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ اب تم نہ مشین دیتے ہو اور نہ روپیہ ہی واپس دینے پر تیار ہو۔"

www.taemeernews.com

اب عارف پر اصلیت روشن ہوگئی۔ لیکن مجبور تھا۔ "چچا مشین بیچنے کو میں تیار ہوں لیکن وہ شخص تو مجھ کو لوٹنا چاہتا ہے۔"

"بیٹا مشین کی حالت بھی تو دیکھو۔ کل وہ پھر ملا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ بھئی مشین کی قیمت کچھ زیادہ ادا کر دو۔ کہنے لگا اچھا بھئی تم کہتے ہو تو میں دو روپے زائد دے دونگا۔ ——— اب اگر تم کو باون روپے منظور ہوں تو کر لو سودا۔"

"چچا مجھے معلوم نہ تھا کہ روپے کا تقاضہ اس شدت سے شروع ہو جائیگا۔ اب میں روپیہ کہاں سے لاؤں؟"

"برخوردار تمہاری تنخواہ تو مل گئی ہوگی۔ سنا ہے اب تمہاری تنخواہ بھی بڑھ گئی ہے بیٹا فضول خرچ کیا کرو۔ پینسٹھ روپے کچھ معمولی رقم تو نہیں۔ تمہارے اخراجات بھی کیا ہیں۔ میاں بیوی اور دو بچے ....."

عارف خاموشی سے بازار کی طرف دیکھتا رہا۔ چچا اپنی گچھے دار مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "آج کیا تاریخ ہے تنخواہ نہیں ملی کیا؟"

"پرسوں ملے گی۔"

چچا نے ذرا خوش مذاقی سے ہنستے ہوئے کہا۔ "کوئی حرج نہیں بیٹا! میں پرسوں چلا آؤں گا۔ دیکھو نا! دنیا کے کام بس یونہی چلا کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے ہاتھ سے ٹوپی پیچھے کی طرف سرکائی اور چندیا کھجلانے لگے۔

اس کے بعد وہ سیمنٹ کے بھاری بجھ کر بوجھ کی طرح ہلے اور آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔ عارف واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

شام ہوگئی۔ سب لوگ کام ختم کر کے چلنے کو تیار ہوئے۔ عارف کا یہ دن بہت برا

www.taemeernews.com

گذرا۔ کوٹ ابھی تک سیلا ہوا تھا۔ وہ از حد تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا۔ کہ گھر جا کر تھوڑی دیر آرام کرے۔ اتنے میں منیجر آیا۔ بے اعتنائی سے بولا "عارف! آج ظفر نہیں آیا۔ اس لیے آج شام کی ڈیوٹی پر خزانچی کے ساتھ تم رہو گے۔"

سب لوگ باتیں کرتے شور مچاتے چلے گئے۔ کمرہ خالی رہ گیا۔ اور پہلے کی نسبت فضا اور بھی بے کیف ہو گئی۔ مہتر جھاڑو دینے آیا۔ چپڑاسی گرے پڑے کاغذات اٹھا رہا تھا خزانچی نے آواز دی کہ عارف میاں! یہاں چلے آؤ ـــــ عارف اٹھ کر خزانچی کے کٹہرے میں بیٹھ گیا۔

خزانچی سیدھا سادا بنیا ٹائپ کا ہندو تھا۔ بے تکان اور بے چون و چرا کئے کام میں مصروف رہتا۔ ظرافت تو اس کو چھو کر بھی نہ گئی تھی۔ اگر کبھی اپنی دانست میں کوئی ہنسی کی بات کہے بھی تو سننے والے کو الٹا رونا آئے۔

بیکاری میں وقت کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ جب کوئی شخص روپیہ جمع کروانے کے لئے آجاتا تو ایک آدھ بات ہو جاتی۔ ورنہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہتے ـــــ ایک کونے میں میری کوریلی کا کوئی ناول پڑا تھا۔ شروع کے اوراق گم تھے۔ وہ اسی کی ورق گردانی کرنے لگا۔

خزانچی فائلیں کھول کھول کر دیکھ رہا تھا۔ لوگ روپیہ جمع کروانے کی غرض سے آتے تو "تین سو روپیہ، ہزار، سولہ سو" کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ روپوں کی گنتی سنتے سنتے یکایک اسے خیال آیا۔ کہ آج اس کو چند روپے درکار تھے۔ آج گھر میں نہ لکڑی تھی نہ آٹا مٹی کا تیل بھی لالٹین میں تھوڑا ہی سا رہ گیا تھا۔ اس نے بیوی سے کہا تھا کہ وہ شام کو سب چیزیں لے آئیگا۔ بچاری انتظار کرتی ہو گی۔ شاید کام چلانے کے لئے کہیں سے

www.taemeernews.com

تھوڑا بہت آٹا لے لیا ہو۔

پھر وہ مشین کی بابت سوچنے لگا۔ شاید کوئی اچھا گاہک مل جائے۔ اگر سوا سو یا ڈیڑھ سو روپیہ وصول ہو جائے تو کچھ کام چل جائے۔ چچا سے چالیس روپے لیکر اس نے بڑی غلطی کی۔ اب وہ روپے بچوں کے کپڑوں پر اور کچھ ادھر اُدھر خرچ ہو چکے تھے۔ اسکی زردرو بیوی کے پاس کپڑوں کی اتنی کمی تھی کہ وہ گھر سے باہر نہ نکل سکتی تھی اور نہ کسی اور کو اپنے گھر میں ہی بلا سکتی تھی۔ اگر مشین نہ بکی اور چچا کو چالیس روپے تنخواہ میں سے دینے پڑے تو اس صورت میں گوالا، دھوبی، بنیا، نائی سبھی اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ..... اس نے سوچا کہ سردست خزانچی سے پانچ روپے ادھار لے لوں تاکہ جب تک تنخواہ نہیں ملتی گھر کا کام تو چلے۔

لالہ شریف آدمی تھا۔ "لو خان صاحب! پانچ چھوڑ پچاس مانگو تو انکار نہیں۔" اس نے نوٹ توڑ موڑ کر جیب میں ٹھونس لیا۔

خدا خدا کر کے آٹھ بجے اور وہ چلنے کو تیار ہوا۔ لالہ بولے "خان صاحب! میں ابھی پندرہ بیس منٹ تک یہیں بیٹھوں گا۔ تھوڑا سا کام باقی ہے۔"

عارف نے سیلے ہوئے بوٹوں میں پاؤں ڈالے تو اس کی ٹانگیں جھنجھنا اٹھیں۔ سیڑھیوں سے نیچے اترا تو دیکھا کہ بازار کی اکثر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ بازار میں روشنی بھی کم تھی۔ دکانوں کے پیچھے مکان ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ سڑک معمول کے خلاف بہت صاف ستھری اور بارش سے دھل گئی تھی۔ گیلی سڑک جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ اس وقت آسمان میں بادل کا ایک ٹکڑا تک نہ تھا۔ نکھرے ہوئے آسمان میں تارے جھلملا رہے تھے۔ وہ بڑے بازار کو چھوڑ کر کوچہ گل محمد کو ہو لیا۔ لال خان کبابی کی دکان

www.taemeernews.com

سے کچھ ہی دور پہنچا ہوگا کہ میونسپلٹی کی لالٹین کے قریب چند آشنا صورتیں نظر آئیں ابھی یہ ان کو اچھی طرح پہچان نہ پایا تھا کہ انہوں نے اس کی طرف دیکھا اور اک دم چلا اٹھے۔

وہ اس کے دوست تھے۔ سب نے اسے گھیر لیا۔ شکایتوں کے دفتر کھول دیئے۔

"یار! ہم تمہارے گھر گئے۔ وہاں بالکل تاریکی تھی۔ آوازیں دیں۔ بھاوج نے کہلا بھیجا کہ آپ گھر پر نہیں بھئی ہم تو دل میں شک کر رہے تھے کہ تم ضرور پڑے سو رہے ہو گے۔ ہمیں چکمہ دے دیا ـــــ آج کہیں سے ذرا سی " یہ " مل گئی۔ ہم اس خیال سے گئے تھے کہ تمہارے ہاں ذرا کچھ کھانے کو مل جائیگا۔ کھانا کھانے کے بعد سینما دیکھنے کا خیال تھا۔"

یہ کہہ کر ان میں سے ایک نے کوٹ کے اندر سے بوتل کی جھلک دکھائی۔

کافی بحث مباحثہ کے بعد عارف نے ان کو منا لیا کہ یہیں کسی دوکان سے کچھ کھا پی لیں۔ وہ جانتا تھا گھر پر نہ لکڑی تھی نہ آٹا۔

چنانچہ وہ لوگ لال خاں کبابی کے ہاں پہنچے۔ دوکان کے آگے ایک پرانی لالٹین لٹک رہی تھی جس کی مدھم روشنی میں کباب سیخیں اور مچھلی کے ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔ چند ایک ڈھیلی پگڑیوں اور الجھے ہوئے بالوں والے حضرات بیٹھے کھا پی رہے تھے۔

وہ لوگ اندر چلے گئے۔ بوتل کے ادھے کو چار پینے والے نشہ تو خیر کیا ہوتا البتہ ہلکا سا سرور آ گیا۔ کھانے پینے میں چار روپے سے اوپر عارف کی گرہ سے کھل گئے ...

.... جب وہ سینما گھر پہنچے تو عارف اپنے ٹکٹ کے دام بمشکل پورے کر سکا۔

فلم شروع ہوئی۔

ایک پہاڑن لڑکی کی داستان محبت تھی۔ فلک بوس پہاڑوں کے مناظر تھے قیامن کوہ

www.taemeernews.com

میں ایک جھونپڑی تھی۔ اس جھونپڑی میں حسن و جمال کا ایک نمونہ ایک پری مثال لڑکی۔ عارف کی طبیعت بحال ہونے لگی۔

اس نے آج تک ایسی وہ بالڑکی نہ دیکھی تھی۔ اور پھر اس کا شباب تھا کہ جو ابھرا آتا عارف کی تھکاوٹ دور ہو گئی۔ دل کی پریشانیاں رفع ہو گئیں۔ طبیعت اس قدر مسرور ہو رہی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ وہ خوب باتیں کرے اور چہکے۔ اس نے اپنے دوستوں سے مخاطب ہو کر کافی بلند آواز میں کہا۔ "یار کیسی کافر جوانی ہے۔ اس کی گول گول چھاتیاں تو دیکھو کیسا ابھار ہے۔ جوبن پھٹا پڑتا ہے اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کے بوسے لینے میں کیسا مزا آئے۔ ہائے کیسی سجی ہوئی راہ میں"

اور حضرات کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ وہ سمٹ سمٹ کر سرڈھانپنے لگیں۔

اتنے میں پری وہ پیکر جنگل کی وہ شہزادی گھاس پر بیٹھ گئی۔ اس نے بصد ناز بازو اٹھائے اور سینہ تان کر انگڑائی لی کہ عارف کی طبیعت نہال ہو گئی۔ اس نے اپنے ساتھی کی ران پر ہاتھ مارا اور دانت پیستے ہوئے پہلے کی نسبت بلند تر آواز میں للکارنے لگا۔
"مار ڈالا! مار ڈالا......... ظالم! ۔۔۔ یار مزا آگیا ۔۔۔ اگر کہیں ویرانے میں اسی طرح گھاس پر لیٹی ہوئی مل جائے ...... تو استاد ...... بس"

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

خلا

جب میں کوٹھی کے نزدیک پہنچا تو ٹھٹک کر ایک درخت کے تلے کھڑا ہو گیا۔ اس وقت میری صورت سے بھی وحشت ٹپک رہی ہو گی۔ گرمیوں کے دن، گیارہ بجے کا وقت دھوپ کی تمازت، سڑک کے کنکر دہکتے انگارے ہو رہے تھے۔ چند ایک کنکر میرے بوٹوں میں داخل ہو گئے تھے۔ راستہ بھر پریشان رہا۔ تسمے کھول کر بوٹوں کو جھاڑا..... اور پھر پسینہ پونچھ کر سوچنے لگا کہ اندر جا کر کیا کہوں گا۔ شاید وہ لوگ حیران رہ جائیں کہ آج اس قدر تیز دھوپ میں میں اکیلا چلا آیا۔

خاں صاحب ہمارے دُور کے رشتہ دار تھے۔ ہم لوگ ان کے مقابلے میں غریب تھے جب تک میرے والد صاحب ملازمت میں تھے اچھا گذارا ہو جاتا تھا۔ لیکن حالات نے پلٹا کھایا۔ نوکری چھوٹ گئی اور وہ گھبرا کر کسی بیمہ کمپنی کے ایجنٹ بن گئے۔ پہلے شہر سے باہر سرکاری مکان میں رہتے تھے۔ اب ہم لوگ شہر میں آ گئے تھے۔ موجودہ مکان کے آگے ایک اونچا چبوترا تھا۔ چند پختہ سیڑھیوں کے بعد برآمدہ۔ برآمدے کے دونو گوشوں پر ایک ایک غسل خانہ۔ اس چھوٹے سے مکان کے نصف حصہ میں ایک اور کرایہ دار رہتے تھے۔ باہر کے برآمدے میں اپنے غسل خانے کی طرف انہوں نے ٹاٹ کا ایک بڑا ٹکڑا لٹکا رکھا تھا۔ اندر ایک دو دو کمرے تھے۔ ایک چھوٹا ایک بڑا۔ صحن مشترکہ ہی تھا۔ البتہ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ ہمارے حصے میں آیا تھا اور ایک ان کے۔ ادھر ہماری

www.taemeernews.com

یہ حالت تھی۔ ادھر خاں صاحب شہر سے چار میل پرے شاندار کوٹھی میں رہتے تھے خیر یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے ورنہ خاں صاحب جن کو میں چچا کہہ کر پکارتا تھا۔ بڑے فراخدل اور سلجھے ہوئے خیالات کے شخص تھے ہنسی اور مذاق تو ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ مجھ کو بہت پیار کرتے تھے شاید اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ ہماری مالی حالت میں اس قدر تفاوت تھا کہ زیادہ راہ و رسم کی صورت ہی نہ تھی۔ بہرحال خاں صاحب کی بیوی اور اماں کے اصرار پر کبھی کبھی امی ان کے ہاں چلی جاتیں۔ اور ان کے ہمراہ میں بھی ضرور جاتا۔ میری وہاں خوب آؤ بھگت ہوتی۔ وہ مجھ کو آنکھوں پر بٹھاتے۔ بڑی اماں اگرچہ محبت کا اظہار اس قدر گرمجوشی سے نہ کرتیں البتہ میرے لئے کھانے کی اچھی اچھی چیزیں مہیا کرتیں۔ ..... لیکن آج تک میں ان کے ہاں اکیلا کبھی نہ گیا تھا ـــــ ایک دن پہلے خاں صاحب کا نوکر بازار میں ملا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ خاں صاحب کی انگریزی کتیا، لوسی نے بچے جنے ہیں۔ میں بے چین ہو گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ خاں صاحب کے ہاں پہنچنا تو خیر مشکل تھا اس لئے دوسرے دن جانے کی ٹھانی۔ رات بھر نیند نہ آئی۔ اُف! کتا پالنے کا مجھے کس قدر شوق تھا۔ میں نے ڈر کے مارے گھر میں کسی سے اس بات کا ذکر تک نہ کیا مبادا وہ منع کر دیں خصوصاً امی کتے کو نجس سمجھتی تھیں۔ اگر ان کو معلوم ہو جاتا تو مجھ کو گھر سے ہی نہ نکلنے دیتیں۔ ..... ہمارے گھر کی فضا بڑی خشک تھی۔ میرے والد صاحب تنومند، متین اور غصہ ور شخص تھے۔ ان کے سامنے چوں کرنے کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ امی بیچاری اپنے کام دھندوں میں مصروف رہتیں۔ کوئی بھائی یا بہن نہ تھی۔ اس لئے گھر کی فضا بے کیف سی رہتی تھی خصوصاً جب ابا والد صاحب گھر میں رہتے۔ کوئی متنفس دم نہ مار سکتا تھا۔ لیکن وہ کتے سے متنفر نہ تھے۔ دوسرے

www.taemeernews.com

دن دودھ پینے کے بعد میں اکیلا ہی کوٹھی کی جانب چل کھڑا ہوا۔ وہاں پہنچکر اندر جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں کیونکر دس پندرہ منٹ باہر کھڑا مختلف جذبات کے بحران میں مبتلا رہا۔ کئی دفعہ تو ٹھان لی کہ واپس چلدوں لیکن کتے کی کشش نہ جانے دیتی تھی۔ بالآخر دل کڑا کرکے پھاٹک کے اندر داخل ہو گیا۔

سامنے کوٹھی تھی خاموش و بے حس ---- فضا بے کیف۔

میں کچھ مایوس سا ہو گیا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے سائبان میں سے ہو کر برآمدے کی طرف بڑھا۔ نیلے رنگ کے بھاری پردے پڑے ہوئے تھے تاکہ دھوپ برآمدے میں نہ جا سکے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پردہ اٹھایا۔ برآمدہ خالی تھا۔ تین چار کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک بڑا آئینہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی سیٹ لگانے کی کھونٹیاں یا دروازوں کے آگے پائدان۔ چند ایک گملے تھے جن میں بے رنگ و بو پھولوں کے پژمردہ پودے تھے۔ . . میری عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ کاش کوئی مجھ کو دیکھ کر اندر بلا لیتا۔

برآمدے سے نکل کر میں نے کوٹھی کا چکر کاٹا اور پچھواڑے سے باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ ادھر چھوٹا صحن تھا۔ دروازوں کے آگے جالی لگی ہوئی تھی اس لئے اندر کا شخص باہر سے دکھائی نہ دیتا تھا۔ البتہ کچھ مبہم سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں شاید کوئی ہو۔ جالی کے قریب پہنچ کر میں نے اندر کی طرف جھانکا۔ بڑی اماں میری طرف پشت کئے کھڑی تھیں۔ میں نے دروازہ کھولا اور اپنی ایرانی طرز کی ٹوپی اتار کر ہاتھ میں لے لی۔ اور مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔ بڑی اماں نے گھوم کر نہ دیکھا میرے دل میں پھر وسوسے پیدا ہونے لگے۔ کہ نہ معلوم بڑی اماں کا مجھ سے کیسا سلوک ہو۔ ایک دفعہ پھر

www.taemeernews.com

بھاگ جانے کی سوجھی۔اسی حیص بیص میں تھا کہ بڑی اماں نے گھوم کر میری طرف دیکھا ۔۔۔۔۔گوناگوں جذبات کی وجہ سے نہ معلوم میرے چہرے کی کیفیت کیا ہو رہی ہوگی۔۔۔۔ لیکن اماں کا چہرہ جذبات سے خالی رہا۔میں نے ادب سے ہاتھ پیشانی تک لیجا کر کہا۔"اماں جی! سلام کرتا ہوں۔"

بڑی اماں نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ان کی نظر کمزور تھی۔گھور کر دیکھتے ہوئے بولیں۔"تو کون ہے چھوکرے۔"

میں بہت پریشان ہوا۔دل میں پچھتانے لگا کہ ناحق آیا۔بوڑھی اماں نے آگے بڑھتے ہوئے عینک صاف کر کے ناک پر ٹکائی۔اور قریب سے دیکھنے لگیں۔میرا دل دھڑک رہا تھا۔زبان سوکھی جا رہی تھی۔بارے وہ مجھے پہچان کر اندر لے گئیں۔کرسی پر بٹھایا۔ بیچاری پریشان تھیں کہ نہ معلوم کیا افتاد پڑی کہ بچا رانگے سر اس قدر دھوپ میں پیدل چلا آیا۔۔۔۔ٹوپی بغل میں تھی۔۔۔۔انہوں نے برقی پنکھا چھوڑ دیا اور شربت کا گلاس منگوایا۔نوکر گلاس پلیٹ میں رکھ کر لایا۔میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے گلاس اٹھایا مجھ کو خوف تھا اگر گلاس پلیٹ میں سے پھسل کر گر پڑا تو وہ مجھے بے تمیز سمجھیں گی۔

بڑی اماں با وضع اور مہذب خاتون تھیں۔جب میرے دم میں دم آیا تو انہوں نے آنے کا مدعا پوچھا۔میں نے بتایا تو بیچاری کے چہرے سے مایوسی کے آثار دکھائی دینے لگے۔بولیں۔"بیٹا! پہلے کیوں نہ بتایا۔اب تو لوگوں نے بچے لے لئے۔"

میرا دل ٹوٹ گیا۔روہانسا ہو کر پوچھا۔"ایک بھی باقی نہیں بچا؟"

وہ مجھے خان صاحب کے پاس لے گئیں۔خاں صاحب نے اخاہ کا نعرہ لگا کر مجھے بہت پیار کیا۔گھر سے باہر ان کا کس قدر دبدبہ تھا اور جو کوئی انہیں ملنے کیلئے آتا تو ان سے

www.taemeernews.com

آنکھ نہ ملا سکتا تھا۔ اماں نے اصل بات بتائی۔ خاں صاحب نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔" بیٹا کل جار بچے دیئے لوسی نے "تین" لڑکے" اور ایک "لڑکی"۔ کیا سمجھے ؟" پھر ہنس پڑے۔" تم جانتے ہی ہو کہ ہمارا کتا انگریزی نسل کا ہے اور لوسی بھی لیکن نسل دونوں کی علحدہ علحدہ ہے۔ اب نتیجہ یہ نکلا کہ کتیا اور دو کتے تو اپنے باپ کی طرح خوب لمبے لمبے بالوں والے ہیں۔ اور ایک کتا چھوٹے بالوں والا۔ ہو بہو لوسی کی طرح۔ سمجھے بھائی ؟ لمبے بالوں والا ایک کتا تو ہماری پڑوسن میم صاحب نے لے لیا ہے۔ اور دوسرا ریاست نابھ کے ایک رئیس نے مانگ لیا ہے۔ میم صاحب تو اپنا کتا لے بھی گئیں۔ دوسرے کے لئے ہم وعدہ کر چکے ہیں اب کہو ——— کتیا لو گے ؟"

میں نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا۔

پھر ہم لوگ نوکروں کے کوارٹروں کی طرف گئے۔ لوسی پیال پر لیٹی ہوئی تھی تین بچے اوں اوں کرتے ہوئے ماں کا دودھ پینے کی کوشش کر رہے تھے۔ خاں صاحب نے چھوٹے بالوں والے پلّے کی طرف اشارہ کیا . . . . دوسرے پلّے خوب لمبے لمبے بالوں والے تھے اور اپنے باپ کی طرح ان کے جسم پر کہیں کہیں سفیدی بھی موجود تھی لیکن چھوٹے بالوں والا پلا بالکل اپنی ماں کی طرح تھا۔ کالا بھجنگ۔ اس کی آنکھیں ابھی نہ کھلی تھیں سر سے نیچے کو لٹکتے ہوئے لمبے کان ممیوں کے ہموار کٹے ہوئے پتوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ وہ خوب موٹا تازہ گول مٹول سا تھا۔ پہلے میں اس کی جلد پر ہاتھ پھیرتا رہا جو مخمل کی طرح نرم تھی پھر میں نے اس کو اٹھا لیا۔ وہ ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ اس کے پنجوں کے ناخن گنے۔ چاروں پنجوں کے ناخن گنتی میں بیس تھے۔ سنا تھا کہ بیس ناخنوں والا کتا بڑا لڑاکا اور بڑا قنوطی ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اسے زمین پر رکھا اور دونوں کانوں سے پکڑ کر اوپر اٹھا دیا۔ وہ چپ چاپ

www.taemeernews.com

میں نے ایک کان سے پکڑ کر اٹھایا پھر بھی نہیں چیخا۔ جب تک میں یہ آزمائش کرتا رہا، خان صاحب کھڑے مسکراتے رہے۔ میں تھوڑی دیر تک کتے کو دیکھتا رہا۔ جب دل میں یہ خیال آیا کہ میں اسے اپنا سکتا ہوں تو پھر وہ مجھ کو پیارا معلوم ہونے لگا۔ بالآخر میں نے اسے اٹھا کر جھولی میں ڈال لیا۔ اور کہا "چچا! مجھے یہ کتا پسند ہے۔"

خان صاحب بولے "بیٹا! ابھی اسے اسی جگہ رہنے دو۔ بچہ ہے نا! ماں کا دودھ پیئے گا۔ جب آنکھ کھولے گا تو لے جانا یا ہم بھجوا دیں گے۔"

میں اس بات پر آمادہ نہ ہوا۔ اور فوراً چل کھڑا ہوا۔

پلا میری جھولی میں پڑا ہوا ہلکتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ سو گیا۔ میں نے جیب میں سے رومال نکال کر اس پر ڈال دیا اور دھوپ سے بچاتا ہوا گھر کی طرف لپکا۔

ایک مشکل تو حل ہو چکی تھی۔ اب دوسرا مرحلہ درپیش تھا۔ فکر یہ تھی کہ کتا گھر میں کیسے پہنچاؤں ——— وہ ننھی سی جان میری گود میں تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن اپنے سینہ پر محسوس کر رہا تھا ...... جوں جوں میں گھر کے قریب پہنچ رہا تھا۔ توں توں میرے قدم سست پڑ رہے تھے۔

ہمارے گھر کے نزدیک جتنے بھی جو کرایہ دار رہتے تھے۔ ان سے ہمارے بہت اچھے تعلقات تھے۔ فقط میاں بیوی کا ایک جوڑا تھا۔ میاں کسی دفتر میں ملازم تھے۔ نو بجے دفتر کو سدھارتے۔ شام کو پانچ بجے آن صورت دکھاتے۔ ابھی نوجوان تھے۔ ان کی بیوی نئی نویلی دلہن تھی۔ خدوخال اچھے تھے۔ رنگ بہت گورا چٹا تھا۔ بالکل میم صاحب معلوم ہوتی تھیں۔ جسم خوب مضبوط اور بھرا ہوا تھا۔ جب مہندی رچا کر آنکھوں میں سرمہ ڈال لیتیں تو بڑی اچھی لگتی تھیں۔ میاں پردے کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ انکی بیوی

www.taemeernews.com

جن کو میں خالہ کہا کرتا تھا۔ ایک تو وہ یونہی چھوکری سی تھیں دوسرے شرمیلی تیسرے اپنے میاں سے بہت ڈرتی تھیں۔ اس لئے بچاری کبھی کمرے سے باہر جھانکنے کی جرأت نہ کرتی تھیں۔ میری عمر اس وقت غالباً گیارہ برس کی تھی مجھ سے پردہ نہ تھا۔ خالہ امی کی منہ بولی بہن تھیں۔ بڑی معصوم اور کھلنڈری۔ معمولی سی بات پر ان کو اتنی ہنسی چھوٹتی کہ آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ وہ مجھ سے بہت بے تکلف تھیں۔ الھڑ اور طبیعت میں لڑکپن چھپانے سے کیا حاصل۔ انہوں نے ابھی تک اپنے گڈے اور گڑیاں میاں کی نظر سے بچا کر سنبھال رکھے تھے۔ جب ان کے میاں دفتر کو چلے جاتے تو دوپہر کے وقت ہم دونوں گڈے اور گڑیوں کے کھیل کھیلتے۔ اس معاملے میں میں ہی ان کا راز دار تھا۔ امی بھی اس بات سے بے خبر تھیں۔

بچاری خالہ جان پر بہت سی پابندیاں عائد تھیں۔ نہ کوئی سہیلی کہ دل بہلا لیتیں۔ [illegible] کی وہ ادب کرتی تھیں یعنی کم از کم گڑیاں کھیلنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ مجبوراً خالہ جان کو مجھی سے رجوع کرنا پڑتا۔ جب تک میاں غائب رہتے وہ پہروں ان ہی کمرے میں پڑی رہتیں۔ کبھی دو گھڑی امی سے بات کر لیتیں۔ مجھے دیکھتیں تو آنکھوں میں [illegible] چمک پیدا ہو جاتی۔ ہم خوب کھیلتے۔ باتیں کرتے لڑتے جھگڑتے روٹھتے مناتے ..... کبھی وہ نہا دھو کر بال کھولے، ایک دھوتی لپیٹے جس کے ایک پلو سے جسم کے اوپر کا حصہ ڈھانپے ہوئیں آئینہ کے سامنے کھڑی بالوں میں تیل رچا رہی ہوتیں اور [illegible] میں مجھ سے گپ ہانکی جاتی۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر شرما کر ہنستیں، ذرا منہ ادھر کر لو نا میں قمیص پہن لوں ..... کبھی میں ان کو اپنا گھوڑا بنا لیتا۔ بچاری چوپائے کی طرح چلتیں اور میں ان کی پیٹھ پر سوار۔ ان کی لمبی چوٹی گھما کر ان کے دانتوں میں دے دیتا۔

www.taemeernews.com

اور اس لگام کو کھینچ کھینچ کر انہیں کمرے کے اندر خوب دوڑاتا..... ایک دن امی نے دیکھ پایا۔ مارے ہنسی کے پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ "اللہ رے! تم بھی خالہ ہو گھوڑا اپنی گھٹنوں کے بل چل رہی ہو۔" اس دن امی نے ہنسی ہنسی میں یہ بات ابا کو بھی بتا دی۔ ابا کھانا کھا رہے تھے۔ یہ سن کر بہت بگڑنے "حرامزادے! کتاب لیکر پڑھا کر..... شرم نہیں آتی۔ کیا اب تو دودھ پیتا بچہ ہے۔ جو اس قسم کے لاڈ لگھارتا ہے۔" پھر انہوں نے اٹھ کر مجھ کو دھواں دھوں پیٹ ڈالا۔ میں مار کھا کر روتا ہوا چھوٹے کمرے میں چلا آیا۔ بچا۔ می خالہ مارنے کی آواز سن کر بھاگی ہوئی آئیں۔ اور دروازے کے قریب کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے میرا بازو چھو کر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سر ہلا دیا۔ اور سسکیاں بھرتا ہوا الگ جا بیٹھا۔ انہوں نے لپک کر مجھے بڑی مشکل سے گود میں اٹھا لیا اور اپنے کمرے میں لے گئیں۔ بہت پیار کیا۔ کہنے لگیں۔ "تو میرا ننھا سا بچہ! آنکھوں کا تارا ہے۔ بتا میرا کیا قصور ہے۔ وہ بات میں نے تو ابا کو نہیں کہی امی ہی نے تو کہی۔ اچھا! ہم امی سے بھی بدلہ لیں گے۔" اس کے بعد انہوں نے مجھے ایک چونی خرچ کرنے کے لئے دی۔

گھر کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ ابھی تک یہ بھی طے نہ کر سکا کہ گھر کے اندر کیونکر جاؤں۔ شاید ابا گھر پر موجود ہوں۔ نہ معلوم کس قدر خفا ہوں۔ پوچھیں کہ صبح سے کہاں تھا..... کاش! ابا گھر پر نہ ہوں امی سے تو خیر نپٹ لونگا اگرچہ وہ کتوں سے سخت متنفر تھیں۔ اگر ضد پر آ گئیں تو کتے سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ آخر کار یہ ترکیب سوجھی۔ کہ چپکے سے پہلے خالہ کے کمرے میں گھس جاؤں اور وہاں سے اپنے گھر کے حالات معلوم کر لوں۔

چنانچہ چبوترے کے ساتھ ساتھ قدم ناپتا ہوا سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ اور دم سادھے

www.taemeernews.com

دبے پاؤں ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر ایک دم کمرے کی کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ خوش قسمتی سے خالہ آئینے کے سامنے کھڑکی کے قریب کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں میں پہنچا تو بدک کر پیچھے ہٹ گئیں۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ ان کے لئے اچنبھے ہی کی بات تھی۔ مجھے دیکھ کر دم میں دم آیا۔ لیکن سانس ابھی تک سینہ میں نہ سماتا تھا۔ "میں تو ڈر ہی گئی ...... ارے آج تو چوروں کی طرح ......" میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ حیران تھیں کہ آخر بات کیا ہے۔ میں نے کچھ نہ بولا۔ صرف رومال ہٹا کر جھولی آگے کر دی۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹیں۔ پھر ایک ہاتھ میں کنگھی دوسرے میں بالوں کی لٹیں سنبھالے آگے کو جھکیں۔ جھک کر دیکھنے لگیں۔ پھر انہوں نے ہاتھ بڑھا کر پلے کو چھو کر انگلی فوراً پیچھے ہٹا لی۔ ۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا "چھو لیجئے آپ ڈرتی کیوں ہیں۔ کیا یہ کاٹ کھائے گا؟" لیکن اس بات سے وہ گھبرا گئی تھیں بہت کچھ کہنے سننے کے بعد انہوں نے پلے کی کمر پر سے ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ "ہی کس قدر خوبصورت ...... نرم ...... گدگدا ......"

میں نے بتایا کہ چچا کے ہاں سے لایا ہوں ...... وہ خاں صاحب چچا میں نا: انگریزی کتا ہے یہ۔"

"ہائے کتنا پیارا ہے یہ" انہوں نے ہلکی سی تالی بجا کر کہا۔ "لاؤ میں ذرا گود میں اٹھا لوں"

"ارے آپ تو بڑی بہادر ہو گئیں ...... ابھی تو چھونے سے دم نکلتا تھا۔" انہوں نے پلے کو اس طرح لے لیا۔ جیسے وہ روئی کا گالا ہو۔ مسرت کے مارے باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ "اس کا نام کیا رکھو گے؟"

www.taemeernews.com

قدرے سوچ کر میں نے کہا "بھئی اس کا نام جیک ... رہے گا"

خالہ جیک جیک کہہ کر اس کو پکارنے لگیں جیسے وہ اپنے ہی تو کہنے لگے تھا۔

یہ پوچھنے پر کہ ابا گھر پر تو نہیں نا! انہوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ میں نے کہا ذرا جیک کو گلے لگا لیجئے۔ بولیں بھئی میں پہلے کنگھی کر لوں پھر قمیص پہن کر آ جاؤں۔ اگر بہو (امی) اس طرح دیکھ پائیں گی تو مفت میں خفا ہو جائیں گی۔"

"قمیص پہن کر ذرا بستر لگا دیجئے۔ کنگھی پھر کر لیجئے گا" میں نے منت سے کہا۔

"بھئی بیٹا وہ اس طرح قمیص پر بال جو گر پڑیں گے"

"آپ میری خالہ نہیں کیا؟ جا بیٹھئے نا . . . آپ کی قمیص پر بال گر پڑیں گے تو میں چن دوں گا"

بڑی مشکل سے گئیں اور پتہ لگا کر آئیں کہ ابا گھر نہیں ہیں اور امی پچھلے کمرے میں چارپائی پر بیٹھی جرابیں بن رہی ہیں۔

جیک کو بغل میں دبایا اور آہستہ آہستہ آگے میں پیچھے پیچھے خالہ . . . پہلے اندر جھانک کر دیکھا اور پھر لپک کر جیک کو امی کی گود میں ڈال دیا۔ پہلے تو گھبرا کر وہ کھٹنے کو اچھالنے لگیں لیکن جب انہوں نے چھوٹا سا پلا دیکھا تو ہاتھ اٹھا کر چلانے لگیں۔ خالہ نے پلا اٹھا لیا۔ امی کے دم میں دم آیا۔ بولیں یہ کتا یہاں نہیں رہے گا۔ یہ پلید جانور ہے۔

"تو امی چچا کے گھر میں بھی کتے ہیں . . ."

"وہ بڑے آدمی ٹھہرے۔ پھر ان کے ہاں وسیع جگہ ہے یہاں کتا رکھنے کو جگہ کہاں ہے۔ ایک بڑا کمرہ اور ایک چھوٹا آخر یہ کتا رہے گا کہاں؟ اور پھر کھائے گا کیا؟"

اسی ہنگامے میں برآمدے میں ابا کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ انہوں نے

www.taemeernews.com

دروازہ کھٹکھٹایا۔ امّی دروازہ کھولنے کے لئے گئیں۔ ادھر خار بھی شاک گئیں۔ میں اکیلا رہ گیا۔ بڑا گھبرایا۔ جلدی سے جیک کو کرسی پر رکھ کر الماری میں اپنی کتابوں کو ہلانے جلانے لگا۔ ابّا نے جھوٹتے ہی سوال کیا۔ یہ کیا شور تھا؟ امّی نے بلند آواز میں کتے کا قصّہ دہرایا۔ ابّا ہاتھ پر تیوریاں ڈالے اس طرف آئے۔ میں سکین صورت بنائے کتابیں اِدھر اُدھر رکھ رہا تھا۔ جیسے مجھ کو اس قصّہ سے کچھ سروکار ہی نہ ہو۔

جیک آنکھیں بند کئے کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابّا کچھ دیر کھڑے کھڑے اس کی طرف دیکھتے رہے لیکن ماتھے پر بل بدستور قائم تھے۔ امّی بولیں "کھانا لاؤں؟" ابّا نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ امّی کھانا لانے کے لئے باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ اور ابّا چارپائی پر بیٹھ گئے۔ جیک کی کرسی نزدیک گھسیٹ لی۔ آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگے "بہت اعلیٰ نسل ہے"

میں مسرت کو دبا کر نہایت سنجیدگی سے نصاب کی کتاب ہاتھ میں لئے ان کے قریب چلا گیا "ابّا جی! چچا کہتے تھے کہ اس کا ابّا بھی انگریزی نسل کا ہے۔ اور اس کی ماں بھی، لیکن دونوں کی نسل جدا جدا ہے"

"ہاں ہاں ..... لیکن یہ انگریزی نسل کا ہونا! بہت اعلیٰ نسل ہے"

امّی دودھ کا پیالہ اٹھائے اندر داخل ہوئیں ..... ابھی میں اس کو کہہ رہا تھا کہ کتا واپس کر دے۔ ہم اسے کہاں رکھیں گے کیا کھلائیں گے؟"

ابّا کے ماتھے کے بل اور گہرے ہو گئے۔ لیکن بولے نہیں۔

پھر امّی ابّا کو پنکھا جھلتی رہیں اور کتے کے خلاف بولتی رہیں۔ ابّا بالکل خاموش رہے

www.taemeernews.com

کھانا کھا لینے کے بعد انہوں نے تولیئے سے مونچھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ تھوڑا سا دودھ لے آؤ۔"

امّی لمحہ بھر کے لئے بے حس و حرکت کھڑی رہیں۔

ابّا نے دوبارہ اپنی بھاری اور بے کیف آواز میں کہا۔" دودھ لے آؤ۔"

امّی چپکے سے دودھ لے آئیں۔ ابّا نے ایک ٹوٹی ہوئی پلیٹ دھو کر اس میں دودھ ڈالا اور جیک کے آگے رکھ دی۔ لیکن جیک کا سوائے اوں اوں کرنے کے اور کسی طرف دھیان ہی نہ تھا۔ ابّا دودھ کی پلیٹ اس کی ناک کے قریب لے گئے لیکن اس نے دودھ پینا تھا نہ پیا۔ اب میں اٹھا اور ایک ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کر اس کا سر دودھ میں ڈبو دیا۔ لیکن جیک نے دودھ نہ پیا۔ دودھ اس کی تھوتھنی سے بوند بوند کر کے ٹپکنے لگا۔ خالہ چھپ کر کھڑی کھڑی ہنس رہی تھیں۔ امّی نے کپڑے کے ٹکڑے سے جیک کا منہ پونچھ دیا۔

جب ابّا کسی بات پر اڑ جائیں تو امی بھی ہامی بھرنے لگتیں۔

کچھ دیر تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ جیک اندھا دھند ادھر اُدھر لپکنے لگا۔ ابّا نے کہا "ابھی رہنے دو۔ بھوک لگے گی تو خود ہی پی لے گا۔"

امّی بدستور جراب بننے لگیں۔ ابّا دوسرے کمرے میں چلے گئے تو خالہ چھپ سے اندر آ کر کولھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئیں۔

میری فاتحانہ نظریں امّی سے ملیں تو امّی نے ملامت آمیز محبت کے ساتھ مسکرا کر کہا۔" اسے یہ کالا کلوٹا اٹھا لایا۔ چتکبرا یا سفید لایا ہوتا۔"

www.taemeernews.com

پہلے دو تین دن تک جیک رات بھر چیختا رہا۔ کسی کو سونے نہ دیا۔ لکڑی کے خالی کھوکھے میں ٹاٹ ڈال کر اس پہ جیک کو بٹھا دیا گیا۔ بعد ازاں اس میں پانی اور دودھ بھی رکھ دیا گیا۔ خالہ نے ایک چھوٹا سا گدیلا سیا۔ لیکن جیک رات کے وقت پانی وانی گرا کر اسے بھگو دیتا تھا۔ خالہ صبح ہی صبح گدیلا اٹھا کر سوکھنے کے لئے دیوار پہ ڈال دیتیں۔ اور جب عادت کہیں پڑ جاتی! بچارے کو نمونیا نہ ہو جائے کہیں"۔ ان دنوں ہم بہت تنگدست تھے۔ تاہم جیک کے لئے ہر روز ایک پاؤ دودھ لینے لگے۔ پہلے دو چار روز تو جیک نے سوائے شور مچانے کے اور کوئی کام نہیں کیا۔ نہ دودھ پیتا نہ روٹی کھاتا۔ عجب مشکل تھی۔ ایک ترکیب سوجھی۔ روٹی دودھ میں بھگو کر جیک کا منہ کھولتے۔ اور وہ منہ چھڑانے کی کوشش کرتا لیکن ہم کہاں چھوڑنے والے تھے۔

جیک عموماً پڑا سویا کرتا۔ جب وہ پاؤں پھیلائے ٹاٹ پر پڑا سویا کرتا تو ٹاٹ پر کالی مخمل کا پیوند دکھائی دیتا تھا۔ الٹے دکے دانے کی طرح اس پہ سفیدی نام کو نہ تھی۔ ابا باہر سے آ کر کھانا کھانے کے بعد جیک کو اٹھا کر سامنے کی کرسی پہ بٹھا دیتے۔ چٹکی بجا بجا کر اس کا نام لے کر پکارتے "جیک، جیک! جیکی! جیکی ..." لیکن جیکی اندھوں کی طرح ادھر اُدھر ہل جل کر رہ جاتا۔

ایک دن ہم سب بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ اتنے میں چھوٹے کمرے کے دروازے پر کھٹکا ہوا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا تو خالہ اپنی مہندی لگی انگلیوں سے اشارے کر رہی تھیں۔ میں اٹھا۔ خالہ خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھیں۔ منہ میرے کان کے قریب لے آئیں۔ شاید الائچی چبا رہی تھیں۔ ان کے منہ سے خوشبو کا ایک بھبکا سا نکلا۔ بولیں "جیکی نے آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں لپک کر آگے بڑھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ

www.taemeernews.com

جیک آنکھیں کھولے ٹک ٹک دیکھ رہا ہے۔ میرے منہ سے مسرت کی ایک چیخ نکل گئی۔ میں نے جھپٹ کر اس کو اٹھا لیا اور بھاگا بھاگا ابا کے پاس پہنچا۔ "ابا! دیکھئے جیکی نے آنکھیں کھول دی ہیں۔"

ابا نے جیک کو گود میں بٹھا لیا۔ امی بھی جھک جھک کر دیکھنے لگیں۔ خالہ دروازے کے قریب ابا کی نظروں سے ہٹ کر کھڑی مارے خوشی کے ہاتھ پر ہاتھ رگڑ رہی تھیں۔ کبھی کمسن لڑکیوں کی طرح اچھلنے لگتیں۔

ایک ڈیڑھ مہینے تک جیک سب کو پہچاننے لگا۔ پہلے پہل تو امی کو بھی بہت دقت ہوئی۔ مہترانی کو بلا کر اس کی خلاصت اٹھوانی پڑتی۔ لیکن جلد ہی وہ "حاجت ضروری" کے لئے باہر جانے لگا۔

پچھلے دنوں میں ابا سیر و شکار کے بہت شوقین تھے۔ کتوں سے بھی انس تھا ——— جیک کا رنگ ہی کالا تھا۔ ورنہ تھا "اصلی" انگریز کتا۔ تھا بے وقت روٹی نہ کھاتا تھا۔ اسے دن میں دو مرتبہ باقاعدگی وقت کے ساتھ کھانے کو دودھ روٹی ملتی۔ پھر وہ آرام سے پڑا رہتا کیا مجال جو دن میں کوئی کھانا کھائے اور وہ للچائی نظروں سے دیکھے۔ اس کے بال چھوٹے تھے۔ لیکن بہت ملائم اور از حد چمکیلے۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ پہلے پہل جب وہ رات کے وقت چلاتا تو ابا اس کو اپنی کھاٹ پر بٹھا لیتے۔ امی کو پلید جانور کا سفید بستر پر بیٹھنا سخت ناگوار گذرتا تھا۔ لیکن لاچار تھیں۔ اور اب تو جیک خیر سے کسی اور جگہ سونے پر رضامند ہی نہ ہوتا تھا۔ اگر اس کو کھو کھے میں سلا دیا جاتا تو رات کو ابا کی چارپائی کے قریب جا کر زور زور سے بھونکنے لگتا۔ ابا اس کو پائنتی کی طرف ڈال لیتے۔

www.taemeernews.com

آرام سے چپ چاپ پڑا سوتا۔ اگر کبھی رات کو ابا کے پاؤں حرکت کرتے تو وہ سمجھتا کہ وہ اس کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ چنانچہ وہ کسمسا کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ لاڈ میں غراتا، بھونکتا۔ کبھی اچک کر آگے بڑھتا، کبھی پیچھے ہٹتا اور کبھی پاؤں کا انگوٹھا منہ میں لے لیتا۔

جو کبھی میں سنیما دیکھنے کے لئے چلا جاتا۔ ابا بھی دیر سے گھر آتے تو امی چارپائی پر بیٹھی ان کا انتظار کرتیں۔ اس وقت جیک امی کی چارپائی کے نیچے دبکا بیٹھا ہوتا اور اگر کوئی ذرا سی آواز سنائی دے جاتی تو فوراً بھونکنے لگتا۔ امی کہتیں "جیکی اب تو مجھے ڈر نہیں لگتا۔"

پہلے پہل جب کبھی ابا گھر پر آتے تھے تو اگر ہم لوگ بولتے بھی ہوتے تو خاموش ہو جاتے۔ عموماً کھانا امی اور میں بیٹھے آپس میں ہنسی مذاق کرتے، خوشی میں ہنستے چلاتے اور جونہی ابا کے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی خاموشی سے اپنے کمرے کو چل دیتے۔ میں کوئی کتاب اٹھا لیتا اور امی دروازہ کھولنے چلی جاتیں۔ ابا کے ماتھے پر پہلے ہی کئی تیوریاں ہوتیں۔ گھر کے اندر داخل ہوتے تو ان کی تعداد میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ لیکن اب وہ آتے تو سب سے پہلے جیک کو ان کے آنے کی خبر ہو جاتی۔ وہ سب سے پہلے دروازے کے قریب پہنچتا۔ چونکہ دروازے کی کنڈی اندر سے چڑھی ہوتی تھی، اس لئے دروازہ پنجوں سے کھرچتا۔ اگر اتنی دیر میں امی پہنچ جاتیں تو بہتر ورنہ وہ اپنی مخصوص آواز میں جنیاہی سے ساتھ بھونکتا ہوا امی جہاں کہیں بھی بیٹھی ہوتیں، ان کے پاس پہنچ جاتا۔ جب دروازہ کھلتا تو جیک کود کر ان کے پاؤں میں پہنچ جاتا۔ اس کی تیزی سے ہلتی ہوئی دم ریت پر پڑی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپتی سی نظر آتی تھی۔ پانچ سات منٹ تک لاڈ کرتا۔ اس دوران میں اگر ابا ذرا بھی کسی اور طرف دھیان کرتے تو وہ بھونک بھونک کر ان کو اپنی طرف متوجہ کرتا۔

www.taemeernews.com

عموماً ہوتا یہ کہ جونہی ابا اندر آتے وہ پتلون کی کریز کا خیال کئے بغیر پاؤں کے بل اکڑوں بیٹھ جاتے اور جیکی اچھل اچھل کر پیار کرتا۔ ابا کے خشونت انگیز چہرہ پر مسکراہٹ آجاتی۔ اور وہ بچوں کی طرح چلانے لگتے "ہو ہو ہو جیکی! یو جیکی!!" پھر وہ اس کو دونوں ہاتھوں سے تھپتھپا کر کہتے "میرے گھر پہنچنے کی جیکی کو سب سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔"

جب ابا پلنگ پر بیٹھے ہوتے تو جیک کو گود میں بٹھا لیتے۔ جیکی کی صورت سے تفاخر کے جذبات صاف عیاں ہوتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بڑی بھاری ہستی محسوس کرتا تھا۔ اگر ہم میں سے کوئی اس کو چھونے کی کوشش کرتا تو وہ غرّانے لگتا۔ یعنی اس وقت وہ کسی اور کے پاس جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ ہم بار بار اس کو چھونے کی کوشش کرتے اور جب وہ غرّاتا تو ابا کہتے "بھئی ٹھہرو اس وقت جیکی ہمارے پاس ہی بیٹھے گا" ـــــ اور ان کی سرخ کنپٹیوں کے قریب آنکھوں کے گوشوں کی جھرّیاں اور بھی گہری ہو جاتیں۔

رفتہ رفتہ جیکی بہت سمجھدار ہو گیا۔ وہ سب کو پہچانتا تھا۔ گھر کے لوگ جب اکٹھے بیٹھے ہوتے تو وہ کبھی زمین پر بیٹھنا پسند نہ کرتا تھا۔ اس لئے اسے اسٹول پر بٹھایا جاتا تھا۔ اسٹول پر بڑی متانت سے وہ اس انداز میں بیٹھتا جیسے وہ سب کی باتیں سنتا ہو اور بعض اوقات سر گھما گھما کر ہماری طرف اس انداز سے دیکھتا جیسے وہ سب کچھ سمجھتا بھی ہو۔ رات کو پائنتی پر سوئے سوئے اگر کہیں پیشاب کی حاجت ہوتی تو اٹھ کر زور زور سے بھونکنے لگتا۔ چونکہ چھوٹا سا تھا اس لئے تاریکی میں پلنگ سے چھلانگ لگاتے ہوئے اسے ڈر معلوم ہوتا تھا جب اسے نیچے اتارا جاتا تو دروازے کے پاس جا کر بھونکنے لگتا۔ دروازہ کھلتے پر وہ باہر جاتا اور پیشاب کرنے کے بعد لوٹ آتا۔

امّی اس کو باورچی خانے میں نہ گھسنے دیتی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم باورچی خانے

www.taemeernews.com

میں چوکیوں پر بیٹھے کھانا کھاتے۔ اس وقت جیک کو باورچی خانے سے باہر دروازے کے قریب بیٹھنا پڑتا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ میں بیٹھا بے چینی سے پہلو بدلتا۔ ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا لیکن امی کے خوف سے اندر داخل نہ ہوسکتا تھا۔ وہ یہ بات ہرگز نہ سمجھ سکتا تھا کہ آخر اس کے لیے یہ ممانعت کیوں تھی۔ امی گاہے بگاہے پلکیں اٹھا کر خشمگیں نظروں سے اس کی طرف دیکھتیں۔ اس وقت جیک کی حرکات قابلِ دید ہوتی تھیں اور اگر امی کی توجہ اس کی طرف نہ رہتی۔ تو وہ دبانے چپکے سے چوروں کی طرح دبے پاؤں ہمارے پیچھے آکر بیٹھ جاتا۔ معاً امی دروازے کی طرف دیکھ کر کہتیں "ارے جیک کہاں گیا" اس وقت جیک ہم دونوں کے بیچ میں سے تھوتھنی نکال ان کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھتا۔ ہم اس کی یہ حرکات دیکھ دیکھ کر ہنسی کے مارے دوہرے ہوجاتے۔ ابا سفارش کرتے۔ "اچھا رہنے دو۔ بیٹھا ہے اپنا چپکے سے۔"

جب ابا گھر پر نہ ہوتے تھے تو خالہ جان کے کمرے میں ہم دونوں گڑیوں کے کھیل کھیلا کرتے۔ اب ہم جیک کو بھی شامل کر لیتے تھے۔ کبھی دلہا دلہن کو ڈبے کی بگھی میں بٹھا کر جیکی کو گھوڑا بنایا جاتا۔ کپڑے کے لمبے ٹکڑوں سے بگھی کے دونوں سرے باندھ کر جیک کی گردن بیچ میں پھنسا دیے جاتے۔ جیکی کو میں قابو میں رکھتا اور اس طرح وہ دلہا دلہن کی بگھی گھسیٹتا۔ کبھی تو وہ یہ کام اچھی طرح کر دیتا۔ اور کبھی اچھل کود کر اپنی بے اعتنائی کا اظہار کرتا ایک دن بہت مزا آیا۔ بگھی کے اندر گڈا اور گڑیا ٹھنسے بیٹھے تھے۔ جیک بگھی کے آگے جُتا ہوا تھا۔ اتنے میں ابا باہر سے آئے۔ انہوں نے باہر سے جیک کا نام لیکر جو پکارا۔ جیک بے قابو ہو کر سرپٹ بھاگا تو بگھی دڑبڑاتا سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ ابا حیران تھے کہ آخر اس کے گلے میں کیا بلا بندھی تھی۔ جب اصل حال معلوم ہوا تو مجھ کو گالیاں سننی پڑیں۔

www.taemeernews.com

ایک مرتبہ اسی طرح کھیلتے کھیلتے جیک چارپائی کے نیچے سے نکلا دبے پاؤں آگے بڑھا اور پھر جھپٹ کر گڈے کو اس کی چھوٹی سی کرسی سے منہ میں دبوچا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ ادھر خالہ ادھر میں شور مچاتے اس کے پیچھے ہو لئے۔ جیک کی چمکیلی آنکھوں سے شرارت صاف عیاں تھی۔ وہ کان سمیٹے تیر کی سی تیزی کے ساتھ کمرے سے غائب ہو گیا۔ ہم نے بہتیرا اس کو ادھر اُدھر ڈھونڈا لیکن سب بے سود۔ آخر بڑی مشکل سے معلوم ہوا کہ وہ اوندھے ٹب کے نیچے دبکا بیٹھا ہے۔ ٹب اٹھایا تو دیکھا کہ گڈے کے پھوسڑے اُڑ چکے ہیں۔ اس پر خالہ منہ لپوڑنے لگیں۔

ایک روز چارپائی پر لیٹا میں ایک رسالہ پڑھ رہا تھا۔ آپا باہر گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں صحن سے امی کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ امی نے گھی کا ڈبہ دھوپ میں رکھا تھا تاکہ خوب پگھل جائے۔ کوئی پاؤ ڈیڑھ پاؤ گھی تھا کہیں جیک کی نظر پڑ گئی۔ نہ معلوم وہ کیا سمجھ کر سارا گھی پی گیا۔ خالہ گھبرائی ہوئی قریب کھڑی تھیں۔ جیک کا پیٹ خوب پھولا ہوا تھا۔ اس کی پھرتی مفقود ہو چکی تھی۔ بھاری بھرکم قدموں سے ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔

ہم سب پریشان ہو رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا اس کو اتنا گھی مضم نہیں ہوگا۔ اور وہ ضرور ہیضہ کرے گا کسی صورت بچ نہیں سکتا۔ خالہ نے چورن کھلانے کی رائے دی لیکن میں نے سوچا نہ معلوم چورن سے کچھ خرابی ہو جائے۔ جیک کی صورت سے بے چینی کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ البتہ معلوم ہوتا تھا جیسے کہ وہ غنودگی سی محسوس کر رہا ہو۔ امی نے تجویز پیش کی کہ اسے باہر گھما لاؤں شاید اس طرح گھی ہضم ہو جائے۔ چنانچہ میں اسے زنجیر سے باندھ کر گھمانے کے لئے لے گیا۔ وہ پھرتی کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے پھولے

www.taemeernews.com

ہوئے پیٹ کے نیچے اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں مشکل دکھائی دیتی تھیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گھمانے کے بعد میں واپس آیا۔ ہمارے تبہات غلط نکلے۔ جیک کو نہ بدہضمی ہوئی اور نہ اس کو ہیضہ ہی ہوا۔ اگرچہ رات بھر ہم فکرمند رہے لیکن دوسرے دن اس کا پیٹ بالکل ہموار دیکھ کر دل کو تسلی ہوگئی۔ ہم سنتے آئے تھے کتے کو گھی ہضم نہیں ہوتا نہ معلوم جیک نے کیسے ہضم کر لیا۔

سردیوں کی آمد آمد تھی۔ جیک قد سے بڑا ہوگیا تھا۔ اس کیلئے دودھ بھی بجائے پاؤ بھر کے آدھ سیر آنے لگا تھا۔ اگرچہ دودھ دوتی صبح شام ہی ملتی تھی لیکن اب دوپہر کو چند بسکٹ بھی کھلائے جاتے تھے۔ کچھ دنوں بعد جیک کچھ کمزور سا نظر آنے لگا۔ پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ اب وہ بڑھ رہا ہے۔ اس لئے کمزور دکھائی دیتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اب وہ کچھ مضمحل سا نظر آتا تھا۔

ایک روز ابا کے ایک دوست ملنے کے لئے آئے۔ جیک کو دیکھ کہنے لگے۔ اچھی نسل کا کتا ہے۔ لیکن ہم دیسی لوگ ان کو پال نہیں سکتے۔ ان کتوں کی غذا و پرداخت ماہر شخص ہی کر سکتا ہے۔ ابا نے بتایا کہ پہلے جیک خوب موٹا تازہ تھا۔ لیکن اب نہ معلوم اس کو کیا ہوگیا ہے۔ کوئی خفیہ روگ ہے جس کا علم نہیں۔ غالباً معدے میں گڑبڑ ہے۔ فراغت بھی ٹھیک نہیں ہوتی۔ بھوک بھی کم لگتی ہے۔ اب پہلے کی طرح چونچال بھی نہیں رہا۔ ابا کے دوست نے بتایا کہ اس حالت میں اس کے دودھ میں تھوڑی سی پسی ہوئی گندم ملا دیا کریں۔

یہ نسخہ بھی آزمایا گیا۔ پہلے تو کچھ افاقہ معلوم ہوا لیکن اس دوا کا اثر دیرپا ثابت نہ ہوا۔

www.taemeernews.com

رفتہ رفتہ جیک بالکل دل شکستہ رہنے لگا۔ یونہی مضمحل سا ایک جگہ پڑا رہتا۔ دودھ کی پیالی کو پہلے سونگھتا پھر کبھی تھوڑا سا زبان سے لپلپاتا ــــ لیکن کبھی پیالہ بھر نہ پیتا تھا۔ اب اگر ابا کے پاؤں کی آہٹ آتی تو وہ دروازے تک جاتا ضرور لیکن وہ جوش و خروش مفقود تھا۔ ابا چارپائی پر بیٹھ جاتے تو یہ چھوٹے کمرے میں واپس آکر اپنے بوریئے پر بیٹھ جاتا۔

ہم روز اسی کا ذکر کرتے۔ بسکٹ کے ٹکڑے اس کے آگے ڈالتے۔ اس کے ساتھ گیند لڑکاتے۔ لیکن سب بے سود۔ جو دوا کسی نے بتلائی کھلائی گئی لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔

ایک دن ابا ایک شخص کو ہمراہ لائے اس نے بڑے غور سے جیک کو دیکھا بھالا۔ اس کی آنکھیں، پیٹ اور رانیں ٹٹولیں۔ پھر ابا نے اس کو ایک روپیہ دیا۔ وہ بولا یہ کتا بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔ ہم سب بہت خوش ہوئے۔ ابا نے مجھ کو اس کے ساتھ بھیجا۔ اور میں اس کے گھر سے دوا لے آیا۔

دوسرے دن جیک کچھ بہتر ہو گیا۔ ابا جیک کے لئے ایک بہت عمدہ سا پٹکا لائے جس میں رنگ رنگے ہوئے سفید سفید بڑے بڑے کیل جڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بہت مہین اور خوبصورت سی زنجیر تھی۔ اس دن شام کے وقت میں جیک کو نئے پٹکے اور اور نئی زنجیر کے ساتھ گھمانے لے گیا۔ ابا کہنے لگے اب جیک بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔

تین چار روز بعد جیک پر کچھ ایسا شدید ردِ عمل ہوا کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گیا۔ بس بوریئے پر لیٹا رہتا۔ ابا باہر سے آتے تو وہ اٹھنے کی کوشش کرتا لیکن اٹھ نہ سکتا تھا۔ چنانچہ ابا جب اس کے قریب جاتے تو پچھے پچھے دم ہلا کر پیار کر لیتا۔

اس کے بعد اسکی آنکھیں بند رہنے لگیں۔ اگر کھلی بھی ہوتیں تو پتھرائی ہوئی سی۔ ہم سمجھ

www.taemeernews.com

یہ حالت دیکھ کر بہت گھبرائے۔ اقی نے ابا سے کہا کہ جیک کو حیوانوں کے ہسپتال لے جائیں۔ چونکہ وہ چلنے سے معذور تھا اسلئے میں نے اسے تولیہ میں لپیٹ کر اٹھالیا اور ابا کے ساتھ حیوانوں کے ہسپتال میں پہنچے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کی فیس لی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ ہم ان دنوں بڑی مشکل سے گذر کرتے تھے۔ خیر ابا نے فیس دے دی۔ اور جیک کی بیماری کا طویل بیان دیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ اب اس کی حالت بہت نازک ہے۔ اس کے بعد وہ انگریزی میں ابا سے باتیں کرنے لگا۔ ابا نے اپنے ہاتھ سے اپنی ناک کو قدرے رگڑا۔ دوائی کے دام دیکر کسی کام سے چلے گئے۔ اور میں جیک کو لیکر گھر آیا۔

تھوڑی دیر بعد ابا بھی آگئے۔ ہم گئی رات تک جیک کے پاس بیٹھے رہے۔ جیک بیحس و حرکت پڑا رہا۔ کئی مرتبہ خالہ جیک کا حال پوچھنے آئیں۔ چونکہ ابا جیک کے پاس بیٹھے تھے اس لئے باہر سے لوٹ جاتی تھیں۔

دوسرے دن علی الصبح میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ابا اور اقی جیک کے قریب بیٹھے ہیں میں بھی اٹھ بیٹھا۔ چارپائی سے اتر کر ان کے قریب گیا دیکھا کہ جیک بڑی بری حالت میں ہے اس کی خوشنما کھال بھدی میلی اور ڈھیلی ہو چکی تھی۔ وہ ایک پہلو پر لیٹا تھا۔ ایک کان پیچھے کو الٹ گیا تھا۔ کان کے اندر قدرے سرخ گوشت دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھیں بے نور تھیں مکھیاں اڑانے کے لئے وہ کان تک نہ ہلا سکتا تھا۔ وہ ٹانگیں جو صحت کی حالت میں ڈھیلی اور قدرے خمدار تھیں اب اکڑ کھنچ کر سیدھی ہو گئی تھیں پیٹھ کے منکے صاف نظر آرہے تھے۔ اسکی حالت بڑی قابل رحم تھی اقی گرم پانی والی ربڑ کی بوتل سے اس کو ٹکور کر رہی تھیں۔ جیک کو نہ معلوم کیا مرض تھا۔ وہ بالکل خاموش اور بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ابا ذرا جھک کر ملائم آواز میں اس کا نام لیکر اس کو پکارنے لگے "جیکی! ..... جیکی!!"

www.taemeernews.com

جیسے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ بہت مشکل سے۔۔۔۔ پھر جیسے اس نے پہچان لیا ہو۔ صرف اس کی دم میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی۔ دم ایک مرتبہ فرش سے ذرا سی اٹھی۔ اور پھر گر پڑی۔۔۔۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ جیسے پپوٹوں پر اس کا قابو نہ رہا ہو۔۔۔۔ اس کے بعد سینہ نیچے ہوا اور پھر نہ اُٹھا۔۔۔۔ اس کا دم نکل گیا۔

وہ صبح بہت ہی بھیانک تھی۔ ہوا میں خنکی تھی۔ چمکدار دھوپ سایوں کو دھکیلتی دیوار کے اُوپر سے نیچے کی طرف اُتر رہی تھی۔ گھڑونچی پر رکھے ہوئے گھڑوں اور دروازوں پر بیٹھی ہوئی اور چڑیاں پھدکتی پھر رہی تھیں۔

جیک دیوار کے ساتھ بورے پر سفید کپڑے سے ڈھکا پڑا تھا۔ اس کی کالی کالی پتلی ٹانگیں کپڑے سے باہر نکل آئی تھیں۔۔۔ ابّا دوسرے کمرے میں بیٹھے قینچی سے انگلیوں کے ناخن کاٹ رہے تھے۔ امی چھوٹے کمرے میں چارپائی سے پاؤں لٹکائے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے عجیب بے ڈھنگے طریقہ سے بیٹھی تھیں۔۔۔ اور باجی یونہی رسی کے ایک ٹکڑے میں بل دیے جا رہی تھی۔۔۔ خالہ کے میاں دفتر کو روانہ ہو چکے تھے۔ ان کے جانے کے بعد خالہ عموماً ہلکے سروں میں کوئی گیت گنگنایا کرتی تھیں اور پھر غسل خانے میں دھوپ لگنے تک نہانے دھونے میں صرف کرتیں۔۔۔ آج وہ دروازے میں خاموش کھڑی تھیں۔ اور وہ اپنی سفید موم بتی کی سی انگلی سے ناک کی چمکتی ہوئی کیل کو بار بار بے خبری کے عالم میں چھو رہی تھیں۔

ہم میں ہر ایک اپنے بشرے سے یہی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔

---

www.taemeernews.com

پنجاب کا البیلا

یوں تو اس وقت میری عمر چودہ برس کی تھی لیکن میں اس قدر دبلا پتلا اور نحیف سا لڑکا تھا کہ بمشکل گیارہ بارہ برس کا دکھائی دیتا تھا۔

ان دنوں میں شہر کے ایک اسکول میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور بورڈنگ میں رہتا تھا۔ بورڈنگ تو برائے نام ہی تھا۔ اسے گھوڑوں کا اصطبل کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ شہر سے باہر ایک کچی سڑک کے کنارے ایک پرانی سی عمارت تھی جس کے اردگرد کچھ جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ عمارت کیا تھی کوٹھی، اندر گیا اس کا ایک حصہ بنا قلعہ تھا جس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک برآمدہ تھا۔ وہیں کمرے بنے ہوئے تھے۔ سے الگ کچھ کمرے تھے۔ ان میں سے اکثر کمرے باہر سے آنے والوں کے قبضے میں تھے، ساتھ ادا کرتی تھی۔ کمرے بہت بڑے بڑے تھے اور ایک ایک میں کئی کئی لڑکے رہتے تھے۔ ہر لڑکے کے لئے ایک الماری، ایک چارپائی، ایک کرسی اور ایک میز مخصوص تھی۔

باورچی خانہ الگ تھا۔ لڑکوں کے سپرد تھا۔ رسوئی میں تین نوکر تھے۔ ایک باورچی اور دو نوکر کھانا کھلانے اور دوسرے کام کرنے کے لئے۔

باورچی خانے میں کوئی نئے طور سے آتی تھی، جب تک سب باہر نہ

www.taemeernews.com

لڑکے کتے گھی اور گیہوں گھروں سے آجاتے تھے۔ اور ضروریات کی باقی چیزیں مثلاً ایندھن سبزی ترکاری مار دھاڑ سے حاصل کی جاتی تھی۔ ہوسٹل کے پیچھے ایک ارائیں کے کھیت تھے۔ اس ارائیں کی ایک طرح دار لڑکی اور دو بچیلے بیٹے تھے۔ دن بھر لڑکے ہوسٹل کی چھت پر بیٹھے لڑکی کو آنکھیں مار مار کر اشارے کرتے اور راتوں کو کھیتوں سے تازہ سبزیاں اڑا لاتے۔ بچارے ارائیں نے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ سے ان لڑکوں کی شکایتیں کیں۔ لیکن بچارا سوکھے ہوئے چہرے والا سپرنٹنڈنٹ اپنی داڑھی کھجلا کر رہ جاتا۔ وہ خود ناچار تھا۔ ارائیں کو تشفی دے کر واپس بھیج دیتا اور لڑکوں سے محض زبانی باز پرس کرتا۔۔۔ لیکن لڑکوں کے معمول میں کبھی فرق نہ آیا۔

سپرنٹنڈنٹ بچارا سکھ تھا۔ خوب لمبی لہراتی ہوئی داڑھی۔ چھوٹی پیلے رنگ کی پگڑی پر اس کا یہ بڑا نیلے رنگ کا صافہ۔ تنگ پائجامہ، ڈھیلا ڈھالا کوٹ۔ اس کا ازار بند اس سے کبھی نہیں سنبھلتا تھا ہمیشہ نیچے لٹکتا رہتا۔ ہر روز بلا ناغہ گوردوارے جا کر پاٹھ کرتا ۔۔۔۔ وہ لڑکوں کی اس زیادتی کے سخت خلاف تھا لیکن ہوسٹل میں اس کی حیثیت بس برائے نام ہی تھی۔ بچارے کی بیوی اور بچے ہمیشہ بیمار رہتے۔ انکی تیمارداری سے فرصت پاتا تو کبھی کبھار ہوسٹل میں آنکلتا۔ لڑکے بظاہر اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ لیکن حقیقت میں نہیں اس کی کوئی پروا نہ تھی۔

جب وہ ہوسٹل میں داخل ہوتا تو عموماً باورچی خانے کا ایک نوکر اس کے ساتھ ہوتا۔ برآمدے میں داخل ہوتے ہی وہ رک جاتا۔ اور ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو جاتا اس کا منہ اور آنکھیں ہمیشہ سوجی رہتی تھیں اور آنکھوں سے ہمیشہ پانی بہتا رہتا۔ جسے وہ ایک جھاڑن نما رومال سے گھسے بگھسے صاف کر لیا کرتا تھا۔ آتے ہی وہ

www.taemeernews.com

ایک ہلکی سی جھوٹی کھانسی کھانستا تاکہ سب کو اس کی آمد کی خبر ہو جائے۔ سب سے پہلے وہ نوکر سے گفتگو شروع کرتا۔ کسی معمولی سی بات پر باز پُرس ہونے لگتی۔ "ہوں ... کیوں بے سُور! یہ پانی یہ تونے گرایا ...... اسے رہنے دے ہیں ..... ایں! ... کسی نے بھی گرایا۔ تو نے اسے صاف کیوں نہیں کر دیا جھاڑو سے ......"

اتنے میں لڑکوں کو بھی معلوم ہو جاتا کہ حضرت آگئے ہیں۔ عموماً سب سے پہلے بغداد سنگھ جس کا چہرہ چقندر کی طرح سُرخ تھا ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا آگے بڑھتا اور بڑی متانت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا۔ "ست سری اکال سردار جی!"

"ست سری اکال" پھر سپرنٹنڈنٹ کا پہلا سوال یہ ہوتا۔ "کیوں سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

بغداد سنگھ بڑا ہاتھ دھپ مارنے کے انداز میں اٹھا کر کہتا۔ "ساب ٹھیک ٹھاک ہے جی۔"

سپرنٹنڈنٹ قدرے سکوت کرتا۔ اب اور لڑکے بھی جمع ہونے شروع ہو جاتے۔

سپرنٹنڈنٹ کے جسم کی بناوٹ بھی عجیب سی تھی۔ موٹا تو وہ تھا ہی لیکن ورزش نہ کرنے کی وجہ سے اوپر کا دھڑ اور ٹانگیں پتلی تھیں اور پیٹ خوب پھولا ہوا۔ چنانچہ جب وہ اطمینان کے ساتھ بڑی سنجیدہ صورت بنا کر کوٹ کو پیٹ کے آگے سے ہٹا کر دونوں ہاتھوں کو کولھوں پہ رکھ کر کھڑا ہوتا تو اس کا پھولا ہوا پیٹ اور بھی آگے کو بڑھ جاتا۔ اور وہ کسی سپیرے کی بین کی طرح نظر آنے لگتا۔ اسے دیکھ کر لڑکوں کو ہنسی آجاتی۔ سپرنٹنڈنٹ دل میں سمجھتا تھا کہ لڑکے اسی پر ہنس رہے ہیں۔ چنانچہ وہ مقبول ہونے کی غرض سے ذرا بے تکلف ہو کر بناوٹی غصہ سے پوچھتا: "بغداد سنگھ

تم بہت پشیمان ہو گئے ہو؟

"جی میں؟" بلدار سنگھ اپنی موٹی سی انگلی اپنے سینہ پر رکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا "بالکل روا... میں تو آپ کا داس ہوں جی۔ کہئے تو ابھی سر اتار کر رکھ دوں قدموں میں۔"

اس بات پر لڑکے خوب قہقہے لگا کر ہنستے۔ کوئی لڑکا کسی کی اوٹ میں ہو کر کہتا "دکھیر کا سر؟"

اب بلدار سنگھ قہقہہ لگا کر للکارتا "او... سے او... بچو سردار جی کھڑے ہیں ورنہ ابھی تیرا مورتہ بنا دیتا پکڑ کر۔"

اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ اسی طرح باتیں کرتا ہوا سارے ہوسٹل میں لٹو کی طرح گھوم جاتا۔ اور باہر نکلنے سے پہلے ایک مرتبہ لڑکوں کو تنبیہہ کے طور پر کہتا "اچھا اب ہماری بات دھیان رہے نا۔"

"جی بالکل۔ اب تو ہم روز کا حساب بھی لکھ کر رکھتے ہیں۔ دیکھئے گا؟"

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ لیکن وہ اسی بات پر مطمئن تھا کہ کم از کم اس کی عزت تو رکھ لیتے ہیں۔ وہ اسی بات پر اپنی خیر منا تا۔ حساب وغیرہ دیکھے بغیر اچھا اچھا کہتا ہوا چلا جاتا۔

اس کے جانے کے بعد بلدار سنگھ پانی کے گلاس میں سے چند بوندیں آنکھوں پر ٹپکا لیتا۔ کو ٹھوں پہ ہاتھ رکھ کر تولیے سے آنکھیں پونچھتا ہوا کہتا "بھول ادھول ...... بلدار سنگھ! اب یہ جیون اکارت ہے نا؟"

بہر صورت کمرن علمہ دار نیلا بھی تھا۔ اس لئے وہ سب مجھے بجائے میرے

www.taemeernews.com

اصلی نام کے بکری سنگھ کہہ کر پکارتے تھے۔ بکری سنگھ نام تو بہت برا تھا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد میں اس نام سے مانوس ہو گیا۔ اب مجھے بکری سنگھ مذاقاً شاذ و نادر ہی کہا جاتا تھا۔ نہایت سنجیدہ گفتگو میں بھی سب مجھے اسی نام سے پکارتے تھے۔ میں کمزور تھا اور وہ لوگ سرکاری سانڈوں کی طرح سینہ پھلائے رہتے تھے۔ لیکن وہ مجھ پر ہاتھ اٹھانا گئو ہتیا کے برابر پاپ سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر کبھی میں طیش میں آ کر ان میں سے کسی کو لڑنے کے لئے للکارتا بھی تو وہ میرے سامنے ہتھیار ڈال دیتا۔ میں اپنی کمزوری کے طفیل ان لوگوں میں قطعاً محفوظ تھا۔

ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں کسی سکھ تہوار کی ہفتہ بھر کی چھٹیاں ہوئیں۔ تقریباً سبھی لڑکے بوریا بستر باندھ کر اپنے گھروں کو چل دیئے۔ میں تنہا لڑکا تھا۔ پہلے تو ہوسٹل ہی میں چھٹیاں گزارنے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر اتنے بڑے ہوسٹل میں اکیلے جی نہ لگا۔ نہ وہ تر و تازہ سبزیاں نہ وہ چہل پہل۔ رات کے وقت تاریک برآمدوں میں بھتنے سے دکھائی دیتے تھے۔ چنانچہ دو تین دن بعد میں نے بھی اپنے گاؤں جانے کی ٹھانی۔

گاؤں میں میری اماں، پھوپھی اور دو بڑے بھائی رہتے تھے۔ میں نے میلے کپڑے لئے اور چند کتابوں کی گٹھڑی باندھی اور سائیکل کے پیچھے کیریئر پر رکھ کر رسی سے باندھ دی۔ پچیس میل کا سفر تھا۔ پمپ، سولیوشن، ربڑ وغیرہ ضروری سامان چمڑے کے چھوٹے تھیلے میں رکھ لیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا اور دھوپ کی تمازت نسبتاً کم ہوئی تو چل دیا۔

اس وقت پانچ بجے تھے۔ خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے میں گاؤں

www.taemeernews.com

پہنچ جاؤں گا۔

جب شہر سے باہر نکل آیا تو ایک کمہار کی دکان پہ رکنا پڑا۔ میں شام کو جب کبھی ادھر سے گزرتا تھا تو میری آنکھیں کسی کی تلاش میں اس دکان کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ کمہار کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ اس کا سن اگرچہ تیس سے کم نہ تھا۔ لیکن تھی بڑی طرحدار۔ اور میں اس کی بہار۔ دہ سالہ لڑکی کے کیا کہنے میں شرمیلا اور خاموش ضرور تھا۔ لیکن بچپن ہی سے ایک حسن پرست طبیعت اور عاشقانہ مزاج رکھتا تھا۔ کمہار کی بیٹی کو دیکھ کر مجھے سوہنی کا خیال آ جاتا تھا سوہنی بھی کمہارن تھی وہ لوگ اس قسم کے قصوں کو باور نہیں کرتے۔ اور انہیں ڈھکوسلوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن میری نظروں کے سامنے یہ زہرہ جبیں لڑکی تھی۔ اس پہ کوئی بڑے سے بڑا شہزادہ بھی عاشق ہو سکتا تھا۔ میرا عشق کس قدر بے بس اور اپنے آپ ہی میں سلگنے والا تھا۔ نہ میری شکل اچھی تھی نہ جسم۔ مہینوال جب سوہنی کمہارن کی دکان پر گیا تھا تو اس نے ساری کی ساری دکان ہی خرید ڈالی تھی۔ لیکن میں دکان تو کیا خرید سکتا۔ بس اس کی صورت دیکھنے کے لئے وہاں چلا جاتا۔ کبھی مٹی کا دیا یا ایک پیالہ یا صراحی خرید لیتا اس کی ماں پاس کھاٹ پر بیٹھی رہتی تھی۔ مجھے مطلوبہ برتن اُٹھا اُٹھا کر دکھاتی۔ اسکی ماں مجھے نابالغ سمجھ کر اس طرف زیادہ توجہ نہ کرتی تھی۔ ادھر میں جی بھر کر اس ننھی سوہنی کو دیکھا کرتا۔ وہ بھی الھڑ سی تھی۔ اسے کبھی میری آنکھوں میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ وہ سرد مہری سے میری طرف دیکھتی "اچھا یہ پیالہ تمہیں پسند نہیں ..... کیا خرابی ہے۔ اس میں ..... اچھا یہ لو ......"

میں مرعوب ہو کر کہتا۔ "نہیں نہیں اگر تم کہتی ہو تو میں یہی خرید لیتا ہوں ——"

وہاں سے برتن لاکر میں ہوسٹل کی پچھلی دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیتا۔ اور وہاں اکثر گشتی کے عالم میں ہوسٹل کے اندر داخل ہو جاتا۔ تو وہ ہمیشہ میرا منہ لٹکا ہوا دیکھ کر پکار کر کہتا۔ ”ارے سنا بابو جی، بھئی منہیا!؟“

اس دن جب میں ان کی دکان کے سامنے رکا تو اس وقت ماں تو غالباً گھر ہی کے سارے مکان کے اندر گھسی بیٹھی تھی۔ البتہ لڑکی سر پہ کپڑے کا ایک ٹکڑا اوڑھے ادھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ اس کا چہرہ گرمی سے تمتمایا ہوا تھا۔ گال خوب سرخ ہو رہے تھے میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آن پھنسا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ مجھے کبھی اپنے گال چومنے کی اجازت دے دے۔۔۔ ”کیا چاہیے؟“ اس نے پیٹھ موڑ کر کوئی برتن ہلاتے ہوئے کہا۔ میں نے کوئی بھی صراحی طلب کی۔ اس نے یکایک مٹی کی بنی ہوئی صراحی میری طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

”یہ لے جاؤ بابو جی ایسا ٹھنڈا ہوا کرے گا کہ ہمیں یاد کرو گے عمر بھر۔“

”عمر بھر یاد کرنے“ والی بات تو اس نے محض دکانداری کے خیال سے کہہ دی تھی۔ لیکن میرا دل چاہتا تھا کہ میری ساری ہستی نکل کر اس کے قدموں پہ بچھ جائے۔ میں اسے بتا دینا چاہتا تھا۔ کہ میں تو اسے ہر وقت یاد کیا کرتا ہوں لیکن کہہ کچھ نہ سکا ۔۔۔ میں تھوڑی دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے دانت نکال کر کہا۔ ”اب میں کالج جا رہا ہوں۔“

”پھر کب آؤ گے؟“ یہ کہہ کر وہ میرا جواب سنے بغیر اپنے کام میں مصروف ادھر اُدھر گھومنے لگی ۔۔۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے جلدی سے دام دیئے اور پیدل پر پاؤں رکھ کر چل کھڑا ہوا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آخر اس نے یہ بات

www.taemeernews.com

کیونکہ وہ بھی یہیں جانتا تھا کہ یہ ایک صاحب سے امی۔ لئے مجھے یہ اس قدر عزیز بھی تھا۔
دل ہی دل میں شاداں و فرحاں سفر پر روانہ ہو گیا۔

دھوپ ہلکی پڑ چکی تھی لیکن گرمی اب بھی کافی تھی۔ سڑک بڑے بڑے کھیتوں میں سے ہو کر جاتی تھی۔ راستے میں سڑک کے دونوں طرف ہٹ کر جا بجا رہٹ چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ کنوؤں کا صاف و شفاف پانی چھالوں میں گرتا ہوا آنکھوں کو کس قدر بھلا معلوم ہوتا تھا۔ ان پرانے کنوؤں کے ارد گرد گھنی سے کتری ہوئی داڑھیوں والے کسان موٹے سوتی کپڑے کے تہبند باندھے سر پر پگڑی رکھے عالم میں حقّے گڑگڑاتے نظر آتے تھے۔ جب کنوؤں پر کام کرنے والی لڑکیاں اور عورتیں کھیتوں میں گھاس کاٹ کر ادھر ادھر چلتی تھیں تو ان کی لمبی لمبی چوٹیاں ناگنوں کی طرح بل کھا کھا کر لہراتی تھیں۔ بیلوں کی آنکھوں پر کھوپے چڑھے ہوئے تھے۔ گھنٹے والے گھنٹے اپنا الگ شور مچا رہے تھے اور اپنی مٹکی جیسی چوڑیوں میں بھرے ہوئے گوبر کے ٹکڑے جمع کرنے والی لڑکیاں کبھی کبھی اپنا کام چھوڑ کر ہرنیوں کی طرح میری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔

ابھی میں نے چار پانچ میل ہی کا فاصلہ طے کیا تھا کہ سائیکل پنکچر ہو گئی۔ میں نے سڑک سے ہٹ کر پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ رہٹ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ چنانچہ ایک جوہڑ کے کنارے سائیکل کو لٹا دیا۔ ٹیوب میں بہت بڑا پنکچر ہو گیا تھا۔ ٹائر کو پنکچر لگانے میں بیس پچیس منٹ صرف ہو گئے۔ دو میل چل کر سائیکل کی ہوا پھر نکل گئی۔ اب کوئی پانی بھی قریب نہیں تھا۔ چنانچہ سائیکل لڑھکاتے ہوئے آدھ میل کے قریب پیدل چلنا پڑا۔ سڑک کے کنارے ایک گاؤں آباد تھا۔ وہاں ایک سائیکل والے کی دکان بھی تھی۔ میں نے سائیکل اس کے سپرد کر دی۔ پہلا لگایا ہوا پنکچر اکھڑ گیا تھا۔ اسے از سرِ نو

www.taemeernews.com

درست کیا گیا۔ اسی گڑبڑ میں سورج افق تک جا پہنچا۔ اور میں نے ابھی آدھا سفر بھی طے نہیں کیا تھا۔ پنکچر لگ جانے پر میں نے سائیکل خوب تیز چلا دی۔ یہاں تک کہ راستے میں مرغیاں اُڑ اُڑ جاتی اور پھڑپھڑاتی ہوئی ادھر اُدھر دیواروں پر جا بیٹھیں ۔۔۔ گاؤں سے باہر نکلا تو سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وقت رواں کے گرد و پیش کی [illegible] کی روشنی کا نام تک نہ تھا۔ کچھ دور تک میں نے خوب زور سے سائیکل چلائی۔ یہاں تک کہ میں ہانپ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ کھلے آسمان تلے کھیت حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں کھجور کے درخت بلند ہو رہے تھے۔ ایک دوسرے کے قریب قریب کھڑے ہوئے ایسے دکھائی دیتے تھے۔ جیسے سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ کھیتوں کی پگڈنڈیاں چھپکلیوں کی طرح ادھر ادھر رستے کو کاٹتی ہوئی دور تک چلی گئی تھیں۔ دور افق پر کوئی شخص گھوڑے پر سوار ہوا تیزی سے دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ اس قدر تیزی اور روانی سے جیسے نہ تو اس کا گھوڑا کبھی تھکے گا اور نہ زمین ہی کہیں پر ختم ہوگی۔ بس اسی تندی اور برق رفتاری سے وہ بڑھتا چلا جائیگا اور وہ خود اسی جوش و خروش سے قیامت تک اس پر بیٹھا رہے گا۔ بلند پرواز پرندوں کی ٹکڑیاں آسمان کی طرف پرواز کرتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ پرندے چھوٹے چھوٹے نقطوں کی طرح نظر آنے لگے۔ آسمان کی وسعت بے کنار تھی۔ اور پرندوں کی طاقت پرواز بے اندازہ ہوا کے جھونکے چلنے لگے اور میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں اُگے ہوئے پودے ایک طرف کو سربسجود ہوتے جا رہے تھے۔ جیسے کوئی ازلی نغمہ سن کر وہ ایک ساتھ مسحور ہو گئے ہوں۔ دراصل وہ شاہد قدرت کی ایک حمد تھی۔ جسے سن کر سوار نے منہ زور گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیا۔ پرندے تیزی سے تیزی کے ساتھ آسمان کی وسعتوں میں پرواز

www.taemeernews.com

کر گئے اور کھیتوں میں پودے وجد میں آ کر جھومنے لگے۔

موسم خوشگوار تھا۔ میں نے رُوں رُوں کرتے ہوئے رہٹ کے قریب سائیکل روک لی۔ نہانے کو جی چاہ رہا تھا۔ چنانچہ میں کپڑے اُتار کر اولو[1] میں جا گھسا۔ بیلوں کی آنکھوں پر کھوپے بندھے ہوئے تھے وہ سر ہلاتے اور منہ سے جھاگ اُڑاتے تیز تیز قدم اُٹھانے لگے۔ رہٹ گیت گانے لگا۔ اور پانی اس تیزی سے باہر گر رہا تھا۔ جیسے کنوئیں میں پڑے پڑے اس کا دم گھٹ گیا ہو۔ سرد پانی میرے جھلستے ہوئے جسم پر گرا تو میں نے ایک آسمانی فرحت محسوس کی اور سنبھل کر بھال کے نیچے ہی بیٹھ گیا۔ پانی ململ کی طرح باریک چادر میں سے آسمان، زمین، درخت پودے، کلیلیں کرتے ہوئے بچھڑے قلابازیاں لگاتے ہوئے مینڈک سب میری مسرت میں برابر کا حصہ لے رہے تھے۔

میں بہت دیر تک نہاتا رہا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا کسان، جس کی ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے کانوں کے پیچھے چکنے پٹے نظر آ رہے تھے، حقہ گڑگڑاتا ہوا ادھر آ نکلا۔ مجھے خوش دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اولو میں سے نکلنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ لیکن سورج غروب ہو چکا تھا اور افق کے قریب سیاہی مائل دھوئیں کی ایک لکیر سی کھنچ گئی تھی۔۔۔۔ چنانچہ میں اولو میں سے نکلا اور گیلے بدن پر کپڑے پہن کر پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

اب میں نے سوچا کہ راستے میں کسی جگہ پر بھی نہیں رکوں گا۔ میں نے سائیکل پہلے سے بھی تیز چلا دی۔ پکی سڑک کا تقریباً آٹھ میل راستہ رہ گیا تھا۔ اور کھیتوں کا راستہ تقریباً آٹھ میل اور تھا۔ میری سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ نصف منزل پر ایک گاؤں تھا جسے قلعہ کاہن سنگھ کہتے تھے۔ خاصہ بڑا موضع تھا۔ پانچ سات پکے مکانات بھی تھے۔

---

[1] کنوئیں کا چوبچہ

www.taemeernews.com

ایک چھوٹا سا سکول بھی تھا۔ پہلے خیال آیا کہ آج کی رات اسی گاؤں ہی میں گزار دوں۔ لیکن پھر گھر کا خیال آیا ہمارے گھر کے صحن میں ایک چھوٹا سا کنواں تھا جس پر ایک لوہے کا ڈول پڑا رہتا تھا۔ سوچا کنوئیں پر ڈول بھر بھر کر نہاؤں گا۔ ماں کہیں کسی تھول والے پراٹھے پکائے گی۔ اور میں ہری مرچ کی چٹنی کے ساتھ مزے سے ایک کھاؤں گا۔ اگر راستے میں کوئی خاص رکاوٹ پیدا نہ ہو تو میرے لیے گھر پہنچنا ناممکن نہ تھا۔ اس لیے میں نے پھر زور زور سے پیڈل چلانے شروع کئے۔ جب میں ایک زناٹے کے ساتھ گاؤں میں سے ہو کر گزرا تو گاؤں کے ننگ دھڑنگ پھولے ہوئے پیٹوں والے بچے اودتے ادئے کا شور مچاتے میرے پیچھے بھاگے۔ اور ٹریاں سونگھتے ہوئے کالے اور بادامی کتے بھی دُمیں ہلاتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ کنوؤں کو بے طرح بھونکتے دیکھ کر مسجد کے کچے چبوترے پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے طیش میں آکر حقے کی نے کھینچ ماری۔ گاؤں سے باہر ایک مردہ بیل پر جھپٹے مارنے والے بڑے بڑے گدھ شور و غل سن کر ہراساں ہو گئے۔ اور اپنے لمبے لمبے پر پھڑ پھڑاتے اور اچکتے ہوئے ذرا پرے ہٹ گئے۔ ادھر میں کسی فرار شدہ ڈاکو کی طرح بڑی تیزی سے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ لڑکے اور کتے بہت پیچھے رہ گئے۔ اور ان کا شور بھی مدھم پڑ گیا۔

آگے سنسان سڑک کے دونوں کناروں پر پاس پاس کھڑے ہوئے شیشم کے درختوں کے سلسلے شروع ہو گئے۔ ان کی نیچے گری ہوئی خشک پتیاں میری سائیکل کے پہیوں کے نیچے چرمر کرتی ہوئی گھومنے لگیں اور گاؤں کے بچوں کی طرح وہ دور تک تیزی سے چکر کھاتی ہوئی میرا پیچھا کرتیں اور پھر جیسے دم پھول جانے پر وہ ہنس کر ایک سائے کو نے کا گھتہ۔ کوڑی۔

www.taemeernews.com

جگہ بیٹھ کر رہ جاتیں۔

اب اکا دکا تارا بھی نظر آنے لگا تھا۔ اور شفاف آسمان پر زرد زرد چاند کبھی تالاب میں تیرتی ہوئی کانسی کی کٹوری کی طرح معلوم ہوتا۔

دائیں بائیں دور تک ناہموار زمین پھیلی گئی تھی۔ خاردار جھاڑیوں کے سلسلے شروع ہوگئے تھے۔ یہاں پر بھیڑیوں کا بھی خطرہ تھا۔ اگر بھیڑیوں کا کوئی غول آن گھیرے تو پھر؟ میں خوفزدہ ہو کر سائیکل اور بھی تیزی کے ساتھ دوڑانے لگا۔ رفتہ رفتہ غروب آفتاب کے بعد والی رہی سہی روشنی بھی ختم ہوگئی۔ صرف چاند کی پھیکی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ شیشم کے درختوں کی وجہ سے سڑک پر اور بھی زیادہ گہری تاریکی چھاگئی تھی۔ میں اس سے پہلے صرف دو مرتبہ یہ سفر اکیلا کرچکا تھا۔ لیکن دونوں مرتبہ دن ہی میں سفر ختم ہوگیا تھا ــــــ میرا خیال تھا کہ دو ڈھائی میل پر کاکو شاہ کے مقبرے کے قریب سے سڑک چھوڑ کر اپنے گاؤں کی طرف گھوم جاؤں گا۔ دل کو کچھ اطمینان ہو چلا تھا کہ کم از کم سڑک کا سفر تو ختم ہونے والا تھا۔

میں اندھا دھند چلا جا رہا تھا کہ آگے سڑک رکی ہوئی معلوم ہوئی جیسے نئے سرے سے بنائی جا رہی ہے۔ میں نے سائیکل دھیمی کر دی۔ نزدیک پہنچ کر پتہ چلا کہ واقعی سڑک بن رہی ہے۔ ساری سڑک اکھڑی پڑی تھی۔ مجبوراً سائیکل سے اتر کر ناہموار زمین پر پیدل چلنا پڑا۔ یہ ایک نئی آفت آن پڑی تھی۔

راستے میں سڑک کے کنارے پٹھان مزدوروں کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں ہم لوگ انہیں "راشے" کہا کرتے تھے۔ یہ "راشے" خوب موٹے تازے اور ہیبت ناک صورتوں والے ہوتے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ یہ لوگ بچوں کو بوریوں میں بند کر کے

www.taemeernews.com

کابل سے، جانتے ہیں۔ ادنیٰ ٹٹو دس دس روپے میں بیچ ڈالتے ہیں۔ میں دل ہی دل میں خوف زدہ بھی تھا۔ لیکن بظاہر بڑے حوصلے کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں کی لرزتی ہوئی روشنی میں راشوں کے چہروں کے خوفناک خطوط، اُلجھے ہوئے بال اور چمکتی ہوئی سرخ آنکھیں صاف نظر آرہی تھیں۔

بڑی مشکل سے یہ راستہ بھی ختم ہوا، اور میں پھر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ اس وقت تک مجھے اوّل تو گاؤں میں پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ یا گاؤں کے قریب ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اب سوائے سفر جاری رکھنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کالو شاہ کے مقبرے کے قریب پہنچ کر میں پگڈنڈی پر ہو لیا۔

تنگ راستہ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لئے مجھے سائیکل سے اترنا پڑا۔ کھیتوں میں پانی کھڑا تھا۔ مجھے ایک نشانی یاد تھی۔ دو فرلانگ کے قریب ایک پرانا رہٹ تھا جو آجکل سنسان پڑا تھا۔ میں نے پہلے اسی کا رُخ کیا۔ جب پانی سے بچتا ہوا کنوئیں تک پہنچا تو دیکھا کہ آگے پانی اور بھی زیادہ دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے۔ پگڈنڈی پانی میں گم ہو گئی تھی۔ میں پانی سے بچتا ہوا خشکی کے راستے چلتا گیا۔ دو ڈھائی فرلانگ چلنے کے بعد پانی کم ہوا۔ اور میں اندازے گاؤں کی طرف چل دیا۔ لیکن بہت دُور نکل جانے کے بعد بھی گاؤں کا نام و نشان تک دکھائی نہ دیا۔

دھندلی چاندنی میں میں چلتا ہی گیا۔ اب مجھے شک گزرا کہ کہیں میں نے غلط راستہ تو اختیار نہیں کر لیا۔ ہر طرف نگاہ دوڑائی کھیتوں اور درختوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ بعض کھیتوں میں کوئی فصل بھی کھڑی نظر آجاتی تھی۔ میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ پھر بھی اندھا دھند چلتا گیا کہ دفعتاً مجھے دُور سے گرد اڑتی ہوئی دکھائی دی۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔

www.taemeernews.com

تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ کوئی ترچھا بانکا سانڈنی سوار چلا جا رہا ہے۔ سنسان جگہ پھیکی چاندنی جھینگروں کا شور..... پہلے خیال آیا اسے آواز دے کر راستہ دریافت کر لوں لیکن اس کی وضع قطع کچھ ایسی تھی کہ میں نے اسے بلانا مناسب نہ سمجھا۔ بلکہ سوچ میں پڑ گیا کہ نہ معلوم یہ کون ہے۔ کاش! وہ مجھے دیکھے بغیر آگے نکل جائے۔ میں سمٹ کر کیکر کے ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ لیکن اس درخت کے سائے میں بھی انسان کسی شخص کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا..... اس کے ہاتھ میں ایک لمبے دستے کی کلہاڑی دیکھ کر دم اور بھی خشک ہو گیا۔

وہ اپنے راستے پہ چلا جا رہا تھا۔ میری طبیعت کچھ سنبھلنے لگی..... دفعتاً اس نے رخ بدلا اور بظاہر میری طرف مڑا۔ میں نے سوچا شاید وہ اس راستے سے سیدھا آگے کو چلا جائیگا چنانچہ میں ذرا پہلو بدل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ سیدھا میری طرف آیا اور قریب پہنچکر اس نے سانڈنی روک لی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اونٹ کے اوپر ایک اور اونٹ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اکہرے بدن کا مضبوط سکھ تھا۔ اس کا چہرہ بیضوی تھا۔ ڈاڑھی چھوٹی چھوٹی اور چھدری سی۔ بھنویں گھنی، ناک جیسے بطخ کی چونچ نتھنے پھولے ہوئے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی مگر چمکدار تھوڑی عین بیچ میں سے دبی ہوئی، کانوں میں سنہری بالیاں گلے میں سونے کا چمکتا ہوا کنٹھا۔

وہ تھوڑی دیر تک منہ کھولے میری جانب دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کہو بھئی لونڈے! کون ہو تم؟"

میرا دل ڈوب گیا۔ "جی میں گاؤں کو جا رہا ہوں۔"

www.taemeernews.com

"کہاں سے آ رہے ہو؟"

"شہر سے آ رہے ہوں۔"

"شہر سے ..... جی۔"

"کیا کرتے ہو وہاں؟"

"جی پڑھتا ہوں۔"

"کیا پڑھتے ہو؟"

میں اس سوال پر چکرایا۔ "کتابیں پڑھتا ہوں جی۔"

اس نے سائیکل کے پیچھے بندھی ہوئی گٹھڑی کو کلہاڑی کے دستے سے کچوکا دیتے ہوئے پوچھا۔ "اس میں کیا ہے؟"

"جی اس میں میلے کپڑے ہیں ..... کیا جی کھول کر دکھاؤں؟"

وہ ہنس پڑا۔ "رہنے دو۔"

میری جان میں جان آئی۔ اس نے ڈاچی کی نکیل کھینچی اور چلنے ہی لگا تھا کہ پھر رک گیا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"جی اپنے گاؤں کو۔"

"کون گاؤں؟"

"جی اکال گڑھ۔"

"اکال گڑھ؟"

"جی۔"

اس نے قدرے سکوت کیا پھر اپنے کلّوں کے نیچے زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "ادھر آؤ۔"

www.taemeernews.com

میں ڈرتے ڈرتے اُس کے قریب گیا۔ اُس نے کہا "سائیکل نیچے رکھ دو۔"
میں نے سائیکل زمین پہ ڈال دی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر کہا "میرا ہاتھ پکڑ کر میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔"

میں ڈرا لیکن اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا۔ بڑی مشکل سے اس کے پیچھے اڑ کر بیٹھ گیا۔
اس نے اوپر بیٹھے بیٹھے کلہاڑی بیں سائیکل اٹھا کر اوپر کھینچ لی۔ بیل کو جھٹکا دیا اور سانڈنی اپنی بے ڈھنگی چال سے روانہ ہو گئی۔

میں نے اس کی پسینے میں تر گردن پر نظر جما دی۔ اس کے سر کے بال اس قدر کھینچ کر بندھے ہوئے تھے کہ اس کی گدی پہ بالوں کی جڑوں کا گوشت اوپر ابھر آیا تھا۔ جیسے ننھی ننھی پھنسیاں نکل آئی ہوں۔ ہوں! اس نے پھر اپنی بیٹھی ہوئی بھاری آواز میں پوچھا۔

"تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا گاؤں کدھر کو ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اب تم اپنے گاؤں ہی کو جا رہے تھے۔

"جی میں راستہ بھول گیا تھا۔ میں پہلے شہر سے صرف دو ہی مرتبہ آیا ہوں لیکن دن ہی دن میں گھر پہنچ جاتا تھا۔ لیکن آج رات ہو گئی اور پھر راستے میں پانی بھی کھڑا تھا۔ اس سے مجھے راستے کا پتہ ہی نہیں چلا۔"
اس پر اس نے اپنی بے باک آواز میں قہقہہ لگایا "میاں! اگر تم رات بھر بھی اس طرح چلتے رہتے تو بھی اپنے گاؤں نہ پہنچ پاتے...... تمہارے جیسے چھوٹے لڑکوں کو رات کے وقت سنسان جنگلوں میں ہرگز نہیں گھومنا چاہیئے۔"
اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ خوب مزے مزے کی باتیں کرنے لگا۔ پہلے تو میں ڈرتا رہا

www.taemeernews.com

دل میں بہت ڈرا میں نے سنا تھا کہ بعض لوگ نو عمر لڑکوں کے سروں میں سے مومیائی نکال لیا کرتے ہیں۔ سر مونڈ کر چوٹی میں ایک کیل ٹھونک دیتے ہیں اور ٹانگیں باندھ کر درخت سے لٹکا دیتے ہیں اور سر کے نیچے آگ جلا کر ایک کڑاہی رکھ دیتے ہیں۔ آگ کی گرمی سے سر کی چربی پگھل جاتی ہے۔ اور مومیائی کیل کے سرے سے بوند بوند کر کے کڑاہی میں ٹپکتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ سر کی ساری مومیائی نکل جاتی ہے اور لڑکا مر جاتا ہے...... ساندنی سوار کی صورت تو ہیبت ناک ضرور تھی۔ لیکن اس کی باتوں سے کسی قسم کے خطرے کی بو نہ آتی تھی۔ وہ بڑا ہنس مکھ اور خوش مزاج شخص تھا۔
کہنے لگا کہ تمہارے گھر میں کسی نے دن کے وقت کہانی کہی ہو گی تبھی تو تم راستہ بھول گئے۔

میں ساندنی کے کوہان سے پھسلا جاتا تھا چنانچہ میں اس کی کمر سے لپٹ گیا۔ اس کی گاڑھے کی قمیص پسینے میں تر ہو رہی تھی بغلوں سے ہلکی ہلکی بو آ رہی تھی۔ بازوؤں کے گھنے بال پسینے میں تر ہو کر چپک گئے تھے۔ اس کے جوڑے پر بندھی ہوئی جالی کے پھندنے کو لٹکتے ہوئے پھندنے میرے نتھنوں اور آنکھوں میں گھسے جاتے تھے۔ مجھے پہلے کبھی اونٹ کی سواری کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس قدر ہچکولے کھاتے ہوئے سواری کی کہ بدن کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ اور وہ میری تکلیف سے بے خبر اندھا دھند ساندنی دوڑائے چلا جا رہا تھا ــــ وہ بڑا باتونی شخص تھا۔ اس کی بھاری بھرکم بھرپور آواز اور قہقہوں سے فضا گونج رہی تھی۔

ہم ایک ایسے درخت کے قریب سے گزرے جس پر بیّوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے۔ ایک گھونسلا تو میرے اس قدر قریب تھا کہ میں نے اسے کھسوٹ لینے کے لئے

www.taemeernews.com

ہاتھ بڑھا دیا لیکن گھونسلہ میری زد سے باہر رہا۔ وہ کہنے لگا "بیا بڑا سمجھدار پرندہ ہوتا ہے وہ اپنا گھونسلہ بڑی محنت اور کاریگری سے بناتا ہے۔ دنیا میں کوئی پرندہ اس قدر خوبصورت گھونسلہ نہیں بنا سکتا۔ تم نے بانسوں پر لٹکتے ہوئے گھونسلے نہیں دیکھے؟ بیحد خوشنما ہوتے ہیں۔ ہوا میں لہراتی ہوئی ٹوپیاں سی۔ بیئے پھدک کر کبھی اندر چلے جاتے ہیں کبھی باہر آ جاتے ہیں۔ اور ایک قسم کا گھونسلہ بھی بناتے ہیں۔ یعنی ایک تو اپنے رہنے کے لیے نرم تنکوں اور ریشوں سے جس میں ایک طرف کو اندر جانے کا راستہ ہوتا ہے۔ اور دوسرا گھونسلہ جھولے کی شکل کا ہوتا ہے۔ جب بادل گھِر گھِر کر آتے ہیں اور ہلکی ہلکی پھوار پڑتی ہے۔ سرد ہوا کے جھونکے چلتے ہیں۔ تو بیئے چہچہاتے ہوئے ان پگھوٹے جیسے گھونسلوں پر پہنچ جاتے جھولا جھولتے ہیں۔"

مجھے اس کی باتیں بہت دلچسپ معلوم ہوئیں۔ میں نے کہا "سنا ہے بیئے اپنے گھونسلوں میں روشنی کرنے کے لئے جگنو پکڑ کر گھونسلوں کے اندر تنکوں میں اڑس دیتے ہیں"

اس نے اثبات میں سر ہلا کر مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا "ہاں یہ درست ہے۔ یہ بہت ہی سیانا پرندہ ہے۔"

اس پر میں نے اسے بندر اور بیئے کی کہانی سنائی جو میں نے تیسری جماعت میں اردو کی کتاب میں پڑھی تھی۔ اس نے بچوں کے سے انہماک کے ساتھ وہ کہانی سنی۔ اور جب میں نے کہانی کا نتیجہ بتایا تو وہ بہت خوش ہوا۔

اس طرح بندر سے دوسرے جانوروں کا ذکر شروع ہوا۔ میں نے بتایا کہ جب میں سڑک پر سائیکل چلاتا ہوا آ رہا تھا تو کس طرح مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں کسی جھاڑی میں سے کوئی بھیڑیا نہ نکل آئے۔

www.taemeernews.com

اس پر وہ پھر اپنے بے باک لہجے میں ہنسا "نہیں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اس علاقے میں بھیڑیے بہت کم ہیں۔ تاہم کبھی کبھار دکھائی بھی دے جاتے ہیں۔" پھر اس نے بتایا کہ شنخوپورہ کے علاقہ میں آبادیوں سے پرے خونخوار بھیڑیے غول بنا کر گھوما کرتے ہیں۔ اور وہ قد میں گدھے سے کم نہیں ہوتے ....."

میں بہت حیران ہوا۔ میں نے پوچھا کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر ادھر جا نکلتا ہوگا۔ تو بھیڑیے اس کی تکا بوٹی کر ڈالتے ہونگے۔

اس نے یہ بڑا منہ پھیلا کر کہا "ہاں..... ایک مرتبہ ایک آدمی ادھر سے جا رہا تھا ..... میں نے یہ بات کسی سے سنی تھی....."

"کیا وہ کوئی بڑا طاقتور شخص تھا؟"

"ہاں وہ بہت تگڑا آدمی تھا..... دوپہر کے وقت راستہ چلتے چلتے وہ تھک گیا تو ایک درخت کے نیچے آرام کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔ ایک جھاڑی میں روٹی بندھی تھی۔ اس نے روٹی کھائی اور پھر وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر تھوڑی دیر کے لئے اونگھ گیا۔ پھر یکایک اس کی آنکھ کھلی تو اس نے کچھ عجیب عجیب سی آوازیں سنیں۔ اور اسے جھاڑیوں میں جانوروں کی تھوتھنیاں دکھائی دیں....."

میں نے بیچ میں کہا "وہ بھیڑیے ہونگے۔ ہے نا؟"

"ہاں تم جانتے ہی ہو کہ بھیڑیے کا دہانہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس کے جبڑے انسان کی طرح سرخ ہوتے ہیں۔ بھیڑیا بہت ہی مکار جانور ہے....."

"پھر کیا ہوا؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بس بھئی وہ آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دیکھا کہ ارد گرد کی جھاڑیوں میں بہت

www.taemeernews.com

سے بھیڑیے بالشت بالشت بھر کی زبانیں نکالے چور نظروں سے اس کو گھور رہے ہیں ۔ ۔ ۔ اسے محسوس ہوا کہ اب وہ بچ کر نکل نہیں سکتا۔ اس نے درخت کی طرف دیکھا تو اس کا تنا اس قدر چکنا تھا کہ اس پر پھرتی سے چڑھنا ناممکن تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس پر چڑھنے کی کوشش کریگا۔ تو بھیڑیے اس پر جھپٹ پڑیں گے ۔ ۔ ۔ لمحہ بلمحہ بھیڑیے اس کے قریب چلے آرہے تھے۔ وہ اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اور آہستہ آہستہ وہ اپنے گھیرے کو تنگ کئے جارہے تھے۔ زیادہ وقت باقی نہیں تھا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی، نہ کوئی لاٹھی نہ ہتھیار ۔ ۔ ۔ ۔ اتفاق سے قریب دو چار اینٹیں نظر پڑیں معلوم ہوتا تھا کہ کسی شخص نے کبھی اس جگہ اینٹوں کا چولہا بنا کر روٹی پکائی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے اپنی کھدر کی موٹی چادر کو دہرا کرکے پھرتی سے وہ اینٹیں اس کے اندر رکھ کر انہیں گرہ دے دی۔ ابھی اس کے سرے ہاتھوں میں تھامے ہی تھے کہ سب بھیڑیے ایک دم اس پر پل پڑے۔ اس نے چادر میں بندھی ہوئی اینٹوں کو زور زور سے گھمانا شروع کر دیا۔ جو بھیڑیا اس کے قریب آتا اینٹیں اس کی تھوتھنی پر اس قدر زور سے لگتیں کہ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا۔ بھیڑیئے بڑھ بڑھ کر حملے کرتے رہے وہ بھی بڑی پھرتی اور تندی کے ساتھ اینٹیں گھماتا رہا۔ اس طرح قریب آدھ گھنٹہ تک وہ بھیڑیوں کے حملوں کو ناکام بناتا رہا ۔ ۔ ۔ یہاں تک کہ وہاں چند راہگیر بھی آن پہنچے۔ انہوں نے دور ہی سے زور زور سے چلانا شروع کردیا۔ بھیڑیے اس قدر شور و غل کی آوازیں سن کر بھاگ نکلے۔ اور اس آدمی کی جان بچ گئی۔

یہ سنسنی خیز قصہ سنا کر وہ سانڈنی کو گالیاں دینے لگا۔ اور میں اپنے خیالات میں کھو گیا ۔ ۔ ۔ زرد چاند کی پھیکی روشنی میں دور دور تک کالے کالے درخت پھیلے

www.taemeernews.com

ہو رہے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں بہت دور سے کسی کے گانے کی اڑتی ہوئی تان
سنائی دینے لگی۔ سانڈنی اپنی بے ڈھنگی چال سے لپکی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ ہم ایک اونچے
درخت کے قریب سے ہو کر گزرے جس پر خشک۔ لکڑیاں لٹک رہی تھیں۔ اس نے
کلہاڑی کے دستے سے ایک لکڑی کو کھٹکا کر کہا: "دیکھو یہ ہے تونبی۔ بچپن میں جب ہم
لوگ نہر پر نہانے جایا کرتے تھے تو بس اسی قسم کی تونبی بغل میں دبا کر اپنا مزے سے
بوتل کے کاگ کی طرح تیرا کرتے تھے۔"

لیکن میرا دھیان ابھی تک بھیڑیوں کی طرف لگا ہوا تھا۔ میں نے پھر بات چھیڑی۔
"کیا بھیڑیے بڑے آدمی پر بھی حملہ کر دیتے ہیں؟"

اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ اگر بھیڑیے تعداد میں زیادہ ہوں اور
کوئی اکیلا دکیلا آدمی مل جائے تو وہ اس پر حملہ کر دیا کرتے ہیں۔ لیکن عموماً آدمیوں سے ڈرتے
ہیں۔ ۔۔۔ لو میں تمہیں ایک نیا قصہ سناتا ہوں ۔۔۔۔ یہ جگ بیتی نہیں آپ بیتی ہے۔۔
۔۔۔۔ تقریباً چار برس پہلے کی بات ہے۔۔۔۔ میں اپنے ننھیال کو جا رہا تھا۔ راستے میں جنگل
پڑتا تھا۔ لیکن مجھے پروا نہ تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک بڑی لمبی لاٹھی تھی جس کے نیچے لوہے
کی یہ موٹی شام لگی ہوئی تھی۔ اگر اس لاٹھی کی ایک بھی ٹھکانے کی چوٹ کسی بھیڑیے کے
سر پر پڑ جاتی تو وہ ڈھیر ہو جاتا۔ خیر! دوپہر کا وقت تھا۔ ابھی میں جنگل میں تھوڑی ہی
دور گیا تھا کہ میں نے چونک کر دیکھا کہ میرے داہنے ہاتھ کی طرف کوئی جانور جھاڑیوں
میں چھپا ہوا ہے۔ میں نے جلدی سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ بائیں ہاتھ
کیکر جھاڑی کے پیچھے ایک بھیڑیا کھڑا ہے۔۔۔۔ میں چوکنا ہو کر راستہ طے کرنے لگا۔ جب
جگہ جھاڑیاں ذرا کم ہوئیں تو دیکھتا کہ میرے دائیں بائیں دہ بھیڑیے تیس تیس یا چالیس چالیس

www.taemeernews.com

قدم کا فاصلہ رکھ کر چلے جا رہے ہیں۔ میں نے لٹھ اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ اور ان پر نگاہ رکھتا ہوا بڑھتا چلا گیا تھا۔ کبھی وہ میرے قریب آجاتے اور کبھی پھر دور چلے جاتے۔ جب ہم گھنی جھاڑیوں میں سے ہو کر گزرتے تو وہ نظروں سے غائب ہو جاتے۔ مجھے اس وقت خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ کہیں حملہ نہ کر دیں اور جس جگہ جھاڑیاں کم ہو جاتیں وہ دکھائی دینے لگتے۔ اور ہاں..... ایک عجیب بات دیکھی..... کبھی دائیں ہاتھ والا بھیڑیا بائیں ہاتھ کی طرف چلا آتا اور بائیں ہاتھ والا دائیں ہاتھ کی طرف چلا جاتا۔ اس طرح وہ راستہ بھر دل بدل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جنگل ختم ہو گیا۔ لیکن ان کو مجھ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی جنگل ختم ہونے پر میں تو آگے بڑھ گیا۔ اور وہ جنگل ہی میں رہ گئے۔"

جب وہ اپنا قصہ ختم کر چکا تو میں نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اب وہ مجھے بہت ہی دلچسپ آدمی معلوم ہونے لگا تھا۔ اس کا لہجہ اس قدر دوستانہ تھا۔ اور باتیں ایسی سنسنی پیدا کرنے والی اور مزے مزے کی کرتا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ وہ باتیں ہی کرتا چلا جائے۔ میں نے اصرار کیا کہ مجھے بھیڑیوں کی کوئی اور کہانی سناؤ۔ وہاں قصوں کی کیا کمی تھی۔ اس نے کہا۔ "اب میں تمہیں اپنے پرنانا کا چھوٹا سا قصہ سناتا ہوں۔ ——— پرنانا یعنی میرے نانا کے باپ اپنے زمانے میں بہت ہی طاقتور شخص سمجھے جاتے تھے۔ علاقہ بھر کے لوگ ان سے تھر تھر کانپتے تھے۔ ایک مرتبہ میرے پرنانا اپنی پھوپھی سے ملنے کے لئے گئے۔ وہاں انہیں کچھ کام تھا۔ ڈیڑھ دو ماہ وہیں رہے۔ انہیں خبر ملی کہ گھر پر میرے نانا جو اس وقت بچے ہی تھے بیمار پڑ گئے ہیں۔ خبر ملتے ہی پرنانا فوراً اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ جلدی میں انہوں نے اپنے ہاتھ میں لاٹھی تک نہ

www.taemeernews.com

لی بیس پچیس میل کا فاصلہ تھا۔ وہ بڑی تیزی سے چلتے تھے۔ اس وقت چونکہ اپنے بیٹے کی بیماری کی فکر تھی اس لئے ان کی یہی کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد اپنے گاؤں پہنچ جائیں نصف راستہ طے کرنے کے بعد وہ ایک گاؤں کے قریب سے ہو کر گذرے تو اس گاؤں کے لوگوں نے ان سے کہا کہ وہ جس راستے سے جا رہے ہیں ادھر سے نہ جائیں۔ بلکہ دوسرے راستے سے چلے جائیں۔ دوسرے راستے سے بہت بڑا چکر پڑتا تھا۔ اس لئے پرنانا اس راستے سے جانا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے سبب پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ اس راستے پر ایک بھیڑنی نے بچے دے رکھے تھے۔ جو شخص ادھر سے گزرتا تھا۔ وہ اس پر حملہ کر دیتی تھی۔ چونکہ دوسرا راستہ بہت طویل تھا۔ اور انہیں جلد از جلد پہنچنا تھا۔ اس لئے انہوں نے لوگوں کے کہنے کی پرواہ نہ کی اور سیدھے راستے ہی سے جانے کی ٹھان لی۔ جب کوئی ایک ڈیڑھ میل آگے نکل گئے تو دیکھا کہ عین راستے کے بیچ میں ایک خشمگیں بھیڑنی بیٹھی ہے۔ وہ تھوڑا سا راستہ کاٹ کر گزرنے لگے۔ تو اس نے ان پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے جھپٹ کر اس کے جبڑوں کے پچھلے حصے میں جہاں دانت نہیں ہوتے دونوں ہاتھ ڈال کر اس کا منہ پھاڑ دینے کی کوشش کی ادھر وہ جھنجھلائی۔ لیکن زندگی اور موت کا سوال تھا۔ انہوں نے خونخوار جانور کو ٹانگوں میں جکڑ کر زور جو لگایا تو اس کا منہ پھاڑ ڈالا۔ وہ بہت تڑپی اور انہوں نے ایک بڑی سی اینٹ سے اس کو جان سے مار ڈالا۔۔۔۔۔"

مجھے اس قصے میں بہت مزا آیا۔ اس طرح ہم باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے مگر اب میں کچھ تھک گیا تھا جسم بھی دکھنے لگا تھا۔

دور سے درختوں کے جھنڈوں میں سے روشنی چھن چھن کر نکلتی دکھائی دی جب

www.taemeernews.com

ہم اور قریب پہنچے تو باجوں اور ڈھول کا ہلکا ہلکا شور بھی سنائی دینے لگا۔ اس ویرانے میں یہ رونق! پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہاں میلا لگا ہوا ہے۔ یہ بڑا میلہ سات دن تک مسلسل لگتا تھا۔ بڑی بڑی دکانیں اور بھانت بھانت کے کھیل تماشے آتے تھے۔ میں نے دریافت کیا "کیا اب میلے میں چلنا ہوگا؟"

"ہاں مجھے وہاں ایک ..... سے ملنا ہے اور اس میلے کا مطلب ہی کیا ہے جہاں میل نہ ہو سکے ..... کیا سمجھے؟"

میں کچھ نہ سمجھا۔

اب ہم ایک چوڑے ریتیلے راستے پر ہو لیے۔ اس راستے کے دونوں کنارے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ اور ان کناروں پر ببول کے اونچے اونچے درخت قطار در قطار میلے کے مقام تک چلے گئے۔

جب ہم قریب پہنچے تو کالے کالے درختوں کے تنوں کے بیچ میں سے گیس کے ہنڈے اور خیمے نظر آنے لگے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے توں توں زیادہ رونق دکھائی دینے لگی۔ حلوائیوں، بساطیوں، کمہاروں، کھلونے اور شربت فالودے والوں کی دکانیں، ایک طرف اوپر نیچے گھومنے والے پنگھوڑے اور دوسری جانب بازوؤں پر نام یا پھول وغیرہ گودنے والوں کے اڈے، گھوڑے، گدھے، تانگے، ٹھیلے، بیل اور اونٹ بھی نظر آنے لگے۔ اس وقت خوب گہما گہمی ہو رہی تھی۔ مردوں اور عورتوں کے جھلڑ کے جھلڑ ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ روشنی اور گانے بجانے کی وجہ سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔

میلے میں پہنچکر ایک درخت کے تلے میرے ساتھی نے سانڈنی کو زمین پر بٹھا

دیا۔ میں اترا تو میری ٹانگیں سُن ہوگئی تھیں۔ میں کھڑا نہ رہ سکا۔ اس لیے فوراً زمین ہی پر بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر دانت نکال کر ہنسا "کیوں بس تھک گئے"

میں کچھ جھینپ سا گیا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس وقت میرے جسم کے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔

اس نے پوچھا "تمہیں بھوک تو لگی ہوگی خوب زور کی"

میرے اثبات میں جواب دینے پر وہ مجھے اپنے ساتھ لیکر حلوائی کی سب سے بڑی دکان پر پہنچا۔ کڑاہے آگ پر چڑھے ہوئے تھے۔ گرما گرم جلیبیاں اتر رہی تھیں پہلے تو اس نے مجھے گرم گرم جلیبیاں دلوائیں۔ مجھے بھوک بھی لگ آئی تھی۔ اس دن جلیبیاں کھانے کا بڑا لطف آیا۔ اس نے میری پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا "بس اب تم جو جی چاہے کھاؤ خوب پیٹ بھر کر سمجھے!"

مجھے دکان پر چھوڑ کر وہ خود ایک طرف کو چل دیا۔ میں نے جو جی چاہا کھایا۔ جب کھا چکا تو حلوائی کے نوجوان لڑکے نے دام طلب کئے۔ میں بڑا گھبرایا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ میرا ساتھی کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اب میں خوب پھنسا۔ میں نے حلوائی سے کہہ دیا کہ میرے پاس دام نہیں ہیں۔ اس پر نوجوان حلوائی نے کہا "کرسی پر بیٹھے رہو۔ جب تک پیسے نہیں دو گے یہاں سے ہرگز نہیں جانے دونگا" میں بہت پریشان ہوا۔ تھوڑی دیر بعد حلوائی پھر کچھ کام کرنے لگا۔ میں ڈرا کہ کہیں دو چار چپت ہی نہ جمادے...... اتنے میں بطخ کی ہچ ہچ کی سی ہانک۔ نرالا میرا ساتھی بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا آن پہنچا۔ اسے آتا دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ اس وقت حلوائی کا لڑکا مجھے کھری کھری سنا رہا تھا۔ میرے ساتھی نے آتے ہی

www.taemeernews.com

بڑی زوردار آوازمیں اسے للکار کر کہا "ابے او حرامی کے پلّے!.... کیا کہتا ہے ہمارے بچہ کو....؟"

پھر اُس نے آگے بڑھ کر بیٹوا دبا لیا "برخوردار میرا نام جتّا سنگھ ہے جتا سنگھ...."
شور سن کر لڑکے کا باپ ہاتھ جوڑ کر دکان سے نیچے اُتر آیا۔ اور جتا سنگھ کے سامنے
رونی صورت بنا کر کھڑا ہو گیا "لالہ جانتے ہو میں کون ہوں...."

لالہ ہانپ رہا تھا۔ گنے کی طرح پھولا ہوا اس کا پیٹ نیچے اُوپر ہو رہا تھا۔ "جی
ان داتا جانتا ہوں......"

جتا سنگھ نے اس کے جوان لڑکے کو گردن سے پکڑ کر اس زور سے پیچھے دھکیل
دیا کہ وہ گرم گرم گھی کے کڑاہے میں گرنے سے بال بال بچا...."تو پھر اپنے اس لونڈے
کو بھی بتادو۔ کہیں مجھے اس کا کچومر نہ نکالنا پڑے..... کیوں بے سور تجھے اتنی جرأت
کیونکر ہوئی کہ تو ہمارے لڑکے پر پیسے لینے کے لئے چڑھ دوڑا....." وہ لال لال
آنکھیں نکالے لالہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اِدھر اُدھر کے لوگ بھی آن جمع ہوئے۔ لالہ
نے کدو سا سر ہلاتے ہوئے کہا "جی میں نے پیسے نہیں مانگے..... اجی مجھے تو معلوم
بھی نہیں ہوا اس حرامزادے نے کب پیسے مانگنے شروع کر دیئے۔"

جتا سنگھ نے کہا "جوان پی لو نکا خون..... یہاں انگریز کا راج نہیں میرا راج
ہے..... کہو تو دکان بند کر دوں صبح تک؟"

اتنے میں ایک اور قد آور مسلمان نوجوان آگے بڑھا "ابے جانے دے یار غلطی ہو گئی
بیچارے سے" جتا سنگھ نے گردن موڑ کر دیکھا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ دونوں بغلگیر ہو گئے۔ شاید
بہت دنوں بعد دونوں دوستوں کا ملاپ ہوا تھا۔ نووارد بھی ایک خونخوار گدھ کی طرح

www.taemeernews.com

دکھائی دیتا تھا۔

سلوائی کو اتنی تنبیہہ ہی کافی سمجھی گئی۔ اس کے بعد ہم لوگ ٹیلے میں گھومنے لگے۔ وہ دونوں بہت دیر تک نقدیوں، پولیس اور تھانے وغیرہ کی باتیں کرتے رہے۔

ٹیلے سے ذرا ہٹ کر ایک جگہ کھلے کھیت میں الغوزے بج رہے تھے۔ لوگ ایک بڑے گھیرے میں بیٹھے تھے۔ حقے کا دور چل رہا تھا۔ کچھ لوگ لاٹھیاں بغلوں میں دبائے اور کچھ سہارے سے ہی کھڑے تھے بعض لاٹھیوں پر ٹھوڑیاں ٹکائے اچکے ہوئے کھڑے تھے الغوزے بجانے والے کے قریب ایک گبھرو ہاتھ کان پر دھرے بڑے مزے میں پورن بھگت کا قصہ گا گا کر سنا رہا تھا۔ ساری محفل پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف گانے والے کی درد میں ڈوب ڈوب کر ابھر آنے والی آواز فضا میں گونج رہی تھی جب گانے والا ایک بول کہہ کر خاموش ہو جاتا تو الغوزوں کی لپکتی ہوئی دلکش آواز دو بولوں کے درمیانی وقفہ کو اور بھی دلکش بنا دیتی۔

ایک اور جگہ بہت بھیڑ تھی۔ خوب ہلڑ مچا ہوا تھا جب ہم قریب پہنچے تو دیکھا۔ کہ لوگوں نے ایک رنگین مزاج سرمست بوڑھے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ بوڑھے کی سفید داڑھی اور لمبے لمبے پٹے ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ پہلے وہ ایک لمبی سی ہانک لگا کر بڑی لے کے ساتھ کوئی عریاں سی بولی سناتا۔ لوگ قہقہے لگاتے اور وہ ہاتھ اٹھا کر چٹکیاں بجاتا اور کہنیاں ہلاتا ہوا اچھل اچھل کر رقص کرتا تھا۔ اس کے منہ میں ایک دانت تک نہ تھا۔ لیکن آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ پھر اس نے بڑی شوخ نظروں سے حاضرین کی طرف دیکھا۔ اور بلند آواز میں پکار کر بولا۔

اوئے ـــــ نالے بابا کھیو گیا

www.taemeernews.com

نالے دے گیا دوانی کھوٹی

ہو ہو

شُبلے اوئے بابیا! ہر طرف سے تحسین اور آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔

ہم اسی طرح گھومتے پھرتے چلے جا رہے تھے جسا سنگھ اور اس کا دوست مقابل کی طرح آگے کو جھک جھک کر تالیاں بجاتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے۔ بس ان کی لمبی لمبی ٹانگوں پر نگاہ رکھتا ہوا ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ اتنے میں جسا سنگھ میری طرف مخاطب ہوا "کاکا.... کیا نام ہے تمہارا...."

میں بکری سنگھ کہنے ہی کو تھا کہ یکایک رک گیا۔ ورنہ میرا خوب مذاق اڑایا جاتا۔ میں نے سنبھل کر اصلی نام بتا دیا۔

"تم نے کبھی اونٹنی کا دودھ پیا ہے..... آہا! بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ آؤ تمہیں ایسا دودھ پلائیں کہ بس یاد ہی کیا کرو۔"

ہم میلے سے ذرا پرے ہٹ آئے۔ ایک جگہ بہت سی اونٹنیاں بندھی ہوئی تھیں ادھر ادھر کھلے میدان میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اور ان پر میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے آدمی بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ روشنی کی کمی کی وجہ سے انکے چہرے صاف طور پر نظر نہ آتے تھے۔ ہم بھی ایک چارپائی پر جا بیٹھے۔ جسا سنگھ نے اپنے سامنے دودھ والا یا سادہ رچھپال تین ٹنڈیں دودھ کی بھری ہوئی لایا۔ وہ دونوں تو اپنی اپنی ٹنڈیں ایک ہی سانس میں چڑھا گئے۔ لیکن میں باوجود شدید پیاس کے تین ساڑھے تین سیر کی ٹنڈ پی نہ سکا۔ چنانچہ جسا سنگھ میری ٹنڈ کا دودھ بھی پی گیا۔ وہاں سے اٹھ کر ہم پھر میلے میں واپس چلے آئے۔ ہم بہت دیر تک گھوم چکے تھے۔ اردگرد کے دیہات سے آئی سنہ پنجابی منشی کا چھوٹا ڈھول۔

www.taemeernews.com

ہوئی عورتیں بھی واپس جا رہی تھیں۔ اگرچہ اب رونق کافی تھی۔ لیکن جہاں تک عورتوں کا تعلق تھا محفل پہلے کی نسبت کچھ سرد پڑ چکی تھی۔

ایک طرف مجرے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک سفید ریش بزرگ سیاہ کپڑے پہنے تخت پوش پر جلوہ افروز تھے۔ دانتوں میں حقے کی نے دبی تھی ادھر ادھر عقیدتمندوں کا جمگھٹا تھا۔ چند نوجوان عورتیں ہار سنگار کرنے کے بعد پاؤں میں گھنگرو باندھ رہی تھیں۔ طبلے پر آٹا ملا جا رہا تھا۔ کچھ دیر ٹھونکنے کے بعد تھپ تھپ تھاپ کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ ایک طرف سارنگی نواز بیٹھے سارنگیوں کے کان مروڑ رہے تھے۔ ادھر ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے گز چلتے اور ادھر ان کے بڑے بڑے پگڑوں والے سر بھی بڑی ہم آہنگی کے ساتھ حرکت کرتے سب لوگوں کی نگاہیں ان عورتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ جو بل کھا کھا کر سو سو طرح سے اپنے پاؤں کی طرف دیکھتی تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ سیاہ پوش پیر کی سرمگیں آنکھوں سے لیکر معمولی سے معمولی شخص کی آنکھوں تک سب انہی کی شیدائی تھیں۔

جسا سنگھ کے دوست نے مجرا دیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جسا سنگھ کا بھی خیال تو یہی تھا لیکن شاید میرے خیال سے اس نے وہاں زیادہ دیر تک رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے وہ دوست سے رخصت ہوا۔ اور ہم لوگ اپنی سانڈنی کی نکیل پکڑ کر میلے سے چل نکلے۔

جب ہم میلے سے باہر آ گئے تو سامنے پھر گھنی گھنی جھاڑیاں اور اونچے اونچے درخت تھے۔ ہمارے دائیں بائیں اب بھی کوئی اکا دکا خیمہ نظر آ ہی جاتا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد جسا سنگھ رک گیا۔۔۔۔ اس نے مجھے وہیں ٹھہرایا اور سانڈنی کی مہار میرے ہاتھ میں دے کر خود اس ریتلے راستے کے اونچے کنارے کی طرف رخ کرتے ہوئے

www.taemeernews.com

ایک اور درخت کے قریب پہنچا۔

وہ درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ درخت کے سائے میں ایک نوجوان عورت تنے کی اوٹ میں سے باہر نکل آئی۔ وہ دونوں ہنس پڑے اور بہت آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔

مدھم روشنی میں اس عورت کی صورت صاف طور پر نظر نہیں آتی تھی البتہ جب وہ باتیں کرتی ہوئی اپنی جگہ سے ایک طرف کو ہٹ جاتی تو چاند کی روشنی میں اس کے چہرے کے خطوط صاف صاف دکھائی دینے لگتے۔

وہ ایک خوب پلی ہوئی جنگلی بلی کی مانند تھی۔ اس کے چلنے کا انداز بھی اس موٹی تازی بلی کی طرح تھا جو پیٹ بھر کر چوہے کھا لینے کے بعد خرخر کرتی ہوئی کھنچی تنی ہوئی وہ گدرایا ہوا گوشت کا تڑپتا ہوا ایک ٹکڑا تھی۔ جیسے خربوزے کی قاش یا میٹھے سنگترے کی رس بھری پھانک۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی اوڑھنی کی بکل مار رکھی تھی جس میں سے اس کا صرف چہرہ ہی نظر آتا تھا۔ اگر اس کے صحت ور گالوں پر اس قدر گوشت نہ ہوتا تو اس کی آنکھیں خوب بڑی بڑی دکھائی دیتیں۔ ابرو دھکیتی کمان تھے اور دانت صاف و شفاف اور آبدار اخروٹ کے درخت کی چھال سے رنگے ہوئے مسوڑھوں میں سے ہنستے وقت اس کے دانتوں کی چمک بجلی کی طرح کوند جاتی تھی۔ اس کے ہونٹوں میں سمندر کی لہروں کا سا مدوجزر پیدا ہوتا اور وہ گرم ریت پر پڑی ہوئی کسی مچھلی کی طرح پیچ و تاب کھانے لگتے تھے۔

وہ دونوں مجھ سے کچھ فاصلے پر تو تھے ہی۔ پھر وہ باتیں بھی بہت دھیرے دھیرے کر رہے تھے۔ کم از کم میرے کان میں کچھ نہیں پڑنے دیتے تھے۔ البتہ عورت کے ہونٹ ڈولا سے ماجھا پنجاب کا ایک مشہور علاقہ ہے۔

www.taemeernews.com

کے اتار چڑھاؤ اور پیچ و خم سے معلوم ہوتا تھا کہ مضامین کے دفتر کے دفتر کھولے جا رہے ہیں۔۔۔ کبھی شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر ٹھینگا دکھاتی، کبھی اس کے انداز میں اوپر والا ہونٹ بھینچ کر نیچے کا ہونٹ آگے بڑھا دیتی۔۔۔۔۔ اس سے اپنی چندیا کو سنوارا تو اس کے سیاہ، گھنے اور لمبے بال بارش کی بوچھاڑ کی طرح باہر نکل پڑے۔ اس کی خوش وضع گردن کی جھلک بھی لمحہ بھر کو دکھائی دی اور پھر اس کی بادل نما اوڑھنی میں روپوش ہو گئی۔ وہ مستی میں آئی ہوئی کبوتری کی طرح اٹکھیلیاں کر رہی تھی ۔۔۔ جگتا سنگھ نے غالباً اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھانے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ عورت نے فوراً ہی اس کا ہاتھ راستے ہی میں روک دیا اور بڑے ہی بانکپن سے ٹھمک کر سیدھی جگتا سنگھ کے بالکل سامنے قریب ہو گئی۔ اور اس کے کان کے پاس سرگوشی میں کچھ کہا۔ جگتا سنگھ نے میری طرف دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔۔۔ پھر جگتا سنگھ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

پتوں میں سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی میں عورت کی تیز آنکھوں میں سے روشنی کی شعاعیں سی نکلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔۔۔ اور جب جگتا سنگھ واپس لوٹا تو وہ درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اور کچھ غمناک آنکھوں سے جگتا سنگھ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ اس کا ایک گال درخت کے تنے سے لگا ہوا تھا۔

ہم بدستور سابق سانڈنی پر سوار ہو گئے۔ اور سانڈنی پہلے کی طرح بے ڈھب چال سے بھاگ نکلی۔ کافی دور آجانے کے بعد میں نے گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ وہ عورت ابھی تک اسی طرح درخت کے تنے کے ساتھ سمٹ کر کھڑی ہوئی تھی۔
جب ہم کھیتوں میں پہنچ گئے۔ تو جگتا سنگھ نے اپنا بوڑھے جیسا منہ کھول کر میری طرف

www.taemeernews.com

دیکھا۔ اور ناک کی بجائے منہ سے سانس لینے لگا۔ اس کی چھوٹی موٹی مونچھوں کے تلے اس کے کچھ بھدے سے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ بھاری سی آواز میں بولا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

میں کچھ جھینپ سا گیا۔

بہاندری نجلا ہونٹ آگے کو بڑھاتے کسی روٹھی رانی کی طرح ٹھمک کر چلی جا رہی تھی۔ جتنا سنگھ نے لوہے کے کڑے والا ہاتھ اٹھا کر کان پہ رکھ لیا ایک لمبی ہانک لگائی۔ اس کے منہ میں سے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ زندگی سے بھرپور آواز نکلی جو فضا میں پھیلتی چلی گئی۔ اس قدر آزاد اور بھرپور آواز میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ اس کی آواز میں موسیقی نہیں تھی لیکن ایک ایسی کشش، ایک ایسا خلوص اور کھرا پن تھا جس پر نغمگیت سے بھرپور ہزاروں آوازیں قربان کی جا سکتی تھیں۔ لمبی ہانک کے بعد وہ گانے لگا۔

اوئے

میں مل لاں تخت لاہور دا (میں لاہور کے تخت پہ جما لوں)
میں کھوہ لاں راجے دیاں رانیاں (میں راجے کی رانیاں چھین لوں)

اوئے۔ ہوہو

پھر اس نے بلند قہقہہ لگایا۔ "لو میں تمہیں ایک اور گانا سناتا ہوں۔ بہت مزے کا گیت ہے۔ ایک عورت جس کا نام بھاگن ہے اپنے۔۔۔۔ یعنی سمجھے نا! اس سے پوچھتی ہے۔

ہائے وے کتھے چلیا اوں[1]

[1] ہاں اے ظالم کہاں چلے ہو تم۔ تم کہاں چلے ہو۔

www.taemeernews.com

حاکماں تُسی، تُسی وے کتھے چلے او۔

اب حاکم جواب دیتا۔

ہے فی دِلّی چلے آں[1]

بھاگنے! اسی، اسی فی دِلّی چلے آں

اِس پر بھاگن کے دِل میں لڈو پھوٹنے لگتے ہیں کہتی ہے

ہیں[2] وے کی لیا دوگے۔

حاکماں! تُسی، تُسی وے کی لیا دوگے۔

بھلا حاکم بھاگن کے لئے کچھ لانے سے کب چوک سکتا تھا۔ لیکن اس موقعہ پر اسے شرارت سوجھتی ہے۔ وہ اصل تحفے کا ذکر تو کرتا نہیں بلکہ کہتا ہے۔

ہیں[3] نی! بلّی لیا واں گے

بھاگنیں! اسی، اسی نی بلّی لیا واں گے

بلّی کا نام سُن کر بھاگن کا جی کٹ جاتا ہے۔ تیور بگڑ جاتے ہیں۔ پوچھتی ہے۔

بلّی کی کرے گی

حاکماں[4]! بلّی، بلّی وے کی کرے گی

حاکم کنکھیوں سے بھاگن کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کے برہم ہو جانے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

ہے فی نہوندر مارے گی[5]

---

[1] اری بھاگن ہم دِلّی چلتے ہیں! [2] ہاں تو پھر دِلّی سے تم کیا لاؤ گے [3] ہاں ری بھاگن ہم دِلّی سے بلّی لائیں گے بلّی [4] بلّی کیا کرے گی اے حاکم، بلّی کیا کرے گی [5] ہاں ری بلّی پنجے مارے گی۔

www.taemeernews.com

بھاگن: ہاں! ہاں! مونہوں دس دے گی۔

بھاگن اس بات پر بظاہر مسرت کا اظہار کرتی ہے اور پھر طنزاً پوچھتی ہے۔

پٹی کون بنھے گا

حاکماں! پٹی، پٹی دے کون بنھے گا۔[1]

اب حاکم کی باری تھی۔ بھاگن سمجھتی تھی کہ اب حاکم سے کوئی بات نہ بن پڑے گی

اب حاکم نے پٹی تو بھاگن کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرما گئی۔ جب شرم

کے مارے بھاگن کے رخسار سرخ ہو گئے تو اس نے کہا۔

پٹی توں بنھیں گی[2]

بھاگنیں پٹی پٹی نی توں بنھیں گی[3]

اوہو ہو ہو"

"کیوں میرا گانا پسند آیا؟"

گانا تو خیر جو تھا سو تھا ہی۔ لیکن گانے میں جو زندگی اور للکار اور اس کے انداز میں

جو بےباکی تھی وہ مجھے بہت پسند آئی۔

اس نے پوچھا "تم بھی گانا جانتے ہو؟"

میں گانا نہیں جانتا تھا۔ کاش میں اسے گانا گا کر ہی سنا سکتا۔ میں نے باتوں ہی

باتوں میں پوچھا "وہ مسلمان کون تھا؟"

وہ ہنس پڑا "وہ میرا جگری دوست ہے سمجھے۔ بڑے عرصے کے بعد بڈھے

گھر[4] سے آیا تھا۔ اچھا ہی ہوا جو مجھے مل گیا۔"

---

[1] پٹی کون باندھے گا! اے حاکم پھر پٹی کون باندھے گا [2] پٹی تو ہی باندھے گی بھاگن، پٹی تو تو ہی باندھے گی [3] پنجاب کے دیہات میں قیدخانے کو طنزاً بڈھا گھر کہا جاتا ہے۔

www.taemeernews.com

"بڑا گھر کیا ہوتا ہے؟"

"ارے تم بڑا گھر نہیں جانتے۔ ہائے افسوس تم بڑے گھر کبھی نہیں جا سکو گے۔ صرف بڑے آدمی ہی بڑے گھر میں جا سکتے ہیں۔۔۔۔ سنو سرکار بہادر! یہ سمجھ لو کہ بڑا گھر صرف انہی لوگوں کے لئے ہوتا ہے جو سرکار کی خدمت کرتے ہیں۔ جب وہ خدمت کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو انہیں آرام کرنے کے لئے بڑے گھر میں بھیج دیا جاتا ہے وہاں وہ اطمینان سے بیٹھ کر سرکار اور پرجا کی سیوا کے نت نئے ڈھنگ سوچا کرتے ہیں۔ چنانچہ جب آرام کرنے کے بعد سرکار کے بڑے گھر سے نکلتے ہیں تو نت نئے طریقوں سے بڑے زور شور سے پرجا کی سیوا کرتے ہیں۔ پرجا سرکار سے انکی پرزور سفارش کرتی ہے۔ سرکار جتنی زیادہ خوش ہوتی ہے اتنی ہی جلدی ان سیوکوں کو بڑے گھر میں بھیج دیتی ہے۔ جو شخص جتنی زیادہ شدت کے ساتھ خدمت کرتا ہے، اتنے ہی زیادہ عرصہ کے لئے اسے آرام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔"

میں بہت دیر تک اپنی عقل کے مطابق بڑے گھر کی بابت سوچتا رہا۔ بچا سنگو سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "میرے ایک دوست کا نام نورا ہے۔ اس کے بڑے گھر میں جانے سے پہلے ایک مرتبہ ہم دونوں ایک گاؤں میں رات کے وقت کسی کے گھر میں گھس گئے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ ہم ہر آہٹ پر کان لگائے ہوئے تھے۔ کوئی غیر معمولی آواز سنائی نہ دی۔ لیکن جب ہم باہر نکلنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جس مکان کے اندر ہم گھسے ہوئے تھے، اسے گاؤں کے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔۔۔"

"آپ لوگ اس گھر میں گھسے ہی کیوں تھے؟"

"ارے ہو! دیکھو ننھے! ایسی باتوں میں ٹوکنا اچھا نہیں ہوتا۔ بس تم یہ سمجھ لو کہ کسی کسی

طرح کسی نہ کسی طرح ہم کسی نہ کسی شخص کے گھر کے اندر گھس گئے تھے۔ گھر والے سوئے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں گھر والوں کی نیند کیسے کھل گئی اور وہ سب گاؤں والوں کو کس وقت بلا لائے۔۔۔۔ اتنے آدمیوں کا اجتماع دیکھ کر ہم بہت گھبرا گئے۔ چپکے سے دبک کر بیٹھ رہے۔ سوچتے تھے کیونکر صحیح و سالم باہر نکلیں۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ پھر یہ بھی کھٹکا لگا ہوا تھا کہ کہیں پڑے پڑے صبح نہ ہو جائے۔ یا پھر وہ لوگ کہیں سے پولیس ہی نہ بلا لائیں۔ چنانچہ ہم دونوں نے مشورہ کیا۔ اور ایک دوسرے کی پیٹھ کی طرف پشت کر کے باہر نکلے تو دیکھا کہ وسیع صحن اور گلی میں آدمی ہی آدمی کھڑے ہیں۔ لاٹھیاں ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔ بس ہم نے لاٹھیاں چلانی شروع کر دیں۔ ہماری جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس قدر جانفشانی سے ہم نے آج تک لاٹھی نہیں گھمائی تھی۔ لوگوں میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ لاٹھیوں کی زد سے بچنے کے لئے وہ ادھر اُدھر ہٹنے لگے۔ ایک بھاگا تو بھگدڑ مچ گئی۔ لیکن جب ان لوگوں نے دیکھا کہ ہم تعداد میں صرف دو ہی ہیں تو پھر ان کا حوصلہ بڑھا۔ اور وہ لپک لپک کر ہمارے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم بھی لہولہان ہو گئے۔ ان کے گھیرے میں سے نکل کر جو ہم بھاگے تو آٹھ کوس تک بھاگتے ہی چلے گئے۔ تاکہ وہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر ہمیں گھیر نہ لیں۔۔۔۔ مجھے مہر جیسا دوست میرے ہمراہ تھا۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو وہیں پران تیاگ دیتا۔"

"مجھے بہت تعجب ہوا کہ سارے گاؤں میں ایک بھی شخص ایسا نہ نکلا جو آپ کا مقابلہ کر سکتا۔"

"کہاں بھئی! ہمارا مقابلہ کرنے کے لئے تو ان پاس پڑوس کے گاؤں میں سے بھی کوئی نہیں نکل سکتا تھا۔ ہاں اگر کہیں میرے ماموں جیسا کوئی آدمی ہوتا وہاں تو پھر

www.taemeernews.com

ہماری دال نہیں گل سکتی تھی۔"

"کیا آپ کے ماموں بہت طاقتور شخص ہیں؟"

"طاقتور؟ — میرے ماموں اس قدر طاقتور شخص ہیں کہ ادھر ادھر کے لوگ انہیں رب کہتے ہیں۔ بڑا بھاری ڈیل ڈول ہے ان کا۔ قد بہت زیادہ نہیں بلکہ کچھ کم ہی ہیں لیکن ان کی نگاہیں ایسی زوردار ہوتی ہیں کہ کسی شخص کو یہ ہمت نہیں ہوتی کہ ان کے سامنے سر بھی اٹھا سکے۔ ان کا علاقے بھر میں شہرہ ہے۔۔۔"

"کیا وہ کبھی چوروں کے ساتھ بھی لڑا کرتے ہیں۔ کبھی کوئی ڈاکو پکڑا انہوں نے؟"

"انہوں نے بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں۔ میں تمہیں ان کی زندگی کا ایک چھوٹا سا بہت ہی دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ ایک دفعہ ماموں رات کے وقت وہ گاؤں سے باہر مویشیوں کے باڑے کے پاس ایک درخت کے نیچے چارپائی ڈالے سو رہے تھے۔ انکے سب مویشی باڑے کے اندر بند تھے۔ اتنے میں وہاں چور آ گئے اور انہیں گہری نیند میں مدہوش پا کر اندر گھس گئے۔ اور سب مال کے ساتھ بہت عمدہ جوڑا نکال کر چل دیئے۔ ابھی وہ بیل ہانکتے ہوئے کوئی چالیس پچاس قدم ہی گئے ہوں گے کہ دفعتاً میرے ماموں کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ فوراً بھانپ گئے کہ چور انکے مویشی لئے جا رہے ہیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور پکار کر بولے "دیکھو تم جو کوئی بھی ہو۔۔۔ میری بات کان کھول کر سن لو۔۔۔ تم میرے مویشی تو لئے جا رہے ہو بڑی خوشی سے لیجاؤ۔ لیکن اتنی بات یاد رہے کہ تم انہیں جہاں کہیں بھی لیجاؤ گے کل کے دن کے اندر اندر اگر میں اپنے مویشی واپس نہ لے آؤں تو میں اپنے باپ کا بیٹا نہیں۔۔۔ اور یہ بھی سن لو کہ میرا نام دھندھا سنگھ ہے۔

وہ آدمی کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑے مشورہ کرتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک شخص بلند آواز میں بولا۔ "جبّا سنگھ سردار! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ تمہارے بیل ہیں۔ نہ ہمیں یہ معلوم تھا کہ چارپائی پر تم ہی سوئے پڑے ہو۔ ہم نے تمہارا نام سن رکھا ہے۔ اس لئے ہم یہ بیل اسی جگہ چھوڑے جاتے ہیں۔" چنانچہ انہوں نے دونوں بیل باڑے کی طرف ہانک دیے اور سب تیز تیز قدموں سے واپس روانہ ہو گئے۔

مجھے اس کی باتیں راستے میں بڑا مزا آ رہا تھا۔ خاموش رات میں سانڈنی کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی ٹن ٹن میں اس کی گونجتی ہوئی آواز ایک خاص کشش رکھتی تھی۔ میں اس سے کوئی بات دریافت کرنے ہی لگا تھا کہ ایک بڑے زور کی پھنکار سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر دیکھا تو کچھ ہی فاصلے پر ایک بہت بڑا سانپ پھن اٹھائے لہرا رہا ہے۔ میرے جسم میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ جبّا سنگھ نے سانڈنی روک لی۔

کچھ دیر تک وہ سانپ کی طرف دیکھتا رہا۔ "یہ سانپوں کا راجہ ناگ ہے۔ بہت خطرناک ہے۔ اگر یہ کسی کو کاٹ لے تو اسے پانی مانگنے کی مہلت نہ ملے۔" پھر اس نے مجھے سانڈنی پر بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور خود نیچے اتر گیا۔

سانپ ابھی تک پھن اٹھائے لہرا رہا تھا۔ جبّا سنگھ نے کندھے سے چادر اتار کر اپنے ہاتھوں میں لپیٹی اور دائیں ہاتھ میں لاٹھی لے کر وہ آگے بڑھا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لال مرچ کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ اسکی گھنی بھنووں تلے اس کی تیز آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے اپنا لوہے کا کڑا کلائی سے نکال کر بازو پر چڑھا لیا۔ سانپ کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا اور سانپ کی نظروں سے نظریں ملا کر کھڑا ہو گیا۔

میں ڈر گیا۔ میں نے اُسے آواز دے کر واپس چلے آنے کے لئے کہا۔ لیکن اس نے میری طرف دیکھے بغیر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اور خود سانپ کے اور بھی نزدیک چلا گیا۔

میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر دیکھا کوئی آدمی یا جانور یا پرندہ نظر نہیں آتا تھا۔ چاند کی روشنی اب کچھ تیز ہوگئی تھی۔ ببول کے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ ان کی شاخوں کی نازک سے نازک کونپلیں تک ساکن تھیں۔ وہ ایسی بے اعتنائی کے ساتھ کھڑے تھے جیسے انہیں اس بات سے دُور کا بھی تعلق نہ ہو۔ اس سنسان مقام پر انسان اور ناگ کا مقابلہ میرے لئے ایک نئی اور عجیب شے تھی۔ مجھے یقین تھا کہ سانپ دیکھتے دیکھتے جسا سنگھ کی ننگی ٹانگ پر دانت مارے گا۔ اور وہ اسی وقت تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ واپس چلا آئے لیکن وہ میری بات سنتا ہی کب تھا۔ اب وہ عورت بھی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ ورنہ میں بھاگ کر اسے ہی بلا لاتا۔ وہ تو اسے روک سکتی تھی۔

جسا سنگھ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ اس وقت ایک جنگلی بچے کی طرح خمری اور کھلنڈرا دکھائی دے رہا تھا۔ سانپ کے قریب کھڑے ہو کر وہ اچک کر اپنا تہمند اس کے پھن کے قریب ہلانے لگا۔ سانپ نے بھی پھن بڑھا بڑھا کر دو تین مرتبہ اُسے کاٹنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ جو اس نے ذرا بڑھ کر چادر اس کے قریب کی تو اُدھر سانپ اچھل کر چادر سے لپٹ گیا۔ جسا سنگھ نے چادر زمین پر پھینک کر اسے لاٹھی سے پیٹنا شروع کیا۔ ایک لمحہ کے لئے سانپ اس کے پاؤں کے قریب دکھائی دیا۔ پھر وہ بھاگ نکلا۔ جسا سنگھ بھی اچھل کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ پھر وہ ہموار زمین پر ایک دوسرے کے پیچھے بڑھ گئے۔ سانپ پلٹ پلٹ کر اس پر حملے کرتا تھا۔ تھوڑی دیر میں

www.taemeernews.com

وہ بہت دُور نکل گئے۔ جتنا سنگھ کی لاٹھی بار بار ہوا میں بلند ہوتی تھی۔ اور پھر دفعتاً جتنا سنگھ زمین پر گر پڑا۔۔۔ اٹھا اور پھر گر پڑا۔۔۔۔ میرا دھڑکتا ہوا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ شاید وہ عورت جس سے وہ تھوڑی دیر پہلے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ ابھی تک درخت کے تنے کے ساتھ لگی ہو۔۔۔ جتنا سنگھ پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا میرے قریب آیا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا سانپ نے آپ کو کاٹ کھایا تھا"

"نہیں تو" وہ ہنس کر بولا "وہاں گیلی زمین تھی میرا پاؤں رپٹ گیا۔ دیکھو یہ میرا کپڑا بھی کیچڑ میں خراب ہو گیا۔۔۔ گر کر میں اُٹھنے لگا تو پھر گر گیا۔۔۔"

"تو سانپ بھاگ گیا؟"

"کبھی نہیں سانپ کو بھاگنے بھی دیتا میں۔ تم جانتے نہیں اگر یہ سانپ ایک مرتبہ زخمی ہو کر بچ نکلے تو اپنے دشمن سے انتقام ضرور لیتا ہے۔ اسی لئے میں اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ اب تو میں نے اس کا سر اچھی طرح کچل کر رکھ دیا ہے۔۔۔۔ آؤ نیچے اُتر کر تمہیں بھی سانپ دکھلائیں۔۔۔"

جب ہم مرے ہوئے سانپ کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ کم از کم چھ ہاتھ لمبا سانپ تھا پیٹھ بالکل سیاہ تھی۔ پیٹ سفیدی مائل تھا۔ بل کھایا ہوا مردہ سانپ اب بھی اس قدر خوفناک دکھائی دیتا تھا کہ اس کے نزدیک جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

اس بات کی مزید تسلی کر لینے کے بعد کہ سانپ واقعی قطعاً مر چکا ہے۔ ہم واپس آ کر سانڈنی پر سوار ہو گئے۔

میں نے زندگی میں اس قسم کے سنسنی خیز واقعات کم ہی دیکھے تھے۔ مجھے ابھی تک

www.taemeernews.com

پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ جسا سنگھ کی جسارت، احمقانہ حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ لیکن وہ پورے وثوق کے ساتھ نیچے اترا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ سانپ کو مار ڈالے گا۔ لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر کہیں سانپ جسا سنگھ کو کاٹ ہی کھاتا تو کیا ہوتا۔

جسا سنگھ نے سانڈنی کو لٹکا کر لے چلتے ہوئے کہا۔ یہ سانپ بہت ظالم ہوتا ہے یہ گائے کا تھن منہ میں لیکر دودھ پی جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی یہ انسان ذات کا دشمن بن بیٹھتا ہے۔ اس وقت اس کی کارستانیاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ جو آدمی دکھائی دے اسے کاٹنے سے نہیں چوکتا۔ ایسا سانپ بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ اور پھر سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ یہ جانور بھی چھوٹا سا ہوتا ہے۔ وہ بہت چالاک اور مکار اس کو مار ڈالنا بھی آسان نہیں ہے۔ ایسے سانپ سے واگورو ہی بچا سکے۔

اسی طرح باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ جسا سنگھ نے کہا۔ وہ دیکھو سامنے تمہارا ہی گاؤں ہے نا؟

میں اس کی باتوں میں اس قدر محو تھا کہ مجھے ادھر ادھر کا کچھ خیال ہی نہ رہا تھا۔ اب ہم گاؤں کے قبرستان کے قریب سے گزر رہے تھے۔ بیریوں کے بیچ میں ابھری ابھری قبریں چاندنی رات میں اور بھی زیادہ بھیانک دکھائی دے رہی تھیں۔ نیم کے درختوں کے تنے چوروں کا گمان بھی نظر آ رہا تھا۔ کنوئیں کی چرخی تاریکی میں کسی نقاب پوش آدمی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ گاؤں سے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے جہاں دن کے وقت مرغیاں اور ان کے ننھے ننھے چوزے بے خوف سے زمین کریدتے پھرا کرتے تھے۔ پرے چھوٹے چھوٹے درختوں کا جھنڈ تھا جو ایسے دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے چور گاؤں میں گھسنے سے پہلے آپس میں صلاح مشورہ کر رہے ہوں۔

جب ہم گاؤں میں پہنچ گئے تو گاؤں کے بیرونی سرے پر بنے ہوئے رہٹ کے قریب جسا سنگھ نے اپنی سانڈنی بٹھا دی۔ میری سائیکل تو پھر خود اتارا اور مجھے بھی اتارا۔ میری گٹھڑی میرے حوالے کر دی۔

گاؤں پر اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی متنفس دکھائی نہ دیتا تھا۔ آدھی رات کے قریب گزر چکی تھی سب لوگ اپنے کچے مکانوں کی چھتوں پر پڑے سو رہے تھے۔ صرف گاؤں کے دوسرے سرے سے کتوں کے بھونکنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔

اس نے چلتے ہوئے رہٹ سے پانی پیا۔ پانی کی بوندیں اس کی مونچھوں سے نیچے کی طرف ٹپک کر لرزنے لگیں۔ میں نے سائیکل قریب کی ایک دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑی کر دی۔ گٹھڑی بھی اسی پر رکھ دی۔ جسا سنگھ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں اس سے اس قدر مانوس ہو چکا تھا۔ جیسے ہم برسوں کے واقف ہوں۔ میں ایسے محسوس کر رہا تھا کہ آئندہ ہم زندگی بھر ساتھ ساتھ رہیں گے۔ اس نے اپنے بے تکلفانہ لہجے میں پوچھا "کہو اب تو گھر پہنچ جاؤ گے۔ راستہ تو نہیں بھولو گے؟"

میں نے شرما کر کہا "جی نہیں۔ اب میں پہنچ جاؤں گا۔"

میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن سمجھ نہ سکا کہ اس جذبے کا اظہار کیونکر کروں۔ میں اسی کشمکش میں تھا کہ اس نے پگڑی کے شملے سے مونچھیں اور داڑھی پونچھتے ہوئے کہا "اچھا اب تم گھر کو جاؤ۔ میں بھی جاتا ہوں۔"

میں نے اس کی پگڑی کے شملوں کی طرف دیکھا۔ ایک کان کے قریب لٹک رہا تھا اور دوسرا ہوا میں بلند پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ میں نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ وہ ایک بھاری ستون کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں کاندھے کسے

ہاتھوں میں میرا کمزور اور چھوٹا سا ہاتھ تھام کر مصافحہ کیا۔ اس طرح اس قدر بڑے آدمی سے
ہاتھ ملانے میں مجھے فخر محسوس ہوا۔ مجھے یہ خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ وہ ایک دم واپس
جانے پر تُل جائے گا۔ میں نے کہا "آئیے ہمارے گھر چلیے۔ گھر کے لوگ آپ کو دیکھ کر
بہت خوش ہونگے۔"

یہ بات سن کر اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اس کی ہنسی رُکنے ہی میں نہ آتی
تھی۔ اس نے انگلی سے پہلے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کیا کہتے ہو!....
مجھے دیکھ کر خوش ہونگے!.... ہا ہا ہا۔"

ہنستے ہنستے اس کی ناک کی نوک سُرخ ہو گئی۔

میں نے اس کی انگلی پکڑ کر اسے ساتھ لیجانے کے لئے اصرار کیا تو پھر وہ کہنے
لگا۔ "آج مجھے بہت ضروری کام ہے۔ اس لئے تم جاؤ۔ میں کبھی آؤنگا۔ تمہارا نام تو
میں جانتا ہی ہوں......"

میں نے انگلی اٹھا کر کہا "ضرور"

"ضرور" وہ ہنسنے لگا۔

اس کے بعد وہ اپنی کلہاڑی سنبھالتا ہوا سائیکل پر سوار ہو گیا۔ میں اس کی طرف
دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔ [illegible]
لیکن وہ پھر کبھی نہیں آیا...... کبھی نہیں۔

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

تین باتیں

رویل سنگھ گوردوارہ ڈیرہ صاحب کے صحن میں سویا ہوتا تو اسے منہ اندھیرے ہی جاگنا پڑتا۔ چونکہ گوردوارے میں صبح ہی صبح شبد کیرتن شروع ہو جاتا تھا۔ اور صحن کی صفائی کے لئے مسافروں کو جگانا پڑتا تھا۔ اس لئے چھت پر دیر تک سویا رہا۔ یہاں تک کہ سورج نکل آیا اور تیز دھوپ میں شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ کا کلس جگمگا اٹھا۔

کیرتن شروع ہو چکا تھا۔ اور گرد پریم کے متوالے زندگانی جمع ہو رہے تھے رویل سنگھ کو اپنی غفلت پر بڑی شرم محسوس ہوئی۔ جب وہ گاؤں میں تھا تو کبھی اتنی دیر سے نہیں اٹھا تھا۔ لیکن جب سے وہ لاہور میں آیا تھا۔ دن بھر آوارہ گردی کرنے کے بعد اس قدر تھک جاتا تھا کہ طلوع آفتاب تک غرق رہتا تھا۔

لیٹے لیٹے اس نے اپنے پاؤں پر نگاہ ڈالی اس کے پاؤں بڑے بڑے تھے اور ٹخنوں کی ہڈیاں کسی بیل کی ہڈیوں سے کم نہ تھیں۔ اس کی ٹانگیں بہت لمبی تھیں۔ اور لمبی دوڑوں میں حصہ لینے کی وجہ سے وہ مضبوط اور خوش وضع ہو گئی تھیں۔

کچھ دیر اسی طرح لیٹے رہنے کے بعد وہ دفعتہً اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ جو لوگ رات کو اس کے ساتھ چھت پر سوتے تھے۔ ان میں سے بیشتر جا چکے

www.taemeernews.com

تھے۔ اس نے صحن کی طرف جھانک کر دیکھا جہاں عورتیں چھوٹے چھوٹے گھونگھٹ نکالے ہاتھوں میں ڈونگے اور کٹوریاں تھامے ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔

اپنے گھر میں بھی وہ اسی طرح اُچھل کر اُٹھ بیٹھتا تھا۔ یہاں اسے کوئی کام نہ تھا۔ پہاڑ سا دن کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ چار دنوں سے وہ گوردوارے کے لنگر سے روٹی کھا رہا تھا۔ تھوڑی سی نقدی جو اس کے پاس تھی وہ شربت اور لسی پینے کے لیے اس کے پاس صرف چند آنے باقی رہ گئے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے بعد اس کا گذارہ کیسے ہوگا۔ وہ شرافت کا کچھ ایسا قائل بھی نہ تھا۔ وہ ٹکے ہوئے کلّوں والے بنیوں کو بڑی خوفناک نظروں سے گھورا کرتا تھا۔ لیکن یہ لاہور تھا۔ ایک گہما گہمی ــــ متواتر آمد و رفت ــــ کوئی اِکا دُکا مل جائے تو وہ ایک ہی دھول جما کر اپنا ٹکا ہتھیا لے۔ اسے یاد آیا کہ ..... پانچ چھ ماہ پہلے وہ اس کے ساتھی گاؤں کے ایک ساہوکار کے گھر میں آدھی رات کے وقت جا گھسے۔ جب کچھ ہاتھ نہ آیا تو جلدی میں انہوں نے تیرہ بوریاں گیہوں کی اڑالیں۔ لیکن پکڑے گئے۔ تین ساتھی تو سزا پا کر بڑے گھر پہنچ گئے۔ مگر وہ اور اس کے ایک ساتھی کا جرم ثابت نہ ہو سکا ــــ آئندہ کے لیے اس نے توبہ تو نہ کی، البتہ محتاط ہو گیا..... احتیاط کی چند اور وجہیں بھی تھیں..... ایک تو گرفتاری کی صورت میں اسے بچانے والا کوئی نہ تھا، باپ مر چکا تھا اور ماں بیچاری بے دست و پا تھی۔ دوسرے امر کور جس کے ساتھ اسے بہت زیادہ محبت تھی۔ اور جو نازک اندام اور دھارمک خیالات کی لڑکی تھی، اس سے کہنے لگی کہ اگر تم جیل چلے گئے تو میں کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔ رویل سنگھ جانتا تھا کہ وہ ضدی لڑکی جو کچھ کہتی ہے اسے پورا کر دکھائے گی۔ چنانچہ اس کی محبوبہ اور اس کی ماں نے مل جل کر اسے اس بات پر رضامند کر ہی لیا کہ وہ

www.taemeernews.com

شہر میں جاکر کوئی نوکری تلاش کر لے۔ تاکہ وہ لوگ آرام سے زندگی بسر کر سکیں۔

اس کی محبوبہ امر کور اپنی عمر کی نسبت کہیں زیادہ سیانی اور دور اندیش تھی۔ اس نے رویل سنگھ کے دل میں بجائے آوارگی کے گھر کا پیار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کا ایک گھر ہوگا۔ وہ دونوں خوب مزے میں بڑے پیار سے اکٹھے رہا کریں گے۔ انکے ہاں ننھے منے بچے پیدا ہونگے۔ پھر انہیں کتنی خوشی حاصل ہوگی۔ رویل سنگھ کا کند ذہن ان باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کا اکھڑ دل گھر کی کشش سے بیگانہ ہی رہا۔ لیکن جب شام کے دھندلکے میں کستی کی پیٹڑی پر امر کور گیلی مٹی کا تسلہ سر پہ رکھے ہنس ہنس کر اس قسم کی باتیں کرتی تو اس کی تیزی سے گھومنے والی چمکدار آنکھیں اور پتلے پتلے ہونٹ اسے بہت ہی بھلے معلوم ہوتے۔ اس کی زبان باچھوں پہ کھٹنے لگتی۔ جیسے امر کور مٹھائی کا دونا ہو۔ اگر وہ امر کور مٹھائی کا دونا ہو۔ اگر وہ امر کور کا ایسا ہی شیدائی تھا تو گھر، گھر کا پیار اور بچے، تو معمولی باتیں تھیں۔ لیکن جب امر کور دیکھتی کہ وہ اس کی باتوں کی طرف دھیان دینے کی بجائے حریص نظروں سے اس کے گالوں اور ہونٹوں کی طرف دیکھ رہا ہے تو سٹ پٹا کر ٹوٹے ہوئے سپرنگ والی گھڑی کی طرح خاموش ہو جاتی۔ اور موقع ہوتا رویل سنگھ اسے دونوں بازوؤں میں دبوچ لیتا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں متحرک ہو جاتیں "بھئی لو دیکھو منہ مت پھلاؤ۔ دھرم سے جو تم کہو گی وہی کرونگا۔" "تو میں کیا کہہ رہی تھی..... تم سے؟" امر کور چمک کر پوچھتی۔

"سنو امرو! میری موٹی عقل ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ تم مجھے سمجھانے کی کوشش مت کرو۔ بس مجھے اتنا بتا دو کہ میں کیا کروں؟"

پھر وہ اس کے تمتماتے ہوئے گالوں پہ ہونٹ رکھ دیتا۔ امرو اسے پیار کرنے

www.taemeernews.com

کی چھٹی بھی دے دیتی اور ساتھ ہی ملامت بھی جاری رکھتی۔ دیکھو! ....کوئی آرہا ہے ......؟ کوئی دیکھ لیگا! ......اب میں یہاں کبھی نہیں آؤنگی اس جگہ...بس دیکھ لینا۔ ہاں اسے"

ان کے گھر کے قریب ہی امرو کی گائے بندھی رہتی تھی۔ شام کے وقت امرو وہاں دودھ دوہنے کے لئے آتی تھی۔ جب وہ ادھر سے گذرتا تو اُچک کر ایک نظر ادھر ضرور ڈالتا۔ اگر امرو دکھائی دیتی تو پہلے ادھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کرلیتا اور پھر اسے مخاطب کر کے گنگنانے لگتا۔

نی..... لچھیئے بادام رنگیئے
تینوں لین کبوتر آیا

......"جو بولے سو نہال"— گرودوارے کے متوالوں نے نعرہ بلند کیا۔ نوردیپ سنگھ چونک اٹھا۔ اب پرشاد بانٹا ہی جانے والا تھا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر اپنا کنگھا سنبھالا اور منتشر بالوں کو سمیٹنے کے بعد جلدی سے پگڑی باندھی اور چادر کندھے پر ڈال کر تہمد کی سلوٹیں درست کرتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے اور پگڑی کے شملے سے چہرہ پونچھا۔ گوردوارے کے دروازے پر نہنگ سکھوں کو کھڑے دیکھ کر بڑے عقیدت مندانہ انداز سے پاؤں بھی دھو ڈالے اور دروازے کی چوکھٹ پھلانگ کر اندر داخل ہوا۔ پہلے ایک مرتبہ اس نے غلطی سے چوکھٹ پر پاؤں رکھ دیا تھا تو سیوادار نے اسے آنکھیں دکھا کر ٹوک دیا تھا۔

پرشاد بانٹا جارہا تھا۔ اس نے پہلے تو سامنے سے ہاتھ بڑھا کر پرشاد لیا۔ پھر پینترا بدل کر دوسری طرف ہاتھ بڑھا کر پرشاد لے لیا۔ پرشاد دینے والے کو ذرا شک گذرا۔

www.taemeernews.com

جب ذرا چکر کاٹ کر اس نے تیسری مرتبہ ہاتھ بڑھائے تو پرشاد بانٹنے والے کو غصہ آ گیا۔ "سردار جی! بڑے افسوس کی بات ہے۔" واقعی بات افسوس کی تھی لیکن وہ صبح کو اسی تلوے سے ناشتہ کیا کرتا تھا۔ اور اوپر سے پاؤ بھر دہی کی لسی پی لیتا تھا۔ گاؤں میں تو ہر شخص کو پاؤ بھر حلوا دیا جاتا تھا لیکن یہاں ــــ؟ یہ شہری لوگ بھی اتنا حلوہ دے کر رہ جاتے تھے۔ چنانچہ رویل سنگھ نے کہا۔ "گیانی جی! اتنا سا حلوہ تو ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔۔۔۔ یہ تو بس ہتھیلی سے چپک کر رہ جاتا ہے۔"

پرشاد بانٹنے والے نے تیور بگاڑ کر کہا۔ "سردار صاحب! یہ پرشاد آخر پرشاد ہے۔۔۔۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پرشاد ہی سے پیٹ بھر لیا جائے۔"

رویل سنگھ اس قسم کی منطق سے واقف نہیں تھا۔ چپ چاپ ایک طرف سرک کر کھڑا ہو گیا۔ جب سبھی متوالے چلے گئے تو وہ ایک کونے میں سیمنٹ کے سرد فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں گیانی جی نمودار ہوئے اور ایک بڑے دونے میں پاؤ، ڈیڑھ پاؤ حلوا ڈال کر اسے دے گئے۔ رویل سنگھ حیران رہ گیا۔ جب حلوا کھا کر وہ باہر نکلا، تو پاؤ بھر دہی میں سیر بھر پانی ڈالکر لسی پینے لگا۔

لسی پینے کے بعد وہ سیدھا بڈھے دریا کی طرف چل دیا۔ دو دن پہلے وہ سردار بدھ سنگھ چوب فروش کے ہاں گیا تھا۔ وہ انکے گاؤں ہی کے رہنے والے تھے۔ انہیں ایک ملازم کی ضرورت تھی۔ اور وہ رویل سنگھ کو نوکری دینے پر رضامند ہو گئے تھے لیکن یہ الفاظ بدھ سنگھ کے بیٹے ہربنس سنگھ نے کہے تھے۔ اسی لئے وہ بدھ سنگھ سے ملنے کے لئے آج پھر وہاں آیا تھا۔ بدھ سنگھ کو مصروف دیکھ کر رویل سنگھ کونے میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔

www.taemeernews.com

ردیل سنگھ کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ دو جماعتیں پاس کر چکا تھا تیسری جماعت میں ایک مرتبہ ماسٹر نے اسے زیادہ دیر تک مرغا بنائے رکھا تو اس نے پڑھنا لکھنا ترک کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے انگریزی پڑھنے کی کوشش بھی کی تھی چنانچہ وہ "اے" سے "زیڈ" تک سارے حروف پڑھ لیتا تھا۔ اور ان میں سے بعض لکھ بھی سکتا تھا۔

فراغت پا کر بڈھا ردیل سنگھ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی نظر کمزور تھی۔ اور کان بھی کچھ بہرے تھے۔ چنانچہ ردیل سنگھ کو اس کے قریب پہنچ کر اور چلا چلا کر اپنا مدعا بیان کرنا پڑا۔ بمشکل بڈھے نے بتایا کہ اس کے پہلے ملازم کا خط کل ہی آیا ہے۔ اور وہ دو چار روز تک واپس آنے والا ہے۔ اس لئے وہ اسے نوکر نہیں رکھ سکتے۔

ادھر سے جواب پا کر ردیل سنگھ نے سبیل سے پانی پیا اور شہر کی طرف چل دیا۔ اب وہ بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا آج سیر کر کے کل گاؤں واپس چلا جائے۔ وہ بڑی بڑی امیدیں لیکر شہر میں آیا تھا۔ لیکن اب کیا منہ لیکر واپس جائیگا۔ وہ ایک بے فکر اور آوارہ مزاج نوجوان تھا۔ اس قسم کی پابندیوں اور مجبوریوں سے کبھی وہ دو چار نہیں ہوا تھا۔ گھومتے گھومتے وہ شاہی محل کے نزدیک ایک دھرمسالہ میں پہنچ گیا۔ وہ دن میں ایک آدھ مرتبہ اس دھرمسالہ میں چلا آیا کرتا تھا۔ یہاں کا گرنتھی البیلی طبیعت کا نوجوان شخص تھا۔ ان دونوں میں کچھ بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی مگر ردیل سنگھ نے اسے کبھی اپنا رازدان نہیں بنایا تھا۔ گرنتھی اسے اپنی طرح ایک کھاتا پیتا زمیندار سمجھتا تھا۔

وقت کٹی کے لئے ردیل سنگھ دوپہر کو وہاں پہنچ جاتا۔ وہ دونوں فرش پر بیٹھے پانی کا ذکر کرتے ...... اور بڑے پنکھے تلے اینٹوں کے بنے ہوئے سرد فرش پر لیٹ جاتے ادھر ادھر کی گپیں ہانکتے ہانکتے جب نیند آتی تو سو بھی جاتے۔

www.taemeernews.com

آج وہ وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ جب سیڑھیاں چڑھ کر ہال میں داخل ہونے لگا تو دیکھا کہ پہلو والے کمرے میں گرنتھی ریٹھوں کے پانی سے سر دھو رہا ہے۔ اسے دیکھ کر گرنتھی نے قہقہہ لگایا۔ دو چار باتوں کے بعد رویل سنگھ اندر چلا گیا۔ اس نے صراحی سے گلاس میں پانی انڈیلا اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ دراصل اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ کئی دنوں سے وہ لنگر کی روٹیاں کھا رہا تھا۔ اب اسے شرم محسوس ہو رہی تھی اس نے سوچا کہ اب وہ کم از کم ایک وقت کا کھانا وہاں سے نہیں کھائے گا۔

پنکھا چھوڑ کر اس نے پگڑی اتاری اور فرش پر لیٹ گیا۔ گرنتھی نہانے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کئے جاتا تھا۔ اس کی بے تکی باتوں سے رویل سنگھ اپنی بھوک کو بہلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد گرنتھی اپنے لمبے لمبے بال نچوڑتا ہوا اندر داخل ہوا اور ایک بڑے مزے کی بات شروع کر دی۔

اتنے میں ایک شخص انہیں کھانے پر بلانے آیا۔ شرادھوں کے دن تھے۔ رویل سنگھ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ آج پیٹ بھر کھانا ملے گا۔ معمولی سے تکلف کے بعد کھانے میں شریک ہو گیا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد اس پر ایسی گہری نیند چھائی کہ شام تک اس کی آنکھ نہ کھلی۔ اٹھتے ہی اس نے نل کے ٹھنڈے پانی سے اشنان کیا تو طبیعت کھل گئی۔ گرنتھی نے شکر کے ٹھنڈے شربت میں ستو گھول رکھے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے دو لوٹے پیئے۔ وہ ستوؤں کا بڑا شوقین تھا۔

دوبارہ پگڑی باندھ کر اس نے گرنتھی سے مصافحہ کیا۔ اور اس نے بتایا کہ اس کا کام ختم ہو چکا ہے۔ اور وہ کل اپنے گاؤں لوٹ رہا ہے۔ اس پر گرنتھی نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور تاکید کی کہ وہ جب کبھی امرتسر آئے تو اسے ضرور ملے۔"

www.taemeernews.com

یہاں سے وہ بازار کی سیر کرنے کے لئے چل کھڑا ہوا۔ انار کلی میں گھومتا ہوا وہ نیلہ گنبد جا نکلا۔ وہاں اس نے لکڑی کے بڑے بڑے تختوں پر مختلف قسم کی تصویریں دیکھیں ایک تصویر میں پہاڑ کا منظر دکھایا گیا تھا۔ پہاڑ میں جگہ جگہ بل بنے ہوئے تھے۔ اِدھر اُدھر پتھروں پر بڑے بڑے چوہے دوڑتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ نیچے لکھا تھا۔ "جاپانی چوہے ہیں انہیں مار بھگاؤ" یہ تصویر دیکھ کر رویل سنگھ بہت خوش ہوا۔ خصوصاً چوہوں کی صورتیں بڑی مضحکہ خیز تھیں۔ یعنی جسم تو چوہے کی مانند اور سر انسانوں کے بعض چوہوں نے مینکیں بھی لگا رکھی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ جب وہ گاؤں میں جا کر امر کو رسے ان چوہوں کا ذکر کرے گا۔ تو وہ کس قدر خوش ہو گی۔ کتنی حیران ہو گی ——

پھر اس نے دماغ پر زور دیا کہ آخر یہ جاپانی کون ہیں؟ یہ کس قسم کے چوہے ہوتے ہیں۔ اس نے آج تک ایسے چوہے نہیں دیکھے تھے۔ اس نے پگڑی سرکائی، سر کھجایا۔ غور کیا۔ لیکن کچھ نہ سمجھ سکا۔

اتنے میں کسی نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ یہ اس کا ایک پرانا دوست ہرسا سنگھ تھا۔ دھوپ میں اس کا چہرہ کالے بوٹوں کی طرح چمک رہا تھا۔ آدھی پگڑی سر پہ بندھی ہوئی تھی اور آدھی ادھر اُدھر جھول رہی تھی۔ رویل سنگھ اچھل کر اس سے بغلگیر ہو گیا۔

ہرسا سنگھ بھاٹوں کے خاندان سے تھا۔ رویل سنگھ کو اس سے خاص انس تھا۔ ہرسا سنگھ مضبوط جسم کا شیر دل شخص تھا۔ اسے ایسے ایسے ہتھکنڈے یاد تھے کہ بڑے بڑے استاد اس کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ دونوں بچپن ہی سے بہت گہرے دوست تھے ہرسا سنگھ کبڈی کھیلنے میں طاق تھا۔ اس کا جسم مچھلی کی طرح چکنا اور خرگوش کی مانند پھرتیلا تھا

www.taemeernews.com

اور وہ بھیڑیئے کی طرح خونخوار اور مکار تھا۔ جوان ہوتے ہی اس نے بڑے پیمانے پر ڈاکے ڈالنے شروع کر دیئے تھے۔ اس نے علاقہ کے ایک نامی ڈاکو سندر سنگھ سے بھی ساز باز کی تھی۔ اور ان دونوں نے مل کر بڑے بڑے میدان مارے تھے۔ بعد میں سندر سنگھ کو پھانسی ہو گئی اور ہرسا سنگھ روپوش ہو گیا۔ آج اسے اپنے سامنے دیکھ کر رویل سنگھ کو بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ دونوں ایک حلوائی کی دوکان میں داخل ہوئے۔ ہرسا سنگھ نے دو سیر مٹھائی خریدی۔ اور مٹھائی کھانے کے بعد دونوں نے پیٹ بھر کر لسی پی۔

ہرسا سنگھ نے اُسے بتایا کہ اس نے ضلع امرتسر میں دو ایسے گھر تاڑ رکھے ہیں۔ جہاں سے مال اُڑا لانا چنداں مشکل نہیں ہے۔ یہ سن کر رویل سنگھ بہت خوش ہوا۔ اس قسم کی گفتگو سے اسے گہری دلچسپی تھی۔ اس نے مستقبل کا نہایت دلفریب تصور باندھا۔ اور ان دونوں میں عہد و پیمان ہو گیا۔ کہ وہ کل پھر اسی جگہ ملیں گے۔ یہ طے کر کے وہ دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

ہرسا سنگھ کے چلے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک رویل سنگھ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل پر سے بھاری پتھر ہٹ گیا ہو۔ لیکن جب اسے امرو کا خیال آیا تو وہ کچھ مایوس سا ہو گیا۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ اس نے پھر ڈاکے ڈالنے شروع کئے ہیں۔ تو یقیناً بگڑ جائے گی۔ اسے چور کی بیوی بننا کبھی پسند نہ تھا۔ اس پر اس نے دل ہی دل میں امرو کو دو تین گالیاں بھی دیں..... لیکن وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اس لئے اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پھر سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ اگر یہ ممکن ہو سکے کہ وہ صرف ایک بار ڈاکہ ڈال لے پھر چاہے زندگی بھر کے لئے اس پیشے کو خیرباد کہہ دے لیکن اگر وہ گرفتار

www.taemeernews.com

ہوگیا تو اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ امرود سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ ماں کو علیحدہ دُکھ ہوگا۔ اور وہ خود جیل میں پڑا سڑیگا۔

اسی ادھیڑبن میں وہ چلا جا رہا تھا۔ اگرچہ یہ کام بہت مشکل تھا۔ لیکن وہ صحت مند اور مضبوط ہونے کے باوجود مکار تھا۔ اور وہ نہیں جانتا تھا کہ آخر کیا کرے۔ سڑکوں پر بے شمار موٹریں، بیش قیمت کپڑے پہنے ہوئے امیر لوگ اعلیٰ سے اعلیٰ دکانیں اور اونچے اونچے مکانات دیکھ کر وہ حیران ہو رہا تھا۔ آخر ان سب کے لیئے اس قدر روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ وہ کیوں اپنی ماں کو یہ کیسا تو بُرا بن زندگی بسر کرنے سے معذور ہے؟ اسی قسم کے خیالات میں ڈوبا ہوا وہ ایک باغ میں جا نکلا۔ ایک روش کے کنارے بڑے سے بورڈ پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔

"بہادری کے صلہ میں"

وہ سوچنے لگا کہ "صلہ" کیا ہوتا ہے۔ پھر وہ غور سے اس تمغہ کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ "وکٹوریہ کراس" سنگل سنگھ آٹھویں راجپوتانہ رائفلس کو بہادری کے صلہ میں وکٹوریہ کراس دیا گیا"

وہ نہیں جانتا تھا کہ وکٹوریہ کراس ہوتا کیا ہے۔ اور کیسی بہادری پر دیا جاتا ہے اور پھر وکٹوریہ کراس ملنے کے بعد کیا ہوتا ہے ...... اکتا کر وہ پرے ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اسے اپنی کم عقلی پر بہت ہی افسوس ہوا۔ وہ پھر اپنے خیالات میں کھو گیا اور اپنی پیشانی کو انگلیوں سے بجا بجا کر سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے وہ سرسا سنگھ سے دوبارہ ملے یا نہ ملے۔

وہ گھاس پر لیٹ گیا۔ ایک بازو سر کے نیچے رکھ لیا۔ دوسرا پیشانی پر اور نیم وا

آنکھوں سے دور ہونے تک نظر ڈالتا رہا۔ سامنے ٹھنڈی سڑک کے پرلے سرے پر بہت لمبا چوڑا تختہ اونچا کیا گیا تھا۔ اس پر ایک خوبصورت عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس عورت کا چہرہ اس سے پہلے کا دیکھا ہوا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں اور سرخ سرخ گالوں والی بہت حسین عورت تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید یہ کسی عورت کا فوٹو ہے۔ نیچے انگریزی کے بڑے بڑے حروف میں کچھ لکھا تھا۔ اس نے سوچا شاید یہ کسی ہیروئن کی تصویر ہو۔ اس نے … کے پاس بیٹھے … سنا تھا کہ … کیوں لگی ہیں۔ لیکن اس تصویر کو بار بار دیکھنے کی کیا ضرورت تھی … نمائش … گئی تھی۔ پھر وہ تصویر کی لمبائی چوڑائی کو دیکھ دیکھ کر حیران ہونے لگا … اس کے ساتھ ایک اور تصویر لگی تھی۔ اس پر موٹے موٹے حروف میں کچھ لکھا تھا۔ اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھا … غور کرنے لگا … پڑھ سکا۔

"… ہے"

"… جیسے نوجوانوں کی ضرورت …"

وہ اچھل پڑا۔ یہ انڈین آرمی … تو اس نے … لیکن انڈین آرمی … شاید کسی انگریز عورت کا نام ہو۔ اُدھر اُدھر کچھ لوگ گھوم رہے تھے۔ اس کے دل میں آئی کہ کسی سے اس عورت کی بابت دریافت کرے لیکن عورت کا معاملہ تھا۔ اس قسم کی بات کسی سے پوچھتے ہوئے اسے شرم آئی … دل کی بات دل ہی میں رہ گئی … چادر کو تہ کر کے اسے سر کے نیچے رکھا اور لیٹ گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہوا میں ایک لطیف سی نمی

www.taemeernews.com

تھی۔ اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ لیٹے لیٹے وہ انڈین آرٹ کور کی بابت پھر سوچنے لگا۔ رفتہ رفتہ اسے کچھ سمجھ آنے لگی۔ کہ اس عورت کا تصویر نصب کرنے کا کیا مقصد ہے؟ اس نے سنا تھا کہ لاہور میں بڑی بڑی بدمعاشیاں ہوتی ہیں۔ لیکن کیا کوئی عورت اس قدر جرأت کر سکتی ہے کہ اپنی تصویر اس طرح سر بازار کھڑی کر کے دوسرے تختے پر لکھوا دے۔ کہ "انڈین آرٹ کور" کو آپ جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے ـــــ اس نے پریوں کی کہانیوں میں ایک خوبصورت ملکہ کا قصہ سنا تھا۔ اس کی جوانی میں ایک قیامت تھی جو بھی اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتا ہوش و حواس کھو بیٹھتا۔ وہ نت نئے نوجوانوں سے گٹھ جوڑ کرتی۔ اور جب وہ بے کار ہو جاتے تو انہیں مگرمچھوں کے تالاب میں پھنکوا دیتی ۔۔۔۔ مگر وہ تو کہانی تھی لیکن یہ عورت؟ ـــــ آخر اسے نوجوانوں کی کیا ضرورت ہے؟ کیا اس کا چال چلن بھی خراب ہے۔ کیا یہ بھی نوجوانوں کو بے کار کر کے پرے پھینک دیتی ہوگی۔ کیا گورنمنٹ نے کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جو ایسی بدکار اور نوجوانوں کو برباد کر دینے والی عورتوں پر لاگو ہو سکے۔

رفتہ رفتہ باغ میں آمد و رفت بڑھنے لگی۔ کالی کالی مائیں بچوں کی گاڑیاں دھکیلتی ہوئی آئیں۔ چند شوقین مزاج کالجیٹ چھوکرے انگریزی میں گٹ پٹ کرتے ہوئے ادھر ادھر سیر گشت کرنے لگے۔ کئی بوڑھے کھوسٹ اپنی اپنی کھوڑیوں پر ہاتھ ٹیکتے ہوئے بنچوں پر آ بیٹھے۔ قریب کے درخت سے ریڈیو کی آواز آنے لگی۔ اس نے پہلے بھی ریڈیو سنا تھا۔ لیکن باغ میں دفعتاً ریڈیو کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ ادھر ادھر کے لوگ بھی ریڈیو والے درخت کے قریب زمین پر بیٹھ گئے۔ اس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی پگڑی کو درست کیا۔ اور سنبھل بیٹھا۔ اتنے میں ریڈیو سے مرزا صاحباں کے بول سنائی دیئے۔ اس کے دل پر درد۔

www.taemeernews.com

طاری ہو گیا ۔۔۔ ایک چھابڑی والا ادھر آ نکلا۔ اس نے جیب ٹٹول کر دیکھی۔ ایک ٹکا بچ گیا تھا۔ اب یہی اس کی کائنات تھی۔ اس نے چھابڑی والے کو آواز دیکر دو پیسے کے کچالو لئے اور انہیں تنکے سے اڑس اڑس کر کھانے لگا۔

کچالو کھانے کے بعد وہ اٹھا۔ نل سے پانی پیا۔ اور مونچھیں پونچھتا ہوا ریڈیو والے درخت کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک او ۔ بڑا تختہ لگا ہوا تھا جس پہ پیچھے اوپر تین آدمی بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے تین آدمی بندوقیں تھامے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ ہر جوڑے کے ساتھ حاشیہ میں لکھا تھا:

اٹلی میں دشمن کو بھگانے والا کون؟	پنجابی جوان!
جرمنوں کو کون بھگا رہا ہے؟	پنجابی جوان!
جاپانیوں کو کون مار بھگائے گا؟	پنجابی جوان!

وہ غور سے ان تصویروں کی طرف دیکھنے لگا کیسی مضحکہ خیز صورتیں بنا رکھی ہیں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بھاگنے اور بھگانے والے لکڑی کے بنے ہوتے ہوں۔ وہ دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بورڈ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک لمبی جمائی لی۔ اور زور سے کھانس کر بلغم اگلا۔ اور آنکھیں جھپکتا ہوا ریڈیو کی طرف بڑھا۔ آواز درخت کی ٹہنیوں پر سے آرہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر رات کو درخت پر چڑھ کر ریڈیو اتار لیا جائے تو کیسی رہے۔ وہ درخت کے تنے اور ٹہنیوں پہ نظر دوڑا دوڑا کر اوپر چڑھنے کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ جب اس نے ادھر ادھر گھوم کر دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ درخت پر سوائے بھونپو کے اور کچھ بھی نہیں۔ ایک بابو نے اسے بتایا کہ ریڈیو بڑے سرکاری کمرے میں بند ہے۔ وہاں سے بجلی کا ایک تار درخت سے باندھ دیا

www.taemeernews.com

گیا ہے۔ اوتار کے آگے بھونپو لگا دیا گیا ہے۔

روپا سنگھ مایوس ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ یہاں بھی چھوٹے چھوٹے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ ایک پر لکھا تھا "ہندوستان کو بچاؤ" اس نے اپنے کسے ہوئے جوڑے کو ڈھیلا کیا اور سوچنے لگا کہ ہندوستان کہاں ہے؟ وہ یوپی کے لوگوں کو ہندوستانی سمجھتا تھا۔ اور اس اتنا جانتا تھا کہ پورب کی جانب کوئی دیس ہے۔ جسے لوگ ہندوستان کہتے ہیں۔ وہاں کے لوگ ڈبلے پتلے ہوتے ہیں۔ انکی زبان بھی خوب چٹ پٹی "می" ہوتی ہے۔ پھر وہ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ نہ معلوم بچارے ہندوستان پر کیا آفت آن پڑی ہے؟ آہستہ آہستہ وہ پھر اپنی الجھنوں میں گم ہو گیا۔ اتنے میں کسی عورت نے ریڈیو پر پنجابی گیت گانا شروع کیا۔

وے پنجابی جواناں! ..... وے ویرا تیتھوں
جرمن جاپانی ڈر ڈر کمبدے

وہ تنکے سے دانت کریدنے لگا۔ اب اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ آج وہ ذرا جلدی گھر واپس پہنچ جائیگا۔ ورنہ اگر کھانے کا وقت ختم ہو گیا تو اسے پھر بھوکا رہنا پڑیگا۔

لاہور میں اس کا جی نہیں لگا۔ اسے اس بات کا دلی رنج تھا کہ اسے کوئی نوکری نہیں مل سکی ..... اس کے قریب بیٹھا ہوا لڑکا ایک دوسرا بورڈ پڑھنے لگا۔

"انڈیا کی جے"

"آجاؤ نوجوان! دشمن بھاگ رہا ہے۔ یہی موقع ہے اس کا پیچھا کرنے کا"
ایک سپاہی لوہے کی ٹوپی پہنے اور دونوں ہاتھ اٹھائے للکار رہا تھا۔ اس کے

ایک ہاتھ میں بندوق تھی۔ دوسرا خالی تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے اور سپاہی بھی چلے آ رہے تھے
مدن سنگھ نے پھر ہاتھ پھیلائے اور منہ کھول کر ایک لمبی سی جمائی لی
اس کے منہ کے چوڑے دہانے میں موٹے موٹے
دشمن کی کھوپڑیاں توڑ سکتی ہے۔ اور اس کی فولادی انگلیاں کمر سے ٹکرانے سے دشمن کا گلا دبا سکتی ہیں۔ لیکن دشمن تھا کدھر؟

اس کی طبیعت پر بوریت طاری ہو رہی تھی۔ دماغ میں خیالات کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگ خوش نظر آ رہے تھے۔ پریڈ تو بہت شاندار رہا تھا۔ کتنے بھونک رہے تھے۔ ۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد اب وہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ گاؤں کے لنگر میں وقت سے پہلے پہنچ جانا چاہتا تھا۔

جب وہ باغ کے پھاٹک سے گزرنے لگا تو اس نے ایک اور بڑا سا تختہ دیکھا۔ اس پر ایک فوجی سپاہی کی تصویر بنی ہوئی تھی جس کے گالوں پر خوب چربی چڑھی ہوئی تھی۔ توند پیٹی سے کس کر بندھی ہوئی تھی۔ اور سر پر گول سی سنہری پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ کی تین انگلیاں اٹھی ہوئی تھیں۔ دوسرے ہاتھ کی ایک انگلی سے وہ ان انگلیوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

ہم سپاہی ہیں :۔
۔ اچھی خوراک پاتا
۔ اچھی تنخواہ ۔
۔ ترقی ۔
۔ پینشن ۔ ۔ ۔

www.taemeernews.com

"کھانا مفت ملتا ہے۔ وردی، بوٹ اور تنخواہ سب کچھ مفت ہی مفت۔ گھر جانے کے لئے چھٹیاں بھی پوری تنخواہ پر۔"

رویل سنگھ کچھ دیر تک اس تختے کی طرف گھورتا رہا۔ پھر اپنی لمبی زبان ہونٹوں اور باچھوں پر پھیری ——— اور پھر پتہ پوچھتا ہوا بھرتی کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔

---

www.taemeernews.com

تار و پود

پنجاب میں اردو کہانی نے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کیں اور فکر و اظہار دونوں کے نئے نئے روپ اجاگر کیئے ان میں ایک بہت پیارا اور سجیلا روپ وہ ہے جسے ہمارے نوجوان افسانہ نگار بلونت سنگھ نے اپنایا ہے۔ وہ پنجاب کی روح کو اردو کے حسین جسم میں اس طرح پھونکتے ہیں کہ یہ جیتی جاگتی مورت ہنستی ہوئی ہمارے من کے مندر میں آن بیٹھتی ہے اور پھر اس کے ہوتے ہوئے کسی اور سندر مورتی کا وہاں جگہ پانا بہت ہی کٹھن ہوتا ہے ... اور حق یہ ہے کہ پنجابی گاؤں کی زندگی کو بلونت سنگھ جیسا ترجمان آج تک میسر نہ آیا تھا، نہ پنجابی میں، نہ اردو میں—

... سمجھوتے کی ہیروئن ایک ایسا مطالعہ ہے جو کسی معمولی فنکار کی تخلیق نہیں ہو سکتا۔ فن کے ایسے ہیں جن سے دو چار ہونے پر بے اختیار منہ سے Oh! This ہے (مولانا) کمال ہے!

(ادبی دنیا لاہور)